دارالعلوم خیریہ نظامیہ سہسرام کا علمی فکری اور ادبی ترجمان



- چراغِ فکر، امانتِ احساس
- غزہ: ایک زخمی سجدہ
- عقیدت اور اظہار کی حدیں
- عقل، وحی اور الحاد
- فقہ کی تعبیرِ نو یا انحراف؟
- میں آئینہ ہوں، چہرہ نہیں

مدیراعلیٰ
محمد ملک الظفر سہسرامی

مدیر
محمد رحمت اللہ صدیقی

ٹیلی فونک استفاضۂ خبر پہ
خصوصی شمارہ

Jan. - Feb.
2026

Majalla
Al-Kausar Sasaram

Darul Uloom Khairia Nezamia, Barahdari, Sasaram, Bihar-821115 (INDIA)
Contact: 7050055786, E-mail: alkausarsasaram@gmail.com, www.alkausarsasaram.blogspot.com



جب قلم اذان بن جائے اور تحریر قندیلِ ایمان تب روح کو جگانے اور ایمان تازہ کرنے کے لئے ایک عنوان درج ہوتا ہے

اٹھ مرے دھوم مچانے والے

معروف قلم کار و نثر نگار حضرت مولانا رحمت اللہ صدیقی کی فکر انگیز تصنیف اور ان کا نیا روحانی قلمی شاہکار منظرِ عام پہ پہلی مرتبہ صوبۂ بہار کے تاریخی شہر سہسرام کی پاکیزہ مذہبی تاریخ کا ایسا گوشوارہ پیش کیا جا رہا ہے جو نادیدہ بھی لیکن تحقیق کی روشنی اور ایمان کی خوشبو سے معطر ہے۔ پہلی جلد جو چھ سو صفحات پہ مشتمل ہے اس کا موضوع سہسرام کی پاکیزہ مذہبی تاریخ فکرِ رضا کے تناظر میں۔ صفِ مجددین میں امام احمد رضا کے امتیازات وتفردات جب زمانے کی گرد میں حق کی روشنی دھندلا جائے...... جب گمرہی کی چمک دمک سے دل بہکنے لگیں......

جب علم وعمل کی صفوں میں نفسانیت سر اُٹھانے لگے......تب ضرورت ہوتی ہے ایک اذان کی جو حق وصداقت کی راہ پہ چلنے کی دعوت دے---- ایک دھمک کی---- ایک روحانی للکار کی--- جو صدا دے "اٹھ مرے دھوم مچانے والے" یہ محض ایک عنوان نہیں یہ دعوت فکر ہے- یہ محبت رسول کی ترجمانی ہے--- جو مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی کے قلم سے جاری ہوئی ایک مردِ حق آگاہ کا قلم تلوار بن کر اُٹھتا ہے--- اور صدا دیتا ہے: اُٹھ مرے دھوم مچانے والے! یہ محض ایک کتاب نہیں---- بلکہ مذہبی تاریخ کا وہ گوشوارہ ہے جس میں مجددین کی قطار میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا درخشاں مقام ان کے تفردات واجتہادی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے--- یہ دعوتِ فکر ہے!--- یہ ندائے رضا ہے!--- یہ محبتِ رسول ﷺ کے مسلک کا روشن مینار ہے! یہ کتاب جدید ذہنوں کو مسلک حق کی جانب متوجہ کرتی ہے سادہ زبان میں گہرے نکات کی وضاحت کرتی ہے اور فکر وروح کو بیدار کرتی ہے۔

کتاب کی خصوصیات: امام احمد رضا کی تجدیدی فکر اور اسلوب کی انفرادیت اور اس کا جامع تجزیہ، سہسرام کی مذہبی تاریخ کا مستند تحقیقی اور خوبصورت بیان، نوجوان نسل کی دینی وفکری رہنمائی، اعلیٰ حضرت کی علمی وروحانی عظمت کا نیا زاویہ، اتحاد واصلاح کی حکیمانہ دعوت، صوفیانہ رنگ میں عقائدِ اہلِ سنت کی ترجمانی۔ یہ کتاب سلیس وشستہ زبان میں گہرے نکات کے در کھولتی ہے، دل و دماغ کو بہ یک وقت بیدار کرتی ہے، اور مسلکِ حق کا روشن پرچم بلند کرتی ہے۔ تمام بڑے دینی کتاب گھروں اور خانقاہی مراکز پہ دستیاب ہوگی۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی: تنقیدی شعور کا روشن ستارہ

(فکر ونظر کے چراغ کی روشنی)

جب علم کے دریچے کھلتے ہیں اور دل کی ویرانیاں نورِ بصیرت سے جگمگاتی ہیں، تو ایسے وقت میں کچھ ہستیاں جلوہ گر ہوتی ہیں جن کی ذات علم وعرفان کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ حضرت مولانا ملک الظفر سہسرامی بھی انہی میں سے ایک ہیں، جن کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر تحریر اور ہر احساس دینِ متین کی فکری تجلیات، اور ادبی جمالیات کا حسین امتزاج ہے۔

ان کی نثر میں ایک ایسا لطیف جلال ہے، جو دل کو برانگیختہ کرتا ہے لیکن روح کو سکون بخشتا ہے۔ ان کے قلم کی روشنائی صرف کاغذ پہ نہیں اترتی، بلکہ قلوب واذہان پہ بھی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ان کی تحریریں صرف نگاہوں سے ہم کلام نہیں ہوتیں بلکہ قلب وروح سے رشتے مربوط کرتی ہیں- ان کی تحریریں فقط تنقیدی تجزیے نہیں، بلکہ ایک روحانی ندائے حق بھی ہیں، جو اسلامی تہذیب کے دفاع اور فکری زوال کے سدِّ باب کا سامان رکھتی ہیں۔

ان کی فکر کا افق صرف الفاظ کی وسعت تک محدود نہیں، بلکہ وہ شرعی بصیرت اور ادبی بلاغت کو ایک ہی قرطاس پہ سجا کر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کا تنقیدی شعور اس دریا کی مانند ہے جو اپنی روانی میں نہ صرف فکری گرد کو بہا لے جاتا ہے، بلکہ صداقت کے گوہر بھی چن کر سامنے لاتا ہے۔

الحمدللہ! آج وہ لمحہ آیا چاہتا ہے جب مولانا کے قیمتی افکار اور دردمندانہ مشاہدات کو ایک روح پرور مجموعے کی شکل دی جا رہی ہے۔ صحافیِ عصر، مولانا رحمت اللہ صدیقی (مدیرِ اعلیٰ پیغامِ رضا) کی سعیِ جمیل سے یہ مجموعہ "فکر ونظر کے چراغ" کے عنوان سے منصۂ شہود پہ آ رہا ہے۔ یہ مجموعہ صرف مقالات کا گلدستہ نہیں، بلکہ ہر تحریر ایک روشن چراغ ہے، جو ذہن کے اندھیروں میں ہدایت کی لَو جلاتا ہے۔ ان مضامین میں جہاں اسلامی ادب کی نازک رگوں کو محبت سے چھوا گیا ہے، وہیں عقل وشعور کے چراغ بھی روشن کیے گئے ہیں۔ مولانا کے قلم نے ان موضوعات کا انتخاب کیا جو وقت کی ضرورت ہیں اور انہیں اس انداز سے سنوارا کہ علم، ادب، اور روحانیت تینوں کی پیاس بجھتی نظر آتی ہے۔

"فکر ونظر کے چراغ" ان خوش بختوں کے لیے ہے جو علم سے دل کی دنیا روشن کرنا چاہتے ہیں، جو تنقید کو فقط الفاظ کی قلابازی نہیں بلکہ بصیرت کی جاگتی آنکھ مانتے ہیں، اور جو اسلامی ادب کو صرف روایت نہیں، روح کی تازگی سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ ان شاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پہ آنے والا ہے۔ جو اہلِ دل اس نورانی سرمائے کو اپنی علمی دنیا میں شامل کرنا چاہتے ہیں، وہ ابھی رابطہ کریں۔ یہ چراغ فقط آج کی راتوں کو روشن کرنے نہیں آ رہا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کی راہ میں بھی روشنی تقسیم کرے گا- ان شاء اللہ تعالیٰ

رابطہ: قاری رضوان الہدیٰ، دارالعلوم خیریہ نظامیہ، بارہ دری سہسرام ضلع رہتاس 821115، موبائل: 7050055786, alkausarsasaram@gmail.com

Rs. 150/-

نیک تمناؤں کا گلدستہ

مجلہ الکوثر

کے تیسرے شمارے کی روح پرور اشاعت پہ دل کی گہرائیوں سے مبارکباد

قلم جب اخلاص سے لکھتا ہے تو تحریر عبادت بن جاتی ہے اور جب مقصد رضائے الٰہی ہو تو ہر لفظ چراغِ ہدایت میں بدل جاتا ہے۔الکوثر کے صفحات میں علم کی روشنی، فکر کی تازگی اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو رچی بسی ہے۔ یہ رسالہ محض ایک مطبوعہ مجلہ نہیں، بلکہ اہلِ سنّت و جماعت کی فکری یک جہتی، روحانی وقار اور علمی روایت کا خوبصورت تسلسل ہے۔ دعا ہے کہ الکوثر کا یہ قافلہ ہمیشہ حق وصداقت کی راہ پہ رواں دواں رہے، اس کے قلم سے نکلنے والے الفاظ ملت کے ضمیر کو بیدار کریں اور یہ چراغ تادیر روشن رہے۔

اللہ تعالیٰ یہ علمی وروحانی خدمت قبول فرمائے اور اس کے مدیر ومعاونین کو مزید توفیقاتِ صالحہ عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

نیک خواہشات کے ساتھ

ظفر اسعد

مجلہ الکوثر کے تیسرے شمارے کی بابرکت اشاعت پہ بچپن اسکول کی جانب سے دلی مبارکباد

الکوثر اپنی تحریروں کے ذریعے علم، فکر اور روحانیت کا وہ چراغ روشن کر رہا ہے جس کی روشنی نسلوں کی رہنمائی بنے گی۔ تعلیم وہ بیج ہے جو کردار کی زمین میں بویا جاتا ہے اور جس سے ایمان، اخلاق اور شعور کے پھول کھلتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر بچہ علم کے نور سے منور ہو اور علم و ادب کی اس روشنی کو آگے بڑھائے۔ اللہ تعالیٰ الکوثر کو دوامِ خیر عطا فرمائے اور ہمارے تعلیمی سفر کو مقصدِ حق تک پہنچائے۔

منجانب: محمد توقیر

ڈائریکٹر بچپن اسکول

عاشق پور سہسرام



جز وقتی مکتب برائے نونہالانِ امت

(زیرِ انتظام: حضرت ذکی شہید کمیٹی، سہسرام)

تعلیمِ دین، خدمتِ عمل یہی ہمارا عہد ہے

امت کا مستقبل اس کے نونہالوں کے ہاتھ میں ہے اور نونہالوں کا مستقبل صالح تعلیم و پاکیزہ تربیت سے وابستہ ہے۔ آج کے پُر آشوب دور میں جہاں فکری انتشار، اخلاقی انحطاط اور دینی غفلت کے بادل گھرے ہوتے جا رہے ہیں، وہاں ایک ایسے مکتب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جو بچوں کے دلوں میں نورِ قرآن روشن کرے، ان کے کردار میں سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو بسائے اور ان کی عملی زندگی نماز و اذکار سے آراستہ کرے۔

اسی مقدس مقصد کے تحت جز وقتی مکتب برائے نونہالانِ امت کا قیام عمل میں آیا ہے، جو حضرت ذکی شہید کمیٹی، سہسرام کے زیرِ انتظام جاری ہے۔ یہ مکتب محض درسگاہ نہیں بلکہ ایمان کی آبیاری اور کردار سازی کا مرکز ہے۔

- نصابِ تعلیم
- بنیادی دینی تعلیم
- قرآن مجید ناظرہ و حفظ
- اسلامی اخلاقیات کی تربیت
- نماز و اذکار کی عملی مشق

یہاں تعلیم محض معلومات نہیں بلکہ عمل کی بنیاد ہے اور تربیت محض نصیحت نہیں بلکہ عملی مشق کا نام ہے۔

اپیل کنندہ: (مولانا) محمد ملک الظفر سہسرامی

وقیع الدین عرف پپو ابنِ محترم الحاج نسیم الدین مرحوم و مغفور

مقام: زردہ بھون، ذکی شہید، سہسرام معاونین: محمد توقیر عالم، دانیال کشفی چاند، محمد شمیم الدین،

سروس عالم عرف ببلو اہلِ ایمان سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اس دینی و تربیتی مشن میں اپنا حصہ ضرور ادا کریں۔ اپنے بچوں کو اس مکتب میں داخل کرائیں اور اخلاقی معاونت سے اسے فروزاں رکھنے میں تعاون فرمائیں۔ آیئے! ہم سب مل کر عہد کریں کہ اپنی آنے والی نسل کو قرآن سے جوڑیں گے، نماز سے آشنا کریں گے اور اخلاقِ حسنہ کا پیکر بنائیں گے۔

تعلیمِ دین، خدمتِ عمل یہی ہمارا عہد ہے۔

ادارتی نوٹ

اہلِ سنّت و جماعت کی علمی روایت کا امتیاز یہ رہا ہے کہ یہاں نئی بات پیش کرنے سے پہلے پرانی کتاب کھولی جاتی ہے اور نئی تعبیر تراشنے سے پہلے اکابر کے حاشیے پڑھے جاتے ہیں۔ اس روایت میں حالات کے تحت سہولت کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے مگر جدّت پسندی کی نہیں، فہمِ نو کی قدر کی گئی ہے مگر بے دلیل اختراع کو کبھی سندِ قبول نہیں ملی۔

ان دنوں استفاضۂ خبر کے عنوان سے ایک ایسا "نیا باب" کھولنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کی کنڈیاں بظاہر ''فتاویٰ رضویہ'' سے ملائی جاتی ہیں مگر تالا کہیں اور کا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی تحریرات اس درجہ واضح، منضبط اور محتاط ہیں کہ ان پہ نئی توضیح کم اور نئی تاویل زیادہ حیرت میں ڈالتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے متن کچھ اور کہہ رہا ہو اور شرح اسے کسی اور سمت لے جانا چاہتی ہو۔

حضرت مولانا مفتی راحت رضا خان قادری کا یہ تحقیقی فتویٰ رویتِ ہلال کے باب میں محض ایک علمی اختلاف کا بیان نہیں بلکہ اہلِ سنّت و جماعت کے فکری ضمیر پہ ایک گہری اور بامعنیٰ دستک ہے۔ یہ فتویٰ اس خموش مگر نہایت خطرناک روش پہ سوالیہ نشان ہے جس کے تحت اصول کو سہولت کے تابع اور روایات کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مولانا موصوف نے نہ صرف مسئلے کی تہہ تک رسائی حاصل کی ہے بلکہ اس فکری لغزش کو اس کے تاریخی پس منظر سمیت پوری صراحت کے ساتھ بے نقاب کر دیا ہے۔

اس تحقیق کا سب سے زیادہ چونکانے والا پہلو یہ ہے کہ جدید آلاتِ مواصلات کو استفاضۂ خبر کا قائم مقام بنانے کی جو تعبیر آج اہلِ سنّت کے بعض حلقوں کی جانب سے پیش کی جارہی ہے، وہ نہ نئی ہے اور نہ بے مثال۔ یہ بعینہٖ وہی فکر ہے جو آج سے تقریباً پچھتر برس قبل دیوبندی مکتبِ

فکر کے بعض علماء کی جانب سے سامنے آئی تھی اور جسے اس وقت اہلِ سنّت و جماعت کے اکابر مفتیانِ کرام نے متفقہ طور پہ اصولِ فقہ کے منافی قرار دے کر واضح طور پہ مسترد فرما دیا تھا۔ آج اسی مردود فکر کو نئے ناموں، نئے اسالیب اور جدید اصطلاحات کے پردے میں پیش کرنا علمی ارتقا نہیں بلکہ فکری تکرار ہے---اور وہ بھی بغیر کسی علمی احتساب کے۔

یہ معاملہ اس وقت مزید سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے جب یہ تعبیر ایسے ادارے کے منصبِ صدارت سے سامنے آئے جس کی اپنی فقہی تاریخ اس کی نفی کرتی ہے۔ مولانا مفتی راحت رضا خان قادری نے محض تنقید پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی ادارے کی سابقہ فقہی دستاویزات کو بطورِ شہادت پیش کر کے یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ اس ذمہ دار، باوقار ادارے سے وابستہ مفتیانِ کرام--- جیسے حافظ ملت حضرت علامہ مفتی شاہ عبدالعزیز محدث مبارک پوری، استاذ العلماء حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی، شیخ العلماء حضرت علامہ مفتی غلام جیلانی اعظمی، حضرت علامہ قاری محمد یحییٰ، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی اور شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین--- نے ٹیلی فون کے ذریعے موصول ہونے والی خبروں کو استفاضۂ خبر کے دائرے میں شامل کرنے سے صاف انکار فرمایا تھا۔ یہ حوالے محض تاریخی یادداشت نہیں بلکہ ادارہ جاتی موقف کی صریح شہادت ہیں، جن سے صرفِ نظر علمی دیانت کے خلاف ہے۔

ایسے نازک موڑ پہ آ کر معاملہ محض ایک فقہی اختلاف کا نہیں رہتا بلکہ فکری دیانت اور علمی امانت کا سوال بن جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں: یا تو تحقیقِ جدید کے خوش نما عنوان کے تحت جو فکری قلابازیاں برسوں سے جاری ہیں ان سے صاف اور باوقار رجوع کر لیا جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر نئی صورت، ہر نئی آواز اور ہر نئی سہولت شرعی حجت نہیں بن جاتی، یا پھر علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ فتاویٰ اشرفیہ سے وہ تمام فتاوے یک قلم خارج کر کے ان سے برأت کا اظہار کر دیا جائے جو ٹیلی فونک خبروں کو استفاضۂ خبر کے دائرے میں لانے کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔

ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں: ایک طرف روایت کی امانت ہے، جو اصول کی کسوٹی پہ پرکھی گئی ہے اور دوسری طرف وہ تاویل ہے جو سہولت کے نام پہ اصول کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اگر اصول باقی رکھنا ہے تو نتائج کو قبول کرنا ہوگا اور اگر نتائج پہلے طے کر لیے گئے ہیں تو پھر اصول کے احترام کا دعویٰ محض ایک خوش فہمی رہ جائے گا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ وقت بدل گیا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا اصول بھی بدل گئے ہیں؟ اور اگر اصول اپنی جگہ قائم ہیں تو پھر یہ فکری قلابازیاں کس جواز کے تحت کی جا رہی ہیں؟ یہی وہ نکتہ ہے جہاں مولانا کا یہ فتویٰ محض ایک تحقیقی تحریر نہیں رہتا بلکہ ایک اصولی تنبیہ میں ڈھل جاتا ہے۔

فقہ اہلِ سنّت نہ سہولت پسند تجربات کی محتاج ہے اور نہ بدلتے ذرائع کے ساتھ اپنی بنیادیں تبدیل کرتی ہے۔ ذرائع کی تبدیلی، اصول کی تبدیلی کا جواز نہیں بن سکتی۔ استفاضۂ خبر ایک منضبط فقہی اصطلاح ہے، محض خبر کے تیز تر پھیلاؤ کا نام نہیں۔ اس کی اپنی شرائط ہیں، اپنی حدود اور اپنی تاریخی تعبیر ہے۔ اسے جدید آلات کے سانچے میں ڈھال دینا فقہ کے ساتھ محض اجتہادی توسع نہیں بلکہ فکری تصرف اور اصولی تحریف کے مترادف ہے۔

یہاں خاموش رہنا بددیانتی ہے: فقہ اہلِ سنّت کوئی قابلِ تشکیل مادّہ نہیں کہ منصب، حالات یا دباؤ کے مطابق اس کی ہیئت بدل دی جائے۔ جو چیز کل تک نا قابلِ قبول تھی، وہ آج منصب کے سائبان میں قابلِ استدلال کیسے بن گئی؟ یہ سوال کسی ایک فتوے تک محدود نہیں بلکہ پوری فقہی روایت کی سمت اور مسلکی شناخت سے متعلق ہے۔

مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری کا یہ فتویٰ دراصل اس ذہنیت کے خلاف ایک باوقار احتجاج ہے جو سہولت کو حکمت اور تغیر کو تجدید کے نام سے پیش کرتی ہے۔ انہوں نے نہ شخصیات کو نشانہ بنایا اور نہ اداروں کے نام لے کر جذباتی حملے کیے مگر دلائل کی مضبوط ترتیب، حوالوں کی صراحت اور تاریخی تسلسل کے ذریعے یہ واضح فرما دیا کہ اصل مسئلہ رویتِ ہلال کا نہیں بلکہ فقہی امانت کے تحفظ کا ہے۔ یہ فتویٰ ہمیں اس بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ رویتِ ہلال محض چاند دیکھنے یا خبر پہنچنے کا مسئلہ نہیں بلکہ امت کے اجتماعی نظم، فقہی وقار اور مسلکی تشخص سے

گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی یہ تحقیق وقتی شور سے بلند ہو کر آنے والے وقتوں کے لیے ایک معیاری اور حوالہ جاتی فقہی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

یہ ادارتی نوٹ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت کی فقہ کو مصلحت کی تجربہ گاہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ جدید آلات کے تابع کر کے اس کی روح مسخ کی جا سکتی ہے۔ جو فکر کل رد تھی، وہ آج محض زمانے کے حوالے سے قابلِ قبول نہیں بن سکتی---مگر یہ کہ اس کے رد کی علمی بنیادیں منہدم کر کے دکھائی جائیں۔

یہ فتویٰ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ بعض مواقع پہ خاموشی جرم بن جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بولنا عبادت اور لکھنا فرضِ کفایہ بن جاتا ہے۔ مولانا مفتی راحت رضا خان قادری نے یہ فریضہ ادا کر دیا ہے، اب اہلِ علم کی ذمہداری ہے کہ وہ منصب کی ہیبت سے بلند ہو کر اصول کی حفاظت کا اعلان کریں، تا کہ فقہ محفوظ رہے، روایت سلامت رہے اور اہلِ سنّت کی شناخت کسی فکری لغزش کی نذر نہ ہو۔ یہ فتویٰ ایک واضح اعلان ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت کی فقہ سہولت کی نہیں، صداقت کی تابع ہے اور جس روایت نے ہمیں شناخت دی ہے، اس روایت کی حفاظت یقیناً ہمارا اصل فریضہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام کا علمی فکری اور ادبی ترجمان

مجلہ

الکوثر

جہانِ مذہب و ادب کی وہ صدا جو ضمیر بیدار کرے

شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۲۶ء/شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

چراغِ راہ

ناشرِ سنیت
حضرت علامہ قاضی عبد الوحید فردوسی عظیم آبادی

مجاہدِ دوراں
حضرت علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی

خطیبِ مشرق
حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی

فخرِ بہار
حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی

رئیس القلم
حضرت علامہ ارشد القادری

فکرِ امروز

فاضل بریلوی نے اپنے کام کا آغاز جس تجدیدی شان اور عالمانہ قوت سے کیا تھا اگر اسے پچاس سال تک اسی رفتار سے چلایا جاتا تو آج برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ہر تحریک اور پروگرام کے لیے مضبوط بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبۂ عشق رسول اور نسبت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو از سر نو اجاگر و بیدار کرنے کی اس تحریک کی بنیاد اس مرد قلندر نے اس قدر مضبوط اور پائیدار ڈالی ہے کہ جسے زمانہ کے انقلابات ہلا بھی نہیں سکتے۔ آج وقت کی آواز اور حالات کا تقاضا ہے کہ سواد اعظم کے رہنما، علماء، طلباء، دانشور، روحانی پیشوا اور باشعور عوام تمام اصولی و فروعی مسائل میں اپنے آپ کو فاضل بریلوی کے مضبوط اور محتاط پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ ہنگامی مفادات کی خاطر فکری و عملی انتشار کو راہ نہ دیں۔ اس کے علاوہ جو بھی راہ اختیار کی گئی وہ غلط اور ہلاکت کی راہ ہوگی نیز خانقاہی نظام میں غیر ضروری اضافے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ کمیت میں اضافہ کیفیت میں اضمحلال تنزل کا باعث ہوا کرتا ہے۔ پہلے سے موجود خانقاہوں کے نظام کو بہتر بنانے پر توجہ دی جائے۔

(سید محمد فاروق القادری، پاکستان)

مراسلت کا پتا: مجلہ الکوثر سہسرام دار العلوم خیریہ نظامیہ، محلہ بارہ دری، سہسرام ضلع رہتاس، بہار (الہند) پن-821115
Darul Uloom Khairia Nezamia, Barahdari,
Sasaram, Bihar-821115 (India)Contact: 7050055786
Email: alkausarsasaram@gmail.com Website: alkausarsasaram.blogspot.com

اس شمارے میں

سحر انصاری کراچی، پاکستان

نہ کھو جائیں کہیں ہم ساعت دیدار سے پہلے
لپٹ جائیں مدینے کے در و دیوار سے پہلے

ادب سے چوم لیں آنکھیں ذرا جالی کے منظر کو
یہ آنسو گفتگو کر لیں مرے سرکار سے پہلے

جہاں انوار ہی انوار خود میزاب رحمت ہوں
نہ دیکھا خواب ایسا دیدۂ بیدار سے پہلے

وہی دست مبارک فاتح قلب و نظر ٹھہرا
نظر آئی تھی جس میں شاخ گل تلوار سے پہلے

بہت کچھ تھا کہ جس پر اہل دنیا فخر کرتے تھے
مگر کیا تھا رسول اللہ کے افکار سے پہلے

یہ دنیا جس پہ مہر و ماہ کی گردش کا سایہ ہے
شب تاریک تھی نور سحر آثار سے پہلے

ابو جہل زمانہ دیکھ شان مصطفیٰ کیا ہے
ترے انکار سے پہلے، مرے اقرار سے پہلے

سحر کیا اس قدر ہی کیف آور تھا، ذرا سوچو
کہا جو کچھ بھی تم نے نعتیہ اشعار سے پہلے

□□□□

امجد اسلام امجد، لاہور، پاکستان

رہتے تھے اُن کی بزم میں یوں با ادب چراغ
جیسے ہوں اعتکاف کی حالت میں سب چراغ

جتنے ضیا کے روپ ہیں سارے ہیں مستعار
اپنے ہنر سے جلتے ہیں دنیا میں کب چراغ

گذری جہاں جہاں سے سواری حضور کی
حیراں تھیں کہکشائیں تو ششدر تھے شب چراغ

ہر ہر قدم رفیق ہے سنت کی روشنی
جینے کا یوں سکھاتے ہیں دنیا کو ڈھب چراغ

رب سے دعائیں کرتے تھے اُمت کے واسطے
راتوں کو بجھنے لگتے تھے گلیوں کے جب چراغ

دیکھو تو ان میں نور ازل کی ہیں جھلکیاں یہ
جو دکھائی دیتے ہیں رستوں میں اب چراغ

امجد! مرے حضور مجسم تھے روشنی
چہرہ تھا آفتاب تو لگتے تھے لب چراغ

□□□□

تقدیم

چراغِ فکر، احساس امانت

زندگی محض سانسوں کا تسلسل نہیں یہ شعور کی ایک مسلسل آزمائش ہے۔ جب معاشرے میں شور بڑھ جائے، معنیٰ مدھم پڑنے لگیں اور الفاظ اپنی حرمت کھونے لگیں تو ایسے میں کچھ آوازیں خاموشی سے ابھرتی ہیں --- نہ نعرے کے رنگ میں، نہ ہنگامے کی صورت میں --- بلکہ دل کی زمین پر ٹھہر کر فکر کے چراغ روشن کر دیتی ہیں۔ ''الکوثر'' اسی خموش مگر مؤثر صدا کا نام ہے۔ یہ رسالہ کسی وقتی جوش یا موسمی وابستگی کا مظہر نہیں بلکہ ایک فکری امانت ہے۔ ایک تہذیبی عہد اور ایک روحانی ذمہ داری کا تسلسل ہے --- ایسا تسلسل جو ماضی کی روشن روایت سے فیض یاب ہو کر حال کے فکری انتشار میں چراغِ راہ بنتا ہے۔ یہ صفحات محض تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ احساسِ جواب دہی، دردِ ملت اور شعورِ زمانہ کا ہم آواز اظہار ہیں۔ یہاں قلم محض لکھتا نہیں، گواہی دیتا ہے، الفاظ صرف بکھرتے نہیں، سمت عطا کرتے ہیں۔ یہ رسالہ فکر کو سطحیت سے نجات دلا کر گہرائی، وقار اور مقصدیت کی طرف لے جانے کی ایک خاموش مگر مضبوط کوشش ہے۔ اس کے صفحات میں بکھرے ہوئے الفاظ محض روشنائی نہیں بلکہ وہ سجدہ ریز احساسات ہیں جو قلم نے وضو کے بعد ادا کیے ہیں۔ یہاں تحریر احتجاج بھی ہے مگر شائستگی کے ساتھ، یہاں تنقید بھی ہے مگر درد کے خول میں لپٹی ہوئی، یہاں ہر جملہ نعرہ نہیں بنتا بلکہ دعا کی صورت میں اٹھتا ہے، یہاں لفظوں کی تپش شعلہ نہیں بنتی بلکہ چراغ کی لو میں ڈھل جاتی ہے، یہاں صداقت کا اظہار کیا جاتا ہے مگر آواز نیچی رکھ کر تاکہ دلوں کے دروازے بند نہ ہوں، یہاں اختلاف ہے مگر جسارت نہیں، سوال ہے مگر تلخی نہیں، یہاں قلم کسی کے خلاف نہیں اٹھتا بلکہ زوال پذیر شعور کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور اسی وقار کے سبب یہ تحریر قاری سے صرف توجہ نہیں، ذمہ داری بھی طلب کرتی ہے۔ یہاں دعوت بھی ہے --- مگر شور کی صورت میں نہیں، خاموش بیداری کے استعارے کے طور پر، یہاں سوال بھی ہے --- مگر الزام کی کاٹ کے بغیر، ضمیر کی دستک بن کر، یہاں لہجہ نرم ہے --- مگر مقصد پختہ کہ بات دل میں اترے اور دل کو بدل دے، یہاں فکر چراغ ہے --- جو اندھیروں میں روشنی تقسیم کرتا ہے، یہاں قلم منبر نہیں بنتا --- آئینہ بنتا ہے تاکہ ہر قاری خود کو اس آئینے میں دیکھ سکے۔ اسی لیے یہ تحریر صفحات پہ اختتام پذیر نہیں ہوتی بلکہ قاری کے دل کی دہلیز پہ اپنی بازگشت چھوڑ جاتی ہے۔

زیر نظر شمارے میں شامل تحریریں ہمارے عہد کے ان سوالات سے مکالمہ کرتی ہیں جو شور میں دب گئے ہیں: دین اور تہذیب کا رشتہ، ایمان اور سماج کی کشمکش، شناخت اور وقار کی بازیافت اور وہ روحانی خلا جو جدید زندگی کی تیز رفتاری نے پیدا کر دیا ہے۔ یہ تحریریں قاری سے مطالبہ نہیں کرتیں بلکہ اسے آئینہ دکھاتی ہیں --- اور آئینہ ہمیشہ خاموش ہوتا ہے مگر سچ بولتا ہے۔

''الکوثر'' کا مزاج سادہ مگر وقار آشنا ہے۔ یہ الفاظ کے بازار کا حصہ ہے نہ شہرت کی دوڑ کا مسافر۔ یہ اس روایت کا امین ہے جہاں قلم عبادت بن جاتا ہے اور فکر ذمہ داری۔ ہم نے اس شمارے میں بھی اسی عہد کی پاسداری کی ہے کہ تحریر دل کو زخمی نہ کرے بلکہ اسے زندہ کرے، اختلاف کو نفرت نہ بنائے بلکہ شعور میں ڈھال دے۔ یہ قلم کی ذمہ داری ہے کہ وہ تلخی کی بجائے بصیرت، شور کی جگہ وزن اور الزام کی بجائے سوال پیدا

کرے۔ وہ لفظ جو دلوں کو جوڑ دے وہی اصل ابلاغ ہے اور جو سوچ کو جگا دے، وہی سچی تنقید ہے۔ تحریر اگر آئینہ بن جائے تو چہرے سنورتے ہیں اور اگر خنجر ہو تو صرف زخم بڑھتے ہیں۔ اس لیے لکھنا محض کہنا نہیں، سنوارنا ہے---ضمیر کو، فہم کو اور اجتماعی شعور کو۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ زمانہ مختصر تحریروں، سرخیوں اور فوری تاثر کا اسیر ہے مگر ''الکوثر'' آج بھی ٹھہراؤ، تأمل اور معنویت پہ یقین رکھتا ہے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہی دل میں اترتی ہے۔

اللہ کرے یہ شمارہ بھی اہلِ فکر کے لیے چراغ بنے، اہلِ دل کے لیے دعا اور اہلِ قلم کے لیے یاددہانی کہ لفظ اگر امانت بن جائے تو تاریخ کی سمت بدل سکتا ہے۔

قرطاس و قلم محض تحریر کے وسائل نہیں یہ تہذیبوں کی سانس، تاریخ کی آنکھ اور فکرِ انسانی کی شہ رگ ہیں یہ وہ مقدس وسیلہ ہیں جن کے ذریعے زمانے نے اپنے تجربات محفوظ کیے، قوموں نے اپنی شناخت رقم کی اور انسان نے اپنے شعور کو دوام بخشا۔ قلم کی جنبش سے خیالات نے صورت پائی، لفظوں نے معانی کے پیرہن زیب تن کیے اور خاموش صدیاں بول اٹھیں۔ جہاں قلم تھما وہاں فکر منجمد ہوئی اور جہاں قرطاس جلائے گئے وہاں تہذیب کی یادداشت زخمی ہوئی۔ درحقیقت قرطاس و قلم وہ امانت ہیں جو ماضی کو حال سے جوڑتی اور حال کو مستقبل کی سمت رہنمائی عطا کرتی ہیں۔ جب لفظ نے خاموشی سے بغاوت کی اور خیال نے بے نام اضطراب کو معانی پہنائے تب قلم وجود میں آیا---اور جب قلم نے اپنے وجود کا شعور پایا تو قرطاس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ یوں انسان کی فکری ہجرت، یادداشت کی حفاظت اور تہذیبی تسلسل کا سفر شروع ہوا۔ قلم وہ واحد امانت ہے جسے ربِ کائنات نے اپنی کتاب کے آغاز میں عزت بخشی اور قرطاس وہ خموش گواہ ہے جس پہ وحی کے نور نے قیام کیا، فقہ نے قاعدہ پایا، تصوف نے ذوقِ آشنائی سیکھا اور تاریخ نے اپنے زخم لکھے۔

انسانی تاریخ پہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی معاشرے نے قلم کی حرمت پہچانی، فکر نے تہذیب کا لباس پہنا، شعور نے سمت پائی تو اختلاف بھی شائستگی میں ڈھل گیا اور جب قلم کی جگہ شور نے لے لی، تحریر کی جگہ منظر نے اور مطالعے کی جگہ محض نعروں کی گونج سنائی دینے لگی تو علم کی شمع مدھم ہونے لگی، مکالمہ منقطع ہوا اور اجتماعی حافظہ منتشر ہو گیا۔

قلم کی حرمت دراصل سچ کی حرمت ہے یہ وہ امانت ہے جو وقت کے شور میں بھی حق کی سرگوشی محفوظ رکھتی ہے۔ قرطاس پہ اترے ہوئے الفاظ صرف روشنائی کا عمل نہیں ہوتا، وہ آنے والی نسلوں کے لیے میزانِ فکر بنتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنے قلم کو جھکنے نہیں دیتیں اور مردہ معاشرے تحریر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں--- یہ محض اتفاق نہیں کہ آسمانی ہدایت نے علم کا آغاز لفظ سے مربوط فرمایا اور قلم کو اظہارِ حق کا امین ٹھہرایا۔ اس لیے کہ قلم سچ کا محافظ ہے اور قرطاس صداقت کا مسکن۔

انسانی تاریخ پہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی معاشرے نے قلم کی حرمت پہچانی وہ فکری بلندیوں سے ہمکنار ہوا اور جب قلم کو مصلحت، خوف یا وقت کی سوداگری کا اسیر بنا دیا گیا تو زوال نے تہذیب کے دروازے پہ دستک دی۔ قلم اگر دیانت دار ہو تو وہ آئینہ بن جاتا ہے اور اگر مفاد کا اسیر ہو جائے تو فتنہ۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کے نزدیک قلم محض لکھنے کا آلہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے---ایک ایسا قرض جو ادا نہ ہو تو نسلیں مفلس ہو جاتی ہیں۔

قرطاس کی سفیدی دراصل انسانی ضمیر کی وسعت کی علامت ہے۔ اس پہ جو کچھ رقم ہوتا ہے وہ صرف سطریں نہیں ہوتیں بلکہ وقت کی عدالت میں پیش کی جانے والی شہادتیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حقیقت آشنا قلم کار لفظ لکھنے سے پہلے غور کرتا ہے، سوچتا ہے اور تولتا ہے--- کہ یہ سطریں کل کس کے حق میں گواہی دیں گی اور کس کے خلاف سوال بنیں گی۔ دیانت دار قلم ہر لفظ کو امانت سمجھ کر کاغذ پہ رکھتا ہے کہ حرف محض روشنائی

نہیں ہوتے بلکہ وقت کی عدالت میں پیش ہونے والی زندہ و بیدار شہادت ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آج کی لکھی ہوئی تحریر کل کے ضمیر کو برانگیختہ کر سکتی ہے یا تاریخ کی پیشانی پہ داغ بن سکتی ہے۔ اسی خوفِ جواب دہی کے باعث اس کا قلم کبھی تیز نہیں ہوتا مگر ہمیشہ صداقت آفریں ہوتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ خاموشی بھی ایک بیان ہے اور تحریر بھی --- اور دونوں کا حساب لیا جائے گا۔

آج کا عہد ڈیجیٹل شور، فوری ردِ عمل اور سطحی اظہار کا عہد ہے۔ یہاں لفظ کی عمر لمحوں میں ناپی جاتی ہے اور تحریر کی گہرائی رفتار پہ قربان کر دی جاتی ہے۔ ایسے میں قرطاس و قلم کی سنجیدگی، ٹھہراؤ اور وقار مزید معنیٰ خیز ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ تحریر صرف خبر نہیں، تعبیر ہے، صرف اظہار نہیں، اثر ہے اور صرف ردِ عمل نہیں، ذمہ داری ہے۔

''الکوثر'' کا یہ شمارہ اسی شعور کا تسلسل ہے۔ یہ صفحات اس بات کی کوشش ہیں کہ قلم کو پھر سے امانت دار بنایا جائے، قرطاس کو پھر سے سچا گواہ، اور تحریر کو پھر سے فکری عبادت۔ یہاں دین، تہذیب، تاریخ، ادب اور عصرِ حاضر کے سوالات ایک ایسے اسلوب میں یکجا ہیں جہاں دلیل میں شائستگی ہے، اختلاف میں وقار اور جذبے میں احتیاط ہے۔

یہ شمارہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر نسلوں کو صرف الفاظ منتقل کیے جائیں اور معانی نہ دیے جائیں، اگر علم کی روشنی دی جائے مگر عمل کی حرارت نہ پہنچے تو پھر آفتاب سے روشنی کی بجائے دھواں اٹھتا ہے۔ اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں قلم کو محض لکھنے والا نہیں بلکہ خبردار کرنے والا بننا پڑتا ہے۔

قرطاس و قلم کا رشتہ دراصل ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک مقدس پل ہے۔ اگر یہ پل مضبوط ہو تو روایت سلامت رہتی ہے اور اگر یہ کمزور پڑ جائے تو فکری طوفان نسلوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ''الکوثر'' اسی پل کی مرمت کی ایک سنجیدہ کوشش ہے --- خاموش مگر بامعنیٰ، سادہ مگر گہری اور روایت سے جڑی ہوئی مگر عصر سے باخبر۔

یہ تمہید اسی یقین کے ساتھ رقم کی جا رہی ہے کہ قلم جب صداقت کے ساتھ کھڑا ہو جائے تو کمزور آوازیں بھی تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہیں اور جب قرطاس امانت دار ہو تو لفظ محض لفظ نہیں رہتا --- وہ ذمہ داری بن جاتا ہے۔

یہ ہمارے عہد کا سب سے خاموش مگر سب سے گہرا المیہ ہے کہ آنکھیں کھلی ہیں مگر نظر بند، انگلیاں متحرک ہیں مگر فکر ساکن اور وقت تیزی سے گذر رہا ہے مگر شعور وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ موبائل کی برق رفتار ترقی نے سہولت کے نام پہ انسان سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے جو اسے انسان بناتا تھا: ٹھہراؤ، تنہائی، غور و فکر اور مطالعات کی لذت۔ ہم ایسے زمانے میں سانس لے رہے ہیں جہاں لوگ اب پڑھتے نہیں --- دیکھتے ہیں، سوچتے نہیں --- چلتے ہیں اور سمجھتے نہیں --- ردِ عمل دیتے ہیں۔ اسکرین پر تیرتی ہوئی تصویریں آنکھ کو تو مصروف رکھتی ہیں مگر ذہن کو خالی کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ جو کبھی تہذیب کی ریڑھ کی ہڈی تھا آج عادت نہیں بلکہ اجنبی عمل بنتا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت تلخ سہی مگر ناقابلِ انکار ہے کہ موبائل فون نے کتاب کو شکست نہیں دی --- ہم نے خود کتاب سے منہ موڑ لیا۔ اسکرین نے متبادل پیش کیا مگر ہم نے انتخاب میں آسانی کو فوقیت دی اور گہرائی کو نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حافظہ کمزور ہوا، زبان سطحی ہو گئی اور فکر کی جگہ معلومات کے بے ہنگم شور نے لے لی۔

المیہ یہ نہیں کہ ہم اسکرین استعمال کرتے ہیں، المیہ یہ ہے کہ ہم صرف اسکرین استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ہر شئی فوری ہے، خبر، رائے، فیصلہ، حتیٰ کہ جذبات بھی۔ ایسے میں کتاب کا صبر آزما سفر، جملے کی تہہ میں اترنا اور معنیٰ کو وقت دینا ایک غیر ضروری مشقت سمجھتا ہے۔ اس تناظر میں سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ جس مغرب کو ہم نے اس اسکرین کلچر کا موجد سمجھ کر گالیاں دیتے ہیں وہ خود اس لعنت میں مبتلا ہونے کے باوجود کتاب سے رشتہ نہیں توڑ سکا۔ وہاں موبائل موجود ہے مگر کتاب زندہ ہے، اسکرین استعمال ہوتی ہے مگر مطالعہ ترک نہیں کیا گیا۔

مغربی معاشروں میں خارجی مطالعہ (Extra-curricular Reading) محض نصابی سرگرمی نہیں بلکہ تہذیبی عادت ہے۔ وہاں

اسکولوں سے لے کر جامعات تک لائبریری ثقافت زندہ ہے، گھروں میں کتاب شیلف زینت نہیں بلکہ ضرورت ہیں اور مطالعہ محض امتحان کی تیاری نہیں بلکہ ذہنی صحت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ تحقیق، تنقید اور تشکیل---تینوں کا پہلا زینہ کتاب ہی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں خارجی مطالعہ ایک اضافی مشغلہ نہیں بلکہ تقریباً ناپید روایت بنتا جا رہا ہے۔ نصاب سے باہر کی کتاب کو وقت کی بربادی سمجھا جاتا ہے، لائبریریاں خاموشی سے بند ہو رہی ہیں اور مطالعات کا ذوق اسکرین کے شور میں دب چکا ہے۔ ہم ڈگری تو حاصل کر لیتے ہیں مگر وژن سے محروم رہ جاتے ہیں، معلومات تو جمع کر لیتے ہیں مگر حکمت ہاتھ نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں فکر آگے بڑھتی ہے، سوالات جنم لیتے ہیں اور نئے نظریات تشکیل پاتے ہیں، جب کہ ہمارے یہاں ردِعمل غالب ہے، نقالی عام ہے اور فکری خودمختاری کمزور۔ انہوں نے اسکرین کو آلہ رکھا، ہم نے اسے متبادل بنا لیا۔ کتاب قاری سے صبر مانگتی ہے اور صبر ہی وہ وصف ہے جو انسان کو گہرائی عطا کرتا ہے۔ اسکرین صبر چھین لیتی ہے اور عادتاً انسان کو سطح پہ رکھتی ہے۔ کتاب سوال پیدا کرتی ہے، اسکرین جواب تھما دیتی ہے، چاہے وہ جواب درست ہو یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب پڑھنے والا اختلاف کرنا جانتا ہے اور اسکرین دیکھنے والا اکثر شور مچاتا ہے۔ ایک سوچتا ہے، دوسرا چلاتا ہے۔ ایک سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرا اسکرول کرتا ہے۔

یہ مضمون دراصل موبائل کے خلاف نہیں بلکہ مطالعے کے حق میں ایک تہذیبی احتجاج ہے۔ یہ یاددہانی ہے کہ اگر ہم نے کتاب سے رشتہ بحال نہ کیا تو آنے والی نسلیں زبان رکھیں گی مگر بیان نہیں، معلومات رکھیں گی مگر فکر نہیں اور اظہار رکھیں گی مگر تہذیب نہیں، وہ لفظوں کے ہجوم میں زندہ رہیں گی مگر معنیٰ کی روشنی سے محروم ہو جائیں گی، ان کے ہاتھ میں اسکرین ہوگی مگر ذہن میں افق نہیں، رفتار تو ہوگی مگر سمت نہیں، آواز تو ہوگی مگر وقار نہیں، اختلاف تو ہوگا مگر برداشت نہیں۔ کتاب سے دوری انسان کو معلوماتی بنا دیتی ہے مگر باخبر نہیں، بولنے کے ہنر تو سکھا دیتی ہے مگر سننے کا سلیقہ چھین لیتی ہے، یوں رفتہ رفتہ ایک ایسی نسل تیار ہوتی ہے جو ہر چیز پر رائے تو رکھتی ہے مگر کسی بات پہ غور کرنے کی عادت سے محروم ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحۂ فکر یہ ہے جہاں تہذیب خاموشی سے رخصت ہوتی ہے اور ہم اس کے جانے کی آہٹ تک سننے کے عادی نہیں رہتے۔

قرطاس وقلم کا زمانہ کبھی پرانا نہیں ہوتا صرف ہم پرانے ہو جاتے ہیں۔ اگر آج بھی ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے الفاظ میں وزن ہو، ہمارے خیالات میں گہرائی ہو اور ہمارے اختلاف میں شائستگی---تو ہمیں اسکرین کے ساتھ ساتھ کتاب کو واپس لانا ہوگا کیونکہ قومیں موبائل سے باخبر ہو سکتی ہیں مگر کتاب کے بغیر باخبر نہیں اور باوقار بھی نہیں۔

یہ عہد دلیل کم اور ڈیٹا زیادہ مانگتا ہے۔ اس لیے مطالعات کا زوال اگر محسوسات کی بجائے اعداد کی زبان میں دیکھا جائے تو تصویر زیادہ صاف ہو جاتی ہے---اور زیادہ تلخ بھی۔

(۱) یومیہ اسکرین ٹائم بمقابلہ یومیہ مطالعہ:

ہمارے یہاں یومیہ اسکرین استعمال: 6 تا 8 گھنٹے، یومیہ کتابی مطالعہ: 5 تا 15 منٹ۔

مغربی معاشروں میں یومیہ اسکرین استعمال: 5 تا 7 گھنٹے، یومیہ کتابی مطالعہ: 30 تا 60 منٹ۔

نتیجہ واضح ہے، اسکرین دونوں طرف ہے مگر کتاب صرف ایک طرف زندہ ہے۔

(۲) سالانہ مطالعۂ کتب (فی فرد)

ہمارے یہاں اوسط سالانہ کتابیں: 1 تا 2۔

مغرب میں اوسط سالانہ کتابیں: 10 تا 15۔

یہ فرق محض تعداد کا نہیں، یہ سوچ کی رفتار اور گہرائی کا فرق ہے۔

(۳) گھریلو لائبریری کلچر

ہمارے یہاں گھروں میں کتابیں: 20 سے کم (اکثر نصابی یا نمائشی)

مغرب میں: گھروں میں کتابیں: 100 سے زائد (غیر نصابی، تحقیقی، ادبی)۔ جہاں کتاب زینت ہو وہاں ذہن رک جاتا ہے اور جہاں کتاب ضرورت ہو وہاں ذہن چلتا ہے۔

(۴) خارجی مطالعہ (طلبہ و نوجوان)

ہمارے یہاں نصاب سے باہر باقاعدہ مطالعہ کرنے والے: 10-15%

مغرب میں خارجی مطالعے کے عادی: 60-70%

یہی وہ عددی فرق ہے جو ایک کو رد عمل سکھاتا ہے اور دوسرے کو تحقیق۔

(۵) لائبریری استعمال (سالانہ وزٹ)

ہمارے یہاں: اوسط وزٹ: 0 تا 2 بار۔

مغرب میں: اوسط وزٹ: 15 تا 25 بار۔ لائبریری جب خالی ہوتی ہے تو اسکرین ذہن بھر دیتی ہے---مگر فکر نہیں۔

(۶) مطالعہ اور اظہارِ رائے

ہمارے یہاں رائے کا ماخذ: سوشل میڈیا پوسٹس (70%+)

مغرب میں رائے کا ماخذ: کتب، جرائد، تحقیقی مضامین (50%+) اسی لیے ایک طرف شور ہے اور دوسری طرف استدلال۔

(۷) بچوں میں مطالعے کی شروعات:

ہمارے یہاں: پہلی غیر نصابی کتاب: 12-15 سال

مغرب میں: پہلی غیر نصابی کتاب: 3-5 سال۔ سوچنے کی عادت جتنی جلد پڑے اتنی دیر تک ساتھ رہتی ہے۔

(۸) کتاب پہ سالانہ خرچ

ہمارے یہاں فی فرد: انتہائی کم (اکثر صفر کے قریب)

مغرب میں فی فرد: باقاعدہ اور مسلسل- یہاں خرچ ڈیٹا پر ہے وہاں خرچ دانش پر۔

(اعداد کی روشنی میں) اگر دیکھا جائے تو یہ اعداد چیختے نہیں مگر فیصلہ سنا دیتے ہیں۔

ہم نے اسکرین کو متبادل بنالیا، انہوں نے اسے وسیلہ رکھا۔ ہم نے پڑھنا چھوڑا، انہوں نے دیکھنے کے باوجود پڑھنا نہیں چھوڑا اور یہی وہ عددی صداقت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موبائل ترقی کی علامت نہیں--- بلکہ مطالعے کا نعم البدل بنانے کا نام زوال ہے۔ اگر کتاب واپس نہ آئی تو اعداد بڑھیں گے مگر فہم نہیں۔

یہ اعداد محض شماریات نہیں، یہ ہمارے عہد کی خاموش فردِ جرم ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم نے سہولت کو حکمت پر، رفتار کو گہرائی پر اور اسکرین کو کتاب پہ ترجیح دیا---اور یہ سب کچھ غیر محسوس طریقے سے ہوا۔ یہی اس المیے کی سب سے خطرناک صورت ہے کہ زوال اعلان نہیں کرتا وہ عادت بن کر آتا ہے۔

آج ہمارا مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ٹھہراؤ نہیں۔ ہم اسکرین پہ گھنٹوں گذار سکتے ہیں مگر کتاب کے

ساتھ چند لمحے بیٹھنا ہمیں بوجھ لگتا ہے۔ہم خبریں جان لیتے ہیں مگر معانی تک نہیں پہنچ پاتے ،ہم رائے قائم کر لیتے ہیں مگر بنیاد کے بغیر۔یہی وہ خلا ہے جسے اعداد نے بے نقاب کیا ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس تہذیب کو ہم نے اس اسکرین کے فتنے کا ذمہ دار ٹھہرایا وہ خود کتاب سے وفادار رہی---اسی لیے وہاں فکر زندہ ہے، اختلاف مہذب ہے اور ترقی سمت کے ساتھ ہے اور ہم، جن کی روایت کا پہلا لفظ ہی ''اقرأ'' تھا، آج پڑھنے سے زیادہ دیکھنے پہ قانع ہو گئے ہیں۔یہ جملے محض نصیحت نہیں بلکہ ایک سوال ہے: کیا ہم آئندہ نسل کو صرف ڈیوائس دیں گے یا دلیل بھی؟ کیا ہم انہیں رفتار دیں گے یا بصیرت؟ اور کیا ہم اسکرین کے روشن فریم میں بند ذہن چاہیں گے یا کتاب کی خاموش روشنی میں آزاد فکر؟ اگر کتاب اب بھی واپس نہ آئی تو اعداد بڑھتے رہیں گے مگر انسان گھٹتا جائے گا اور شاید پھر کسی آنے والے زمانے میں کوئی اور قوم انہی اعداد کو دیکھ کر ہم پر یہی فیصلہ لکھے گی کہ ہم سب کچھ جانتے تھے---مگر پڑھتے نہیں تھے۔

''الکوثر''---کا زیرِ نظر شمارہ محض مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے فکری، تہذیبی اور ایمانی انتشار کے پس منظر میں ایک بیدار ضمیر کی صدا ہے۔اس کے صفحات میں کہیں تاریخ بولتی ہے، کہیں حال سوال بن کر کھڑا ہوتا ہے اور کہیں مستقبل کو سنوارنے کی خاموش التجا سنائی دیتی ہے۔

''حجاب اور اربابِ اقتدار: جب سیاست شائستگی سے عاری ہو جائے'' یہ مضمون حجاب کو ایک مذہبی علامت سے بڑھ کر اجتماعی ضمیر کے امتحان کے طور پہ پیش کرتا ہے اور یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اقتدار جب اخلاق سے خالی ہو جائے تو کمزور طبقات کی شناخت کیسے محفوظ رہے؟

''نعتیہ شاعری: ادب، احتیاط اور تقاضے'' یہ مضمون نعت کو محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک ذمہ دار ادبی و ایمانی فن کے طور پہ متعارف کراتا ہے جہاں عشق بھی ہے اور ادب کی سرحد بھی۔

''صدرالا فاضل: علم وعرفان کا نیرِ تاباں'' یہ مضمون صدرُ الا فاضل حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز کی علمی روشنی کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت ہے جو آج بھی فکری رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

''خدا کی تلاش یا صداقت سے فرار'' یہ مضمون عصرِ حاضر کے فکری بحران میں خدا کے تصور پہ اٹھنے والے سوالات کا سنجیدہ، مدلل اور فکری جواب ہے۔

''مذہبیات'' کے تحت شامل مضامین عبادات کو محض فقہی ابواب نہیں بلکہ انسان کی باطنی تشکیل اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے زندہ مظاہر کے طور پہ پیش کرتے ہیں۔روزہ یہاں جسمانی ضبط کا نام نہیں، بلکہ روح کی بالیدگی، ارادے کی تربیت اور خواہشات پہ شعوری غلبے کی علامت بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔زکوٰۃ فرد کے دل کی تطہیر کے ساتھ معاشرے کے زخموں پہ مرہم رکھنے والی وہ عبادت ہے جو مال کو بندگی اور سماج کو رحمت کی صورت عطا کرتی ہے۔اور اعتکاف ہنگامۂ دنیا سے کنارہ کش ہو کر قربِ الٰہی کی اس خلوت کا نام ہے جہاں انسان خود سے بلند ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوتا ہے۔

''درود شریف: پیغامِ سرمدی'' یہ مضمون دراصل اُس ازلی و ابدی تعلق کی یاد دہانی ہے جو بندۂ مومن کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے جوڑے رکھتا ہے۔درود وسلام محض الفاظ کی تکرار نہیں، بلکہ دل کی حضوری، ایمان کی تازگی اور روح کی بالیدگی کا وہ مسلسل سرچشمہ ہے جو زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔

اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ درود، محبتِ رسول ﷺ کا عملی اظہار اور امت کے لیے رحمتِ دوعالم ﷺ کا زندہ پیغام ہے۔عصرِ حاضر کی فکری و روحانی بے چینی کے پس منظر میں یہ مضمون قاری کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ درود شریف ہی وہ پیغامِ سرمدی ہے جو دلوں کو

سکون، معاشرے کو نور اور زندگی کو سمت عطا کرتا ہے۔

یہ مضمون اپنے موضوع کی پاکیزگی کے مطابق نہایت سنجیدہ، بصیرت افروز اور ایمانی حرارت سے لبریز ہے--- تاکہ قاری نہ صرف اس کی فضیلت سے آگاہ ہو بلکہ عمل کی توفیق بھی حاصل کرے۔

''ایصالِ ثواب: عبادت سے رحمت تک کا سفر'' یہ مضمون ایصالِ ثواب کے مسئلے کو محض ایک رسم یا روایت کے دائرے میں نہیں بلکہ عقیدہ، محبت اور امت کی باہمی روحانی وابستگی کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ عبادت جب اخلاص کے ساتھ انجام پاتی ہے تو اس کا نور صرف عامل تک محدود نہیں رہتا بلکہ رحمت کی صورت دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ زندوں اور رفتگاں کے مابین یہ تعلق دراصل اسی روحانی تسلسل کا نام ہے جسے قرآن و سنت نے بقا بخشی ہے۔ اس تحریر میں عبادت کے انفرادی پہلو سے اجتماعی رحمت تک کا سفر نہایت بصیرت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

''لمحے جو لوٹتے نہیں'' زندگی کے گذرنے والے لمحات انسان کو محاسبے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ مضمون وقت کی اہمیت، فرصت کی قدر اور اعمال کی جواب دہی کا احساس بیدار کرتا ہے۔ لمحے جو بیت جاتے ہیں، وہ محض ماضی نہیں بنتے بلکہ ہمارے انجام کی بنیاد بھی رکھتے ہیں۔ اس تحریر میں فانی دنیا کے عارضی قیام کو ابدی منزل کے تناظر میں دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انسان ہر گزرتے لمحے کو آخرت کی تیاری میں بدل سکے۔

''امانت و عدل: حسنِ سلوک کی قرآنی بنیادیں'' معاشرہ الفاظ سے نہیں، اقدار سے بنتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے امانت اور عدل کو حسنِ سلوک کی بنیاد قرار دے کر اجتماعی زندگی کو استحکام عطا کیا۔ یہ تحریر انہی اصولوں کی طرف مراجعت کی دعوت ہے--- جہاں دیانت کردار بنے اور انصاف مزاج۔

''حوصلے کی وہ شمع جو آندھیوں میں بجھتی نہیں'' تاریخ گواہ ہے کہ ایمان کی شمع آزمائشوں کی آندھیوں میں اور زیادہ روشن ہوئی ہے۔ یہ مضمون ایک عظمت مآب خاتون کی ثابت قدمی، صبر اور یقین کے اس چراغ کا تذکرہ ہے جو حالات کے طوفان سے نہیں ڈرتی بلکہ انہیں راستہ دکھاتی ہے۔

شخصیات کے تحت خواجہ غریب نواز اور ہماری عقیدتیں: عقیدت اگر شعور سے ہم آہنگ ہو تو تہذیب سنورتی ہے۔ اس مضمون میں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیمات کو ہماری اجتماعی زندگی کے آئینے میں دیکھا گیا ہے--- کہ محبت، خدمت اور رواداری ہی اصل خراجِ عقیدت ہے۔

''خموش چراغ کی روشنی'' کچھ شخصیات اعلان نہیں کرتیں مگر زمانہ ان کے فیضان سے منور رہتا ہے۔ یہ تحریر اسی خموش خدمت اور بے نام اخلاص کو سلام ہے جو شہرت کے بغیر بھی اثر رکھتا ہے اور چراغ کی طرح جلاتا نہیں، جگمگاتا ہے۔

''مفتی اعظم ہند اور اصلاحِ معاشرہ'' اصلاح محض وعظ نہیں، حکمت اور جرأت کا امتزاج ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی اسی بصیرت کی آئینہ دار تھی--- جہاں فتویٰ رہنمائی بھی تھا اور معاشرتی توازن کا ضامن بھی۔ مضمون میں ان کی اصلاحی جدوجہد کو عصرِ حاضر کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''الکوثر'' کا زیرِ نظر شمارہ عقیدت، فکر اور اصلاح کے رنگوں سے مزین ہے۔ ''الکوثر'' اپنے اس سفر میں روایت کی امانت اور عصر کی ضرورت--- دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم دہراتا ہے، تاکہ قلم روشنی بھی رہے اور ذمہ داری بھی۔

''الکوثر'' ان مضامین کے ذریعے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ عبادت کا اصل حسن اسی وقت نکھرتا ہے جب وہ فرد کے باطن کو سنوارنے کے ساتھ اجتماعی اخلاق میں بھی ڈھل جائے۔ یہی وہ ربط ہے جو دین کو زندگی سے اور زندگی کو دین سے ہم آہنگ کرتا ہے--- اور عبادت کو محض عمل نہیں، ایک ہمہ گیر تربیت بنا دیتا ہے۔

جب تاریخ کے روشن اوراق کو موجودہ ذوق کی کمزور روشنی میں پرکھنے کی جسارت کی جاتی ہے تو اصل اندیشہ کسی ایک نام یا کردار کا نہیں رہتا بلکہ اس فکری سمت کا ہو جاتا ہے جس کی طرف اجتماعی شعور کو موڑا جا رہا ہے۔ حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں ایک ذمہ دار مذہبی اسٹیج سے یہ اعلان کہ وہ ہمارے لیے رول ماڈل نہیں---محض ایک جملہ نہیں بلکہ اس ذہنی رویے کا اظہار ہے جو اپنی جڑوں سے کٹ کر خود کو زیادہ روشن خیال سمجھنے لگتا ہے۔ ''میں آئینہ ہوں چہرہ نہیں'' یہ مضمون کسی تاریخی شخصیت کو تقدیس کے حصار میں بند کرنے کی کوشش نہیں کرتا، نہ ہی خطاؤں سے ماورا ثابت کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ یہ تحریر چہرہ بننے کی بجائے آئینہ ہے---ایسا آئینہ جو سوال کرتا ہے کہ ہم کن پیمانوں سے اپنے اسلاف کو ناپ رہے ہیں؟ کیا وہ معیار، جن پہ آج فیصلے صادر کیے جا رہے ہیں، شریعت، تقویٰ اور عدل سے ماخوذ ہیں یا محض عہدِ حاضر کی فکری سہولتوں سے؟

''الکوثر'' اس تحریر کے ذریعے یاددہانی کراتا ہے کہ تاریخ سے بے توجہی کا رویہ دراصل حال سے بے وفائی کی پہلی سیڑھی ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے محسن اسلاف کو مشتبہ بنا دیتے ہیں تو آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں شناخت نہیں، صرف ابہام کی پیالی تھما دیتے ہیں۔ یہ مضمون دفاع نہیں، احتجاج ہے، شخصیات کے لیے نہیں، اصولوں کے لیے---اور اسی لیے اس کا عنوان اعلان کرتا ہے: ''میں آئینہ ہوں، چہرہ نہیں''۔

''استفاضۂ خبر: ایک تحقیقی جائزہ'' اس کے تحت شامل مضامین فقہی و اصولی تناظر میں استفاضۂ خبر کا سنجیدہ مطالعہ پیش کرتے ہیں، جہاں روایت، تحقیق اور احتیاط تینوں ہم آہنگ اور مربوط نظر آتے ہیں اس عنوان پہ اہلِ سنّت و جماعت کی فکری زمین میں جو ایک نیا باب کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جسے تحقیقِ جدید کا خوش نما اور دلفریب نام دیا جا رہا ہے اس نے حساس طبع اور بیدار مغز علماء کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نام نہاد تحقیقی رجحان کے نتیجے میں نہ صرف قدیم مسلّمات پہ سوالیہ نشان لگائے جا رہے ہیں بلکہ ایک ایسی فکری فضا بھی تشکیل دی جا رہی ہے جو امت کے علمی تسلسل، فقہی اعتماد اور مسلکی وقار کے لیے باعثِ تشویش ہے۔

اسی پس منظر میں بعض شخصیات کی آراء اور تعبیرات بتدریج علمی مناقشے اور فکری اضطراب کا عنوان بنتی جا رہی ہیں بالخصوص اس بنا پہ کہ وہ اپنی ہر تحقیق کے استدلال میں ''فتاویٰ رضویہ'' سے استفادے کا دعویٰ پیش کرتی ہیں جب کہ اہلِ نظر کے نزدیک ان کی تعبیر و تطبیق میں محض سنجیدہ علمی تحفظات ہی نہیں بلکہ ایسی صریح لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں جو نصوص کے وقار، ائمۂ اہلِ سنّت کے منہج اور مسلمہ فقہی اصول و ضوابط کو شدید مجروح کرتی ہیں۔

گذشتہ شمارے میں بھی اسی تناظر میں حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمٰن رضوی مظفر پوری کا ایک مفصل، مدلل اور اصولی فتویٰ شائع کیا گیا تھا، جس میں انہوں نے اس نام نہاد تحقیقی فکر کا نہایت عمیق، ہمہ جہت اور سنجیدہ محاسبہ پیش فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ محقق مسائل جدیدہ کی تحقیق ''فتاویٰ رضویہ'' سے مستفاد نہیں بلکہ متعارض ہے جسے سنجیدہ، باشعور اور فکری اعتبار سے بیدار مغز قارئین کے حلقوں میں غیر معمولی اعتماد کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کی اشاعت پہ ادارہ ''الکوثر'' کو نہ صرف مبارکباد پیش کی گئی بلکہ متعدد اہلِ علم نے اپنے قلبی اطمینان اور فکری تسکین کا بھی برملا اظہار کیا اور خصوصیت کے ساتھ یہ بات سراہی گئی کہ فتنۂ تجدد اور فکری ہیجان کے اس دور میں اس فتوے نے جذبات کی بجائے اصول، شور کی جگہ شعور اور شدت کے مقابلے میں علمی استقامت کی نمائندگی کی۔ فتنۂ تجدد کے خلاف جرأت مندانہ مگر متوازن آواز بلند کرنے پہ حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمٰن رضوی مظفر پوری کو تحسین و آفریں سے نوازا گیا اور ان کے اس اقدام کو اہلِ سنّت کے فکری دفاع میں ایک مضبوط، بروقت اور باوقار قدم قرار دیا گیا۔

''الکوثر'' کا زیرِ نظر شمارہ مسئلۂ رویتِ ہلال اور آلاتِ جدیدہ کے باب میں محض ایک معاصر بحث کا احاطہ نہیں بلکہ ایک فکری دستاویز کی

صورت تاریخ کے اوراق میں درج ہونے جا رہا ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جہاں نزاع نہیں، نسبت بولتی ہے، جہاں شور نہیں، اصول گفتگو کرتے ہیں۔ اسی تسلسل میں اس شمارے کا ایک نہایت اہم اور وزنی حصہ ہمیں اس عہد کی طرف لوٹاتا ہے جب یہ فتنہ ابھی اپنے ننھے قدموں سے سفر پہ روانہ ہوا تھا۔

سن 1970ء میں جب جدید ذرائعِ مواصلات کو شرعی اصولوں سے جوڑنے کی ابتدائی کوششیں منظر پہ آ رہی تھیں، فخر بہار حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ---معروف عالمِ دین، کہنہ مشق خطیب اور منفرد طرز فکر کے حامل صاحبِ قلم--- نے تیس صفحات پہ مشتمل ایک مستقل کتاب شائع فرما کر اس مسئلے کو علمی دیانت، فقہی احتیاط اور ادارہ جاتی ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا۔ یہ محض ایک تصنیف نہ تھی بلکہ اس عہد کے مرکزی مذہبی اداروں کے ذمہ دار مفتیانِ کرام کے فتاوے کا ایک باوقار اور مربوط مجموعہ تھا، جس میں روایت کی حفاظت بھی تھی اور امت کی رہنمائی بھی۔ اس تاریخی دستاویز کی شمولیت اس گوشے کو محض مکمل نہیں کرتی بلکہ معتبر بناتی ہے۔

اسی فکری روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے معروف قلم کار اور ذمہ دار مفتی حضرت مولانا مفتی محمد شمشاد حسین رضوی کا مقالہ اس خصوصی گوشے میں ایک اصولی مکالمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اختراعی استفاضۂ خبر کے تصور پہ نہ جذباتی ردِ عمل دیا، نہ شخصی تنقید کا سہارا لیا بلکہ قاضی کی منصبی ذمہ داری، اس کے حدود و قیود اور شرعی فیصلے کے منہج پہ ایک سنجیدہ اور مدلل گفتگو قائم کی ہے۔ خاص طور پہ ان آراء کا علمی و فکری تعاقب کیا گیا ہے جو جدید آلاتِ مواصلات کو بلا قید و شرط استفاضۂ خبر سے مربوط کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ نکتہ نہایت صراحت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ ''بقدرِ کفایت'' کوئی شرعی اصول یا ضابطہ نہیں بلکہ ایک جدید تعبیر ہے جس کی اساس و بنیاد ہمیں فقہی مصادر و مراجع میں نہیں ملتی۔

یہ گوشہ دراصل اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ شریعت سہولت ضرور دیتی ہے مگر بے مہار نہیں، نرمی قبول کرتی ہے مگر اصولوں کی قیمت پہ نہیں۔ ''الکوثر'' کا یہ شمارہ اسی فکری امانت اور علمی دیانت کے ساتھ اپنے قاری کے سامنے حاضر ہے---ایک دستاویز کے طور پہ، ایک شہادت کے طور پہ اور ایک ذمہ دار مکالمے کی دعوت کے طور پہ۔

حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری بانی و سربراہ دارُ العلوم فیضان تاج الشریعہ بریلی شریف نے بھی اسی موضوع پہ اپنی تحقیق نہایت متانت، علمی جلال اور قدرے منفرد اسلوب میں پیش فرمائی ہے جو یقیناً سنجیدہ قارئین کے لیے فکری رہنمائی کا سامان رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ اس مسئلے پہ مزید تحریریں بھی مستند مفتیانِ کرام کی جانب سے موصول ہو چکی ہیں، جو فی الحال ''الکوثر'' کی فائل میں محفوظ ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ شماروں میں سلسلے وار اشاعت کے مرحلے سے گذاری جاتی رہیں گی۔

''الکوثر'' ہر عہد میں ابھرنے والے فتنۂ جدید کے خلاف بند باندھنے، فکری سرحدوں کی پہرے داری اور مسلکی تشخص کی حفاظت کے عزمِ صمیم پہ قائم ہے۔ ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ فتنہ ہمیشہ کھلے اسلحوں کے ساتھ نہیں آتا بلکہ اکثر تحقیق کے لباس میں، اجتہاد کے عنوان سے اور فکری تجدید کے خوش نما نعروں کے سائے میں در آتا ہے---اور سب سے زیادہ نقصان اسی خموش در اندازی سے ہوتا ہے۔

جو افکار امت کے مسلمہ اصولوں کو مشتبہ بنائیں، جو ائمۂ اہلِ سنّت کی طے شدہ تعبیرات میں شکوک کی دراریں ڈالیں اور جو علمی روایت کو من مانے نتائج کے تابع کر دیں--- وہ خواہ کتنی ہی جدید اصطلاحات سے مزین کیوں نہ ہوں، تحقیق نہیں بلکہ فتنہ ہوتے ہیں۔ ایسے رجحانات اگر ''فتاویٰ رضویہ'' جیسے عظیم، معتمد اور معتبر علمی ذخیرے کو سیاق و سباق سے کاٹ کر من پسند تعبیرات کی نذر کریں تو یہ محض علمی لغزش نہیں بلکہ علمی خیانت اور مسلکی امانت میں کھلی دست درازی ہے۔

''الکوثر'' واضح اعلان کرتا ہے کہ وہ ہر اس تحریر کا خیر مقدم کرتا ہے جو علمی دیانت، اصولی التزام اور مسلکی شعور کے دائرے میں رہ کر لکھی گئی ہو---خواہ وہ اس فتنے کے رد میں ہو یا اس کی تائید میں---لیکن وہ ہرگز ایسی نام نہاد تحقیق قبول نہیں کر سکتا جو سوال کم اور شبہ زیادہ پیدا کرے، جو

تعمیر کی بجائے تخریب کا سامان فراہم کرے اور جو اہلِ سنّت کے فکری قلعے میں دروازے کی جگہ شگاف پیدا کرے۔

یاد رکھیے یہ معرکہ اشخاص کا نہیں، افکار کا ہے، ناموں کا نہیں، نظریات کا ہے۔ یہاں خاموشی مصلحت نہیں بلکہ جرم ہے اور غیر جانبداری علم نہیں بلکہ بے حسی۔ اس لیے ''الکوثر'' نہ فکری ابہام پہ سمجھوتہ کرے گا اور نہ مسلکی سرحدوں پہ پہرے ڈھیلے پڑنے دے گا۔ ہم قلم کو امانت، خاموشی کو خیانت اور حق گوئی کو ہی اصل تحقیق سمجھتے ہیں---اور اسی معیار پہ ہر تحریر جانچی اور پرکھی جائے گی۔

یہاں یہ حقیقت بھی پوری صراحت کے ساتھ سامنے رہنی چاہیے کہ فتنۂ تجدد کے خلاف محض نعرہ یا عمومی اعلان کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسباب، اس کی فکری جڑوں اور اس تاریخی عمل کو بے نقاب کرنا بھی ناگزیر ہوتا ہے جس کے ذریعے غیر محسوس انداز میں مسلّمات کو متزلزل کیا جاتا ہے۔ رویتِ ہلال اور استفاضۂ خبر کے باب میں پیدا ہونے والا موجودہ انتشار دراصل کسی ایک فرد، ایک فتوے یا ایک دور کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے پیچھے ذرائعِ ابلاغ کی تدریجی تاریخ، ان پہ ہونے والی فقہی تطبیقات اور تحقیقِ جدید کے نام پہ روا رکھے گئے مسلسل انحرافات کی ایک طویل داستان کارفرما ہے۔

اسی لیے اس مسئلے کا صحیح فہم محض جذباتی رد یا شخصی تعین سے نہیں بلکہ اس تاریخی اور اصولی جائزے سے ممکن ہے جس میں خط سے لے کر تار اور تار سے ٹیلی فون تک کے تمام مراحل کو فقہی میزان پہ پرکھا جائے---تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کہاں روایت باقی رہی اور کہاں تحقیق کے نام پر روایت سے انحراف کیا گیا۔

شریعت کی بنیاد وحی، فہمِ سلف اور فقہی اصولوں پر ہے۔ یہ بنیادیں زمانے کے تغیرات سے متأثر نہیں ہوتیں البتہ ہر عہد میں انہی اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل کا وزن مقرر کیا جاتا ہے۔ رویتِ ہلال کے باب میں ذرائعِ ابلاغ (آلاتِ مواصلات) کی تاریخ کو بنیاد بنا کر جو فکری لغزشیں پیدا کی گئیں، ان کا تنقیدی مطالعہ آج اس لیے بھی ناگزیر ہو چکا ہے کہ بعض پرانے انحرافات کو نئے نام دے کر دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسی تناظر میں حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی نئی نسل کے اُن معتبر، باوقار اور اصول پسند فقہاء میں شامل ہیں جنہوں نے جماعتِ اہلِ سنّت میں اپنی ایک واضح اور قابلِ اعتماد شناخت قائم کی ہے۔ زیرِ بحث موضوع پہ ان کی تحقیق محض ایک معاصر کاوش نہیں بلکہ ایک مضبوط علمی اور تاریخی حوالہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ جدید وسائل کے محض انکار کے قائل نہیں بلکہ ان کے شرعی محلِ استعمال پہ گفتگو کرتے ہیں اور قدیم فقہی خطوط کو ترک کیے بغیر جدید دعوؤں کا سنجیدہ محاسبہ پیش کرتے ہیں۔

ان کے فتوے میں تحقیق کی تازگی بھی ہے اور روایت کی پاسداری بھی۔ وہ قدیم مصادر کی روشنی میں جدید سوالات کو پرکھتے ہیں، نہ جذبات کی رو میں بہتے ہیں اور نہ تقلیدِ جامد کے حصار میں مقید ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں نص کی حرمت بھی محفوظ رہتی ہے اور زمانے کی نبض پہ ہاتھ بھی قائم رہتا ہے۔ یہی متوازن منہج ان کے فتوے کو محض وقتی جواب بننے سے بچا کر فکری رہنمائی کا درجہ عطا کرتا ہے---ایسی رہنمائی جو عقل کو مطمئن کرتی ہے اور دل کو تسکین کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔

اسی اصولی استقامت کے باعث ان کی گفتگو میں وقتی مصلحت جھلکتی ہے اور نہ فکری بے سمتی۔ جدید اصطلاحات کے شور میں بھی وہ قدیم اصولوں کی صدا دبنے نہیں دیتے اور ہر نئی پیش رفت کو میزانِ شریعت پہ تول کر ہی قبول یا رد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر اور فتویٰ دونوں میں استدلال کی مضبوطی، لہجے کی متانت اور علمی دیانت ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

جدید آلاتِ مواصلات سے قبل پیغام رسانی کا سب سے زیادہ مستعمل ذریعہ خط و مراسلت تھا۔ فقہائے متقدمین نے امورِ شرعیہ---خصوصاً

رویتِ ہلال--- میں خطوط کو شہادت یا استفاضہ کے قائم مقام تسلیم نہیں کیا کیونکہ اس سے وہ قطعیت پیدا نہیں ہوتی جو شرعی احکام کے لیے لازم ہے۔ اسی لیے متأخرین فقہاء بھی انہی متقدمین ارباب فقہ وفتاویٰ کے کھینچے ہوئے فقہی خطوط پہ عامل رہے۔

مگر افسوس کہ اس مرحلے پہ پہلی بار دیوبندی مکتبۂ فکر کی جانب سے تحقیقِ جدید کے نام پہ انحراف کی جسارت کی گئی اور یہ کہا گیا کہ خط کے ذریعے بھی چاند ثابت ہوسکتا ہے حالاں کہ فقہی اصول اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہی وہ پہلا شگاف تھا جس نے بعد کے بڑے انحرافات کی راہ ہموار کی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ٹیلی گراف ایجاد ہوا (تقریباً ۱۸۳۰ء) یہ ایک انقلابی ذریعہ تھا مگر علمائے حق نے واضح کیا کہ تار کی خبر بھی خط ہی کی توسیع ہے لہٰذا اس سے رویتِ ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔ ابتدا میں بعض دیوبندی علماء نے بھی اسی موقف کی تائید کی مگر جلد ہی تحقیق جدید کے نام پہ اس کے برعکس بات کہی جانے لگی اور پھر حالات کے دباؤ پہ اس سے رجوع بھی کیا گیا-- جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ موقف اصولی نہ تھا۔

ٹیلی فون کی ایجاد ۱۸۷۶ء میں ہوئی مگر اس کا عام استعمال برصغیر میں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۶۰ء کے درمیان ہوا۔ اس مرحلے پہ بھی ابتدا میں دیوبندی مکتبۂ فکر کی جانب سے یہی کہا گیا کہ ٹیلی فون کی خبر شرعی شہادت نہیں بن سکتی مگر وقت کے ساتھ ساتھ رویّوں میں نرمی آتی گئی، یہاں تک کہ غلبۂ ظن اور کثرتِ بیانات کو بنیاد بنا کر شخصی عمل کی اجازت اور پھر بالآخر اجتماعی حکم کی راہیں تلاش کی جانے لگیں۔

مولوی کفایت اللہ دہلوی کے فتاوے اس تدریجی تبدیلی کی نمایاں مثال ہیں۔ پہلے کہا گیا کہ ٹیلی فون کی خبر شہادت کے قائم مقام نہیں لیکن اگر کسی کو یقین ہوجائے تو وہ ذاتی طور پہ عمل کرسکتا ہے--- البتہ عام حکم نہیں دیا جاسکتا۔ پھر یہ دائرہ پھیلا کر اخبار کے اعلان، تار، ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبروں کو استفاضے کے مفہوم میں داخل کر دیا گیا حالاں کہ فقہی استفاضے کی شرط یہ ہے کہ مختلف اطراف سے مختلف افراد بذاتِ خود رویت یا مجلسِ قضاء میں قبولِ شہادت کی خبر دیں--- نہ کہ محض ذرائعِ ابلاغ کی کثرت۔

یوں تقریباً پچھتر برس قبل (۱۳۵۰ھ کے آس پاس) ایک اختراعی استفاضہ وجود میں آیا، جسے جدید آلاتِ مواصلات کے سہارے شرعی رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ اس کے رد وتردید میں علمائے اہلِ سنّت بالاتفاق ابتدا ہی سے کھڑے رہے اور ہر دور میں اس کی علمی تردید کرتے آئے۔ حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی نے اسی تسلسل کو نہایت سلیقے، تحقیق اور دیانت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ انہوں نے مسئلے کو محض معاصر نزاع کے زاویے سے دیکھا اور نہ کسی مخصوص ردِّعمل کے تحت قلم اٹھایا بلکہ رویتِ ہلال اور استفاضۂ خبر کے پورے باب کو اس کے تاریخی ارتقا، فقہی پس منظر اور اصولی حدود کے ساتھ منضبط انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحقیق کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر مرحلے پہ قدیم فقہی مسلمات کو اساس بناتے ہیں پھر جدید ذرائعِ ابلاغ کی حقیقت، نوعیت اور اثرات کا غیر مرعوبانہ جائزہ لیتے ہیں اور آخر کار ان دونوں کے باہمی تعلق کو میزانِ شریعت پہ رکھ کر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی نے اپنے اس فتوے میں محض ایک فقہی موقف پیش نہیں کیا بلکہ تاریخ کے آئینے میں حال کا چہرہ دکھا دیا ہے۔ انہوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ آج سے پچھتر برس قبل رویتِ ہلال اور آلاتِ مواصلات کے باب میں جو استدلالات دیوبندی مکتبۂ فکر کے علماء بار بار دہراتے رہے اور جن کے مقابل علمائے اہلِ سنّت نے بالاتفاق علمی محاذ قائم کیا، وہی افکار آج نئے عنوانات، نرم لہجوں اور عصری اصطلاحات کے پردے میں دوبارہ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔

حیرت واستعجاب کا پہلو یہ ہے کہ اب یہ آوازیں اُن حلقوں سے بلند ہورہی ہیں جن کے کاندھوں پہ امت کی امانت ہے اور جن کے ہاتھوں میں ایک عظیم ادارے کی فکری قیادت۔ دلائل وہی ہیں، منطق وہی، سہولت پسندی کا زاویہ بھی وہی-- بس نسبت بدل گئی ہے اور لبادہ نیا پہن لیا گیا

ہے۔حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی نے اس تاریخی تسلسل کو بے نقاب کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ افکار کی اصل پہچان ناموں سے نہیں، اصولوں سے ہوتی ہے اور جو بات کل اہلِ سنّت کے نزدیک مردود تھی، وہ آج محض تکرار اور تعبیر کی تبدیلی سے مقبول نہیں بن سکتی۔

یوں یہ فتویٰ صرف ماضی کی گرد جھاڑنے کی کوشش نہیں بلکہ حال کے لیے ایک آئینہ اور مستقبل کے لیے ایک تنبیہ-- کہ اہلِ سنّت کی شناخت وقتی سہولت یا ادارہ جاتی مصلحت سے نہیں بلکہ اُس منہج سے قائم رہتی ہے جو روایت کی حفاظت اور تحقیق کی دیانت دونوں کی امین ہو۔

انہوں نے خط، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون جیسے ذرائع کے تدریجی ظہور کو محض تکنیکی معلومات کے طور پہ بیان نہیں کیا بلکہ یہ واضح کیا ہے کہ ہر نئی ایجاد کے ساتھ فقہی موقف میں جو نرمی، تبدیلی یا انحراف پیدا کیا گیا وہ کن اصولی کمزوریوں کا نتیجہ تھا اور کہاں کہاں ''تحقیقِ جدید'' کے نام پہ فقہ کے مسلمہ ضوابط سے تجاوز کیا گیا۔ان کا اسلوب محض ناقدانہ نہیں بلکہ تنقیحی ہے وہ اختلاف کو ابھارتے نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں اسے خود بے وزن کر دیتے ہیں۔

مزید یہ کہ حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی کی تحقیق کی ایک بڑی قوت یہ ہے کہ وہ کسی ایک فرد کی داخلی بحث تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورے فکری منظرنامے کو سامنے رکھ کر یہ دکھاتے ہیں کہ اختراعی استفاضہ کس طرح بتدریج ایک سہل پسند ذہنیت میں ڈھلتا گیا اور پھر وہی ذہنیت آج نئے عنوانات اور نئی تعبیرات کے ساتھ دوبارہ پیش کی جا رہی ہے۔اس زاویۂ نظر سے ان کی تحریر محض کسی ایک موقف کا رد نہیں رہتی بلکہ مسئلے کی فکری جڑوں کو بے نقاب کرتی ہے۔یوں یہ کاوش وقتی مناقشے سے آگے بڑھ کر آئندہ کے لیے فکری رہنمائی، اصولی احتیاط اور علمی بیداری کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اسی جامعیت، توازن اور اصولی استقامت کے سبب موصوف کی یہ تحقیق اہلِ سنّت کے علمی سرمائے میں ایک سنجیدہ، قابلِ اعتماد اور باحوالہ اضافہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے--- ایسی کاوش جو نہ صرف فتنۂ تجدد کے شور میں حق کی آواز نمایاں کرتی ہے بلکہ تحقیق اور روایت کے باہمی رشتے کو بھی مضبوط تر بناتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ جدید مسائل کا حل قدیم اصولوں سے انحراف میں نہیں بلکہ انہی کی روشنی میں تدبر اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے میں ہے۔

یہ امر باعثِ تشویش ہے کہ موجودہ دور میں اپنے آپ کو اہلِ سنّت سے منسوب کرنے والے بعض حلقے ایک ایسے تصور کو، جسے اکابرِ اہلِ سنّت نے اصولی، فقہی اور منہجی بنیادوں پہ نا قابلِ قبول قرار دیا ہے، نئی اصطلاحات، معاصر نعروں اور ظاہری تعبیرات کے ساتھ دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔حالاں کہ اس تصور کی اساس وہی قدیم استدلال ہے، منطق وہی سابقہ طرزِ فکر، اور عملی سطح پہ وہی سہولت پسندی جو اہلِ سنّت کے مسلمہ اصولوں، فقہی ضوابط اور اجماعی مزاج کے خلاف ہونے کے سبب ہمیشہ محلِّ رد رہی ہے-ایسے میں حضرت مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری رضوی کی تحقیق ایک آئینہ بن کر سامنے آتی ہے جو صاف لفظوں میں بتا دیتی ہے کہ ذریعہ بدل جانے سے اصول نہیں بدلتے اور نام بدل لینے سے بدعت سنّت نہیں بن جاتی۔

اسی تناظر میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ محض ایک فقہی اختلاف یا جزوی بحث نہیں بلکہ ایک سنجیدہ تنبیہ ہے--- کہ شریعت کی میزان کو آلاتِ مواصلات کے پلڑے میں نہ تولا جائے بلکہ ہر نئی ایجاد قدیم، مسلمہ اور آزمودہ اصولوں کے سامنے رکھ کر پرکھی جائے۔یہی اہلِ سنّت کا منہج ہے، یہی ان کے فکری تسلسل کی پہچان اور یہی اس اداریے کا مرکزی پیغام ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے افکار کی اساس اس یقین پہ قائم تھی کہ دین کسی عہد کی نفسیات کا تابع نہیں بلکہ ہر عہد کی نفسیات دین کے تابع ہے۔اسی لیے انہوں نے بدلتے ہوئے زمانے کے دباؤ کو میزانِ حق بنایا اور نہ وقتی مصلحتوں کو معیارِ شریعت۔ان کے

نزدیک شریعت ایک ابدی میزان ہے جو زمانوں کو پرکھتی ہے، نہ کہ زمانے شریعت کو۔ چنانچہ انہوں نے ہر اس فکری رجحان کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا جو دین کو عصری خواہشات، سماجی دباؤ یا فکری فیشن کے تابع بنانے کی کوشش کرتا تھا انہوں نے واضح کر دیا کہ دین وشریعت اکثریت، مقبولیت یا عصری قبولِ عام سے نہیں بلکہ نصوص، اجماع اور اصولِ اہلِ سنّت سے متعین ہوتی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ جب شریعت کو طبیعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو علم سہولت کا آلہ بن جاتا ہے اور فتویٰ مصلحت کی زبان۔ ایسے میں اجتہاد تحقیق کی بجائے جواز تراشی میں بدل جاتا ہے اور دین ہدایت کے مقام سے اتر کر سماجی مطابقت کی سطح پہ آ کھڑا ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسی خطرے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اصول کی پاسبانی کو شعار بنایا تاکہ شریعت کا وقار قائم رہے اور اہلِ علم زمانے کے بہاؤ میں بہنے کی جگہ زمانے کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ ان کے نزدیک عالم کا منصب یہ تھا کہ وہ ذوقِ عام کا تابع بننے کی بجائے ذوق کو شریعت کے تابع کرے کیونکہ یہی اہلِ سنّت کی علمی امانت اور فکری ذمہ داری ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں اصل معرکہ مسائل کا نہیں، مزاجوں کا تھا --- اعلیٰ حضرت کی علمی صلابت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے روایت کو محض ماضی کی یادگار نہیں سمجھا بلکہ اسے زندہ امانت مانا، ایسی امانت جسے عقل کے ترازو میں تولنا تو جائز ہے مگر خواہش کے پیمانے سے ناپنا خیانت۔ ان کے نزدیک اجتہاد، نص کے مقابل نہیں بلکہ نص کے سائے میں سانس لینے کا نام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر میں تازگی ہے مگر بے راہ روی نہیں، وسعت ہے مگر بے قید نہیں اور جرأت ہے مگر گستاخی نہیں۔ ان کے اجتہاد میں حرکت ہے مگر اضطراب نہیں، ان کے اختلاف میں استقامت ہے مگر انتشار نہیں اور ان کے رد میں صلابت ہے مگر تلخی نہیں۔ وہ روایت کے امین بھی ہیں اور بصیرتِ عصر کے حامل بھی مگر روایت کو جمود بناتے ہیں اور نہ بصیرت کو خودسری۔ ان کی تحریر میں شدتِ حق ہے مگر افراط نہیں اور ان کے منہج میں احتیاط ہے مگر خوف نہیں --- اسی لیے ان کی فکر زمانوں کو متأثر کرتی ہے مگر زمانوں سے متأثر نہیں ہوتی۔

اعلیٰ حضرت کا فتویٰ خوفِ خدا کی تحریری صورت تھا۔ وہ زمانے کے رواج سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ اس دن سے ڈرتے تھے جب قلم کے ایک ایک جملے کا حساب دینا ہوگا۔ اسی احساسِ جواب دہی نے ان کے فتوے کو محض قانونی رائے نہیں رہنے دیا بلکہ اسے امانتِ شرعی بنادیا۔ ان کے نزدیک فتویٰ وہ مقام تھا جہاں علم، تقویٰ اور احتیاط ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ اگر بے لگام ہوجائیں تو نسلوں کی رہنمائی مشکل ہوجاتی ہے، اس لیے انہوں نے ہر سطر کو خشیت کی میزان پہ تولا اور ہر فیصلہ اس یقین کے ساتھ رقم کیا کہ اصل مخاطب عوام نہیں، ربّ العالمین ہے۔ اسی خوف نے ان کے علم کو عبادت بنادیا اور ان کی تحقیق کو امانت۔ انہوں نے بتایا کہ شریعت کو نرم کرنے کا نام دین نہیں، دل کو جھکانے کا نام دین ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں علم تقوے میں ڈھل جاتا ہے۔

اسی منہج کی جھلک زیرِ نظر شمارے میں صاف نظر آتی ہے یہاں زمانے کی سہولت کو اصول بنایا گیا ہے اور نہ اصول کو زمانے پہ قربان کیا گیا ہے۔ یوں یہ تحریر ہمیں یاددلاتی ہے کہ جب طبیعت کو شریعت کا مزاج مل جائے تو فتویٰ صرف جواب نہیں رہتا بلکہ امت کے لیے اطمینان، فتنوں کے درمیان میزان اور حق کے لیے روشن لکیر بن جاتا ہے۔

دعا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی یہ فکری امانت اسی دیانت کے ساتھ آگے بڑھے اور یہ چراغ --- جو خوفِ خدا، محبتِ رسول ﷺ اور پاسداریِ شریعت سے روشن ہے --- زمانے کی کسی آندھی میں بجھنے نہ پائے۔

''الکوثر'' کا یہ شمارہ قاری کو محض مطالعے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ خوداحتسابی، فکری بیداری اور ایمانی تجدید کی طرف بلاتا ہے۔ یہ صفحات گواہ ہیں کہ جب قلم امانت دار ہو اور فکر روایت سے مربوط ہو تو تحریر محض الفاظ نہیں رہتی --- وہ ذمہ داری بن جاتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''الکوثر'' کے اوراق بند کرتے ہوئے دراصل ایک کتاب ختم نہیں ہوتی، ایک سوال شروع ہوجاتا ہے --- وہ سوال جو

قاری کے ضمیر سے مخاطب ہے، جو اس کے ایمان، فکر اور طرزِ زندگی کے دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ یہ شمارہ ہمیں خموشی کی سہولیات نہیں دیتا، یہ مطالعے کے بعد سکون نہیں بلکہ اضطراب عطا کرتا ہے---اور یہی اضطراب زندہ ہونے کی علامت ہے۔

یہاں تحریریں ہمیں بتاتی ہیں کہ تہذیبیں اس دن مرتی ہیں جس دن سوال پوچھنا چھوڑ دیتی ہیں اور امتیں اس وقت کمزور ہوتی ہیں جب روایت سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کہیں ایمان کی حرارت کے بکھرنے کا نوحہ ہے، کہیں حجاب کی پامالی کے پس منظر میں اجتماعی ضمیر کی شکست، کہیں سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار سے جھانکتی وہ روشنی ہے جو ہر دور کے اندھیروں کو چیلنج کرتی ہے۔ یہ سارے مضامین مل کر ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ اصل بحران علم کی کمی نہیں بلکہ علم کے ساتھ خشیتِ الٰہی کا نہ ہونا ہے اور اصل خطرہ اختلافِ رائے نہیں بلکہ ضمیر کا مردہ ہو جانا ہے۔

''الکوثر'' ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ قلم اگر امانت دار ہو تو وہ فتنوں کے شور میں بھی حق کی آواز بن جاتا ہے اور فکر اگر روایت سے ہم رشتہ ہو جائے تو جدیدیت کے ہجوم میں بھی اپنی پہچان نہیں کھوتی۔ یہ شمارہ اس یقین کی تجدید ہے کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض نعرہ نہیں، ایک ذمہ دار طرزِ فکر ہے اور علم محض معلومات نہیں، خشیتِ الٰہی تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

یہاں قاری کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ان تحریروں کو محض پڑھ کر رکھ دے--- یہ مضامین اس سے سوال کرتے ہیں: تم کہاں کھڑے ہو؟

کیا تم نام کی روشنی پہ قناعت کر چکے ہو یا معنیٰ کی حرارت کے متلاشی ہو؟

کیا تم زمانے کے شور میں گم ہو گئے ہو یا روایت کی خموش مگر پائیدار آواز سننے کا حوصلہ رکھتے ہو؟

''الکوثر'' کا یہ شمارہ ایک آئینہ ہے--- جو ہر قاری کو اس کا اصل چہرہ دکھاتا ہے۔ جو اس آئینے میں خود کو پہچان لے، اس کے لیے یہ تحریریں محض مطالعہ نہیں رہتیں بلکہ عمل کی دعوت بن جاتی ہیں اور شاید یہی ''الکوثر'' کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ وہ قاری کو بند کتاب نہیں، کھلا ہوا سوال دے کر رخصت کرتا ہے--- ایسا سوال جس کا جواب زندگی کے ہر موڑ پہ دینا ہوتا ہے۔

اعتذار: گذشتہ شمارے میں حضرت سید شاہ بدیع الدین زندہ شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے شامل مضمون میں ان کے سلسلۂ نسب کے تعلق سے گفتگو کرتے ہو قلم کارنے دو اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہما کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے، حضرت کا سلسلۂ نسب سیدۃ النساء العالمین فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مربوط ہوتا ہے قارئین اسے درست فرمالیں۔

آپ کا اپنا
ملک الظفر سہسرامی



دعائے وقت افطار

ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ العُرُوْقُ وَثَبَتَ الأَجْرُ
إِنْ شَاءَ اللّٰهُ

ترجمہ: پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ اجر ثابت ہو گیا۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

جب سیاست، شائستگی سے عاری ہوجائے

جمہوریت محض اقتدار کی منتقلی کا ایک طریقۂ کار نہیں بلکہ ایک تہذیبی عہد کا نام ہے، ایک ایسا عہد جس میں طاقت کو اخلاق، اختیار کو ذمہ داری اور سیاست کو خدمت کے منصب پہ فائز کیا جاتا ہے مگر جب سیاست اپنی اصل روح سے کٹ کر محض عددی برتری، وقتی مفاد اور شخصی انا کے گرد گھومنے لگے تو پھر ایوانوں میں بیٹھے فیصلے عوامی اعتماد کی قبر پر کندہ ہونے لگتے ہیں۔ حالیہ غیر جمہوری طرزِ عمل نے اسی اندیشے کو تلخ حقیقت میں بدل دیا ہے کہ ہماری سیاست بتدریج اخلاقی قدروں سے عاری اور انسانی احترام سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔

آج سیاست کے نام پہ جو کچھ ہورہا ہے وہ نہ عوامی خدمت کی علامت ہے اور نہ جمہوری شائستگی کی مثال بلکہ یہ طاقت کے نشے میں چور اُس ذہنیت کی عکاسی ہے جو آئین کو محض ایک کاغذی دستاویز اور عوامی وقار کو قابلِ استعمال شے سمجھتی ہے۔ اختلافِ رائے کو جرم، مذہبی شناخت کو طنز اور شخصی آزادی کو تماشہ بنادینا دراصل اسی سیاسی انحطاط کی واضح علامت ہے، جس نے جمہوریت کو نعرہ تو دیا مگر اس کی روح سلب کرلی اور عوام کے حقِ انتخاب کو محض ایک رسمی کارروائی بنادیا، جس کے عہد میں ووٹ کی حرمت باقی رہی، نہ رائے کی آزادی، بس اقتدار کے ایوانوں میں مفاد کی گونج سنائی دیتی رہی، جمہور کے نام پر حکومت کی گئی مگر جمہور کی آواز یا تو دبائی گئی یا خرید لی گئی، آئین کی قسمیں کھائی گئیں اور آئین ہی کو طاقت کے قدموں تلے روند دیا گیا، جمہوری قدروں کا لبادہ اوڑھ کر آمریت کو تہذیبی جواز فراہم کیا گیا۔

حالیہ واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جب اقتدار خود احتسابی سے آزاد ہوجائے تو غیر جمہوری رویے معمول بن جاتے ہیں۔ عوام کے ووٹ سے حاصل ہونے والی طاقت جب عوام ہی کی عزت پامال کرنے لگے تو سوال صرف ایک واقعے کا نہیں رہتا بلکہ پورے سیاسی مزاج کا بن جاتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں سیاست، خدمت کی بجائے تسلط کا ہتھیار بن جاتی ہے اور جمہوریت، اکثریت کے نام پہ اقلیت کا وقار روندنے کا جواز فراہم کرنے لگتی ہے۔

کم نصیبی سے ہماری سیاست میں شائستگی، تہذیب اور اخلاق کو کمزوری سمجھ لیا گیا ہے جبکہ جارحیت، تمسخر اور تضحیک کو سیاسی مہارت کا نام دیا جارہا ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھ کر عوامی جذبات، مذہبی شعائر اور شخصی آزادیوں سے کھیلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاست اب اصولوں کی نہیں بلکہ مصلحتوں کی اسیر ہوچکی ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف جمہوری اقدار کی توہین ہے بلکہ اس سماجی معاہدے کی بھی نفی ہے جس پر ریاست اور شہریوں کے درمیان اعتماد قائم ہوتا ہے۔

یہ تمہید اسی احساسِ خطر کی آئینہ دار ہے کہ اگر سیاست اخلاقی حدود میں واپس نہ لائی گئی تو جمہوریت محض انتخابی رسم اور آئین محض اقتدار کی سند بن کر رہ جائے گا۔ وقت آچکا ہے کہ سیاست کو پھر سے جواب دہی، شائستگی اور انسانی احترام کے پیمانوں پہ پرکھا جائے کیونکہ جب سیاست انسانیت سے خالی ہوجائے تو اقتدار باقی رہتا ہے، ریاست نہیں اور جب اقتدار خدمت کی بجائے غلبہ بن جائے تو قانون محض حکم نامہ رہ جاتا ہے۔

جب سیاست سے اخلاق رخصت ہوجائے تو جمہوریت عددی

کھیل بن جاتی ہے اور انصاف محض ایک نعرہ، ایسی سیاست میں شہری رعایا بن جاتے ہیں اور ریاست محافظ کی جگہ حاکم کی ڈھال، جہاں انسان کو مرکز کی بجائے مہرہ سمجھا جائے وہاں ترقی کے منصوبے بھی بے روح اور فیصلے بھی بے رحم ہو جاتے ہیں بالآخر اقتدار کے ستون تو قائم رہتے ہیں مگر ریاست کا اعتماد، اس کی روح اور اس کا اخلاقی جواز زمیں بوس ہوجاتا ہے۔

حجاب کوئی موسمی روایت، ثقافتی علامت یا وقتی فیشن نہیں کہ زمانوں کے بدلنے کے ساتھ اپنی معنویت کھو بیٹھے بلکہ یہ عورت کے لیے عزت، عصمت اور خودداری کا وہ مضبوط حصار ہے جسے اسلام نے ایمان کی عملی صورت بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ محض جسم کی مہذب پردہ پوشی کا نام نہیں بلکہ روح کو تہذیب، نگاہ کو حیا اور شخصیت کو وقار عطا کرنے والا ایک مستقل شعور ہے۔ حجاب عورت کی دینی شناخت، اس کی شرافت اور اس کے اخلاقی وقار کا اعلان ہے، ایک ایسا اعلان جو خاموش رہ کر بھی بلند آواز میں ایمان کی گواہی دیتا ہے۔

اسلام نے حجاب کو لباس کے محدود دائرے میں محصور نہیں رکھا بلکہ اسے بندگی کے مقام پہ فائز کیا ہے۔ حجاب استعمال کرنے والی عورت جب تعلیم کے میدان میں قدم رکھتی ہے، جب پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھاتی ہے یا سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے تو وہ محض ایک شہری نہیں رہتی بلکہ ایک باخبر، باوقار اور باعمل مومنہ کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا ہر قدم، ہر حرکت اور ہر انتخاب اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب، سرورِ کائنات حضرت محمد عربی ﷺ کی تعلیمات کی پاسداری میں عبادت کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حجاب محض کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ ایمان، حیا اور خودداری کا عملی اظہار ہے، ایسا اظہار جس کا احترام ہر حال میں لازم اور واجب ہے۔

افسوس کہ عصرِ حاضر میں بعض بااختیار حلقے حجاب کو دقیانوسیت، قدامت یا سماجی رکاوٹ کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حجاب عورت کو معاشرے سے الگ نہیں کرتا بلکہ اسے اخلاقی استحکام، باطنی قوت اور خود اعتمادی کے ساتھ سماج میں موجود رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہ عورت کو کمزور نہیں بناتا بلکہ اسے اس کی شناخت، اس کے حق اور اس کے وقار کا شعور دیتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو بہار کے وزیرِ اعلیٰ کی جانب سے ایک مسلم خاتون کے حجاب کو سرکاری تقریب میں چھیڑنا نہایت افسوس ناک، شرمناک اور قابلِ مذمت عمل ہے۔ یہ محض ایک شخصی لغزش یا وقتی لاپروائی نہیں بلکہ آئینی اقدار، جمہوری شائستگی اور سماجی اخلاقیات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ایک عورت کی عزت، اس کی مذہبی آزادی اور اس کے شخصی وقار پر اس نوعیت کا رویہ کسی بھی مہذب معاشرے میں ناقابلِ قبول ہے۔ جب اقتدار کے اعلیٰ منصب پر فائز شخص سے ایسا عمل صادر ہو تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے کیونکہ اقتدار محض اختیار کا نام نہیں بلکہ ذمہ داری، ضبط اور اخلاقی مثال قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

جمہوری نظام کی روح یہی ہے کہ طاقت ور بھی قانون اور اخلاق کے دائرے میں جواب دہ ہو۔ اگر اہلِ اقتدار کے اعمال کا احتساب نہ ہو تو جمہوریت محض ایک کھوکھلا نعرہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کسی خاتون کے مذہبی شعار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ دراصل پورے سماج کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے مترادف ہے۔ یہ سوال صرف ایک واقعے کا نہیں بلکہ اس ذہنیت کا ہے جو مذہبی آزادی کو محض ایک آئینی عبارت سمجھتی ہے، عملی حقیقت نہیں۔

حجاب پہ حملہ دراصل عورت کی خودمختاری پہ حملہ ہے، اس کے انتخاب کی توہین ہے اور اس کے مذہبی شعور کو مجروح کرنے کی کوشش ہے۔ یہ عمل اس ہندستانی تہذیب کے بھی منافی ہے جو صدیوں سے مذہبی رواداری، شخصی احترام اور ثقافتی ہم آہنگی کی علمبردار رہی ہے۔ اگر آج حجاب کو نشانہ بنایا جائے گا تو کل کسی اور مذہبی علامت کی باری آئے گی اور یوں یہ سلسلہ پورے معاشرے کو عدمِ تحفظ اور بے یقینی کی فضا میں ڈھکیل دے گا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حجاب کو محض ایک مذہبی مسئلہ سمجھ کر

نظر انداز نہ کریں بلکہ اسے انسانی وقار، آئینی آزادی اور اجتماعی اخلاقیات کے زاویے سے دیکھیں۔ ایک مہذب معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں عورت کے لباس سے نہیں بلکہ اس کے کردار، اس کے شعور اور اس کے انتخاب کا احترام کیا جاتا ہے۔ حجاب استعمال کرنے والی خاتون کسی پر بوجھ نہیں بلکہ معاشرے کے اخلاقی استحکام کی ضامن ہوتی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حجاب عورت کی خاموش زبان ہے، جو شور کے بغیر بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ یہ ایمان کی وہ صدا ہے جو نعرہ نہیں بنتی مگر دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اگر یہ صدا دبانے کی کوشش کی گئی تو یہ محض ایک طبقے کی دل آزاری نہیں ہوگی بلکہ پورے سماج کے اخلاقی زوال کی علامت بن جائے گی۔ حجاب کا احترام دراصل عورت کے وقار، مذہبی آزادی اور جمہوری اقدار کے احترام کا نام ہے اور یہی کسی بھی مہذب ریاست کی اصل پہچان ہے۔

خاموشی کا سانحہ: جب ضمیر بولنا چھوڑ دے

بعض سانحات ایسے ہوتے ہیں جن کی شدت کا اندازہ صرف وقوعِ حادثہ سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس خاموشی سے ہوتا ہے جو ان کے بعد فضا میں پھیل جاتی ہے۔ حالیہ واقعہ بھی ایسا ہی ایک لمحۂ امتحان ہے جہاں اصل المیہ خود واقعہ نہیں بلکہ وہ گہری، بوجھل اور خوف ناک خاموشی ہے جو قومی و مذہبی صحافت، ملی و اسلامی اداروں اور سیاسی قیادت کے گرد حصار باندھے کھڑی ہے۔ نہ احتجاج کی کوئی صدا بلند ہوئی، نہ اجتماعی ضمیر نے عملی صورت اختیار کی۔ یہ سکوت محض خاموشی نہیں بلکہ ایسا خلا ہے جس میں سوال دفن اور جواب معطل ہو جاتے ہیں اور جب سوال مرجائیں تو انصاف بھی سانس لینا چھوڑ دیتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب صحافت نے جرأتِ اظہار، بے خوفی اور اصول پسندی کو اپنا شعار بنایا تو وہ محض خبر رساں ادارہ نہیں رہی بلکہ مظلوموں اور ستم رسیدہ افراد کی زبان اور اقتدار کے ایوانوں کے لیے آئینۂ احتساب بن گئی۔ اسی قلم نے تخت و تاج کو لرزایا، اسی صفحے نے جبر کے ایوانوں میں اضطراب پیدا کیا اور اسی خبر نے کمزوروں کے دل میں امید کی شمع روشن کی۔ وہی صحافت سماج کی خاموش چیخوں کو لفظ عطا کرتی رہی، اندھیری راتوں میں سچ کی مشعل بن کر جلتی رہی اور خوف کے موسم میں بھی حق کی حرارت کو سرد نہ ہونے دیا۔ اس کے صفحات محض روشنائی سے نہیں بھرے ہوتے تھے بلکہ ان میں مظلوموں کے آنسو، محروموں کی آہیں اور انصاف کی تڑپ جذب ہوتی تھی۔ وہ سوال اٹھاتی تھی تو سوال محض استفسار نہیں ہوتے تھے بلکہ ضمیر کی دستک بن کر ایوانوں کے در و دیوار ہلا دیتے تھے۔ اقتدار کے لیے وہ غیر مرئی عدالت تھی جہاں منصب، لقب اور طاقت سب برابر ہو جاتے تھے اور صرف سچ کو بولنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اسی بے باک صحافت نے بتایا کہ خبر کا اصل حسن سنسنی میں نہیں بلکہ صداقت میں پوشیدہ ہے اور قلم کی اصل طاقت لرزہ خیز خاموشیوں کو توڑنے میں ہے۔

یہی وہ روایت تھی جس میں لکھنا محض پیشہ نہیں بلکہ امانت تھا اور بولنا محض حق نہیں بلکہ فرض سمجھا جاتا تھا۔ جب یہ صحافت جاگتی رہی، سماج نے سر اٹھا کر جینا سیکھا اور جب یہ سو گئی، ظلم نے اپنے قدم مضبوط کر لیے مگر اصل المیہ یہ نہیں کہ صحافت پر دباؤ ہے بلکہ یہ ہے کہ صحافت نے یہ دباؤ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ مصلحت اب وقتی مجبوری نہیں رہی بلکہ ادارہ جاتی پالیسی بن چکی ہے۔ وہ صحافت جو کبھی اقتدار کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہوتی تھی آج اسی اقتدار کے گرد حفاظتی حصار بن گئی ہے۔ خبر اب آئینہ نہیں رہی بلکہ ایک ایسا فلٹر بن چکی ہے جو سچ کو کاٹ چھانٹ کر اس حد تک کمزور کر دیتا ہے کہ وہ طاقتور کے لیے بے ضرر اور مظلوم کے لیے بے معنیٰ ہو جائے۔

ایڈیٹوریل کمروں میں آج سچ کی نہیں، بقا کی گفتگو ہوتی ہے۔ یہ سوال زیرِ بحث نہیں آتا کہ کیا کہنا ضروری ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کہہ کر حفاظتی حصار قائم کیا جا سکتا ہے۔ صحافی اب حقائق کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ سرخ لکیروں کی پہرے داری کرتے ہیں۔ جس خبر میں سوال ہو وہ خطرہ بن جاتی ہے، جس تجزیے میں جرأت ہو وہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں صحافت، جرأتِ اظہار سے دستبردار ہو کر خود سنسر شپ کی سب سے بدترین مثال بن چکی ہے۔

یہ مصلحت اندیشی محض خاموشی تک محدود نہیں بلکہ ایک منظم خاموشی ہے، ایسی خاموشی جو چُن چُن کر بولتی ہے اور بولتے وقت بھی آدھا سچ پیش کرتی ہے۔ظلم کو واقعہ کہا جاتا ہے، ناانصافی کو تنازع اور جبر کو انتظامی کوتاہی۔ الفاظ کی یہ درجہ بندی دراصل سچ کو بے جان کرنے کا عمل ہے تاکہ کوئی سوال نہ اٹھے، کوئی ذمہ داری طے نہ ہو اور کوئی احتساب نہ ہو۔

صحافت نے اپنے سب سے مقدس رشتے، عوام کے اعتماد سے غداری کی ہے۔ وہ قلم جو کبھی کمزور و ناتواں کی آخری امید ہوتا تھا آج طاقتور کے مفاد کی تحریری ضمانت بن گیا ہے۔ اشتہارات، سرکاری رسائی، مراعات اور قربت نے صحافت کو اس مقام پہ لا کھڑا کیا ہے جہاں ضمیر ایک قابلِ گفت وشنید شے بن چکا ہے۔ جو ادارے انکار کی ہمت رکھتے ہیں وہ یا تو حاشیے پہ ڈھکیل دیے جاتے ہیں یا پھر ''غیر متعلق'' قرار دے دیے جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس مصلحت زدہ صحافت نے سماج کو بھی خاموشی کی تربیت دے دی ہے۔عوام کو بتایا جا رہا ہے کہ ''سب ٹھیک ہے'' سوال اٹھانا ملک دشمنی ہے اور سچ بولنا انتشار۔ اس طرح صحافت نہ صرف خود خاموش ہوگئی ہے بلکہ اس نے سماج کو بھی خاموش رہنے کا ہنر سکھا دیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں صحافت محض ناکام نہیں ہوتی بلکہ شریکِ جرم بن جاتی ہے۔

یہ کہنا بھی اب مبالغہ نہیں رہا کہ بہت سی صورتوں میں صحافت اقتدار کا چوتھا ستون نہیں بلکہ اس کے سائے میں کھڑا ایک کمزور ستون بن چکی ہے، ایسا ستون جو بوجھ اٹھانے کی بجائے بوجھ کو جائز ٹھہرانے میں مصروف ہے۔ جب صحافت طاقتور سے سوال کرنے کی جگہ اس کی وضاحتیں عوام تک پہنچانے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ خبر مر چکی ہے اور بیانیہ زندہ ہے۔

یہ وہ زوال ہے جہاں مصلحت احتیاط کا نام نہیں رہتی بلکہ بزدلی کی مہذب شکل بن جاتی ہے اور خاموشی حکمت نہیں رہتی بلکہ ظلم کے ساتھ ایک غیر اعلانیہ اتحاد۔ ایسی صحافت نہ معاشرے کی رہنمائی کر سکتی ہے اور نہ تاریخ کے سامنے سرخرو ہو سکتی ہے۔ تاریخ اسے بھی اسی کٹہرے میں کھڑا کرے گی جہاں وہ ان طاقتوں کے ساتھ کھڑی تھی جن سے اس نے سوال کرنے سے انکار کیا تھا۔

اس اخلاقی انحطاط کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ ظلم اب اچانک وارد نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ معمول بن جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ ایک لغزش معلوم ہوتا ہے پھر ایک استثنا قرار پاتا ہے اور آخر کار ایک روایت بن جاتا ہے۔ جب ناانصافی پر سوال نہ اٹھے اور جبر کے خلاف قلم خاموش ہو جائے تو ظلم کو جواز مل جاتا ہے اور سماج رفتہ رفتہ اس کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔ ضمیر پہلے چونکتا ہے پھر سمجھوتہ کرتا ہے اور بالآخر خاموش رہنے کو عقل مندی کا نام دے دیتا ہے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ناانصافی کو حادثہ نہیں بلکہ انتظامی ضرورت کہا جانے لگتا ہے جہاں جبر کو نظم وضبط اور طاقت کے استعمال کو ریاستی مصلحت کا نام دیا جاتا ہے۔ ظلم کی زبان بدل دی جاتی ہے تاکہ اس کا چہرہ کم ہولناک دکھائی دے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب الفاظ کی اخلاقی قوت مر جاتی ہے تو اعمال کی درندگی بڑھ جاتی ہے۔ اس مقام پر سماج ظلم کے خلاف کھڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ چلنا سیکھ لیتا ہے اور یہی سب سے بڑا المیہ ہے۔

اسی لمحے خاموشی جرم میں بدل جاتی ہے۔ یہ محض بولنے سے انکار نہیں بلکہ ظلم کے تسلسل کو ممکن بنانے والا رویہ بن جاتی ہے۔ جو زبان بول سکتی تھی مگر بول نہ سکی، جو قلم لکھ سکتا تھا مگر نہ لکھ سکا وہ سب جبر کے شریکِ کار ٹھہرتے ہیں۔ تاریخ ایسے لمحوں میں کرداروں کو ان کے عہدوں یا دعووں سے نہیں بلکہ ان کی خاموشی سے پہچانتی ہے۔

تاریخ کے اوراق پر یہ خاموشی کسی حاشیے کی صورت درج نہیں ہوتی بلکہ بطور گواہی ثبت کر لی جاتی ہے، ایسی گواہی جس سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ وقت گذر جاتا ہے، حکومتیں بدل جاتی ہیں مگر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ جب سچ کو کچلا جا رہا تھا تو ضمیر کہاں تھا؟ یہی وہ سوال ہے جو آنے والی نسلیں پوچھتی ہیں اور جس کا کوئی جواب تاویل، مصلحت یا خاموشی فراہم نہیں کر سکتی۔

لہٰذا ظلم کا عادی ہوجانا دراصل ظلم قبول کر لینے کے مترادف ہے اور خاموشی اختیار کرنا ناانصافی کے ساتھ کھڑا ہوجانا ہے۔ جو سماج اس مقام تک پہنچ جائے وہ صرف مظلوموں کو ہی نہیں کھوتا بلکہ اپنی اخلاقی بنیادیں بھی دفن کر دیتا ہے اور پھر تاریخ ایسے معاشروں کو صرف ایک عبرت کے عنوان سے یاد رکھتی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب صحافت اپنے ضمیر کی روشنی بجھا دے اور قیادت اجتماعی شعور کی ترجمانی سے شعوری طور پہ دستبردار ہوجائے تو سماج کا توازن سب سے پہلے ان کندھوں پہ ٹوٹتا ہے جو پہلے ہی ناتواں ہوتے ہیں۔ طاقت کے مراکز میں بیٹھے لوگوں کو اس زلزلے کی شدت دیر سے محسوس ہوتی ہے مگر اس کے ابتدائی جھٹکے ہمیشہ ان وجودوں کو لگتے ہیں جن کے پاس نہ رسائی ہوتی ہے، نہ تحفظ اور نہ ہی آواز۔

عورت، اقلیت اور مذہبی شناخت محض سماجی خانوں میں درج اصطلاحات نہیں بلکہ وہ زندہ پیمانے ہیں جن پر کسی معاشرے کی اخلاقی صحت، انسانی وقار اور جمہوری صداقت پرکھی جاتی ہے۔ جب ان طبقات کی عزت محفوظ نہ رہے، ان کے انتخاب پر سوال اٹھائے جائیں اور ان کی شناخت کو تضحیک یا پھر اسے شک کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ معاشرہ اپنا اخلاقی ستون کھو رہا ہے۔ ایسے میں ظلم کسی ایک گروہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ رفتہ رفتہ پورے سماج کے اعصاب میں سرایت کر جاتا ہے۔

جب یہ پیمانے لرزنے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ خاموشی اب محض خاموشی نہیں رہی۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں سکوت بے حسی میں ڈھل جاتا ہے اور بے حسی ظلم کی ہم نوا بن جاتی ہے۔ اس خاموشی میں وہ رضامندی پوشیدہ ہوتی ہے جو جبر کو تقویت دیتی ہے اور طاقت کو بے لگام کر دیتی ہے۔ یہاں نہ بولنا محض ایک انتخاب نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا موقف بن جاتا ہے جو مظلوم کو تنہا اور ظالم کو مضبوط کر دیتا ہے۔

یہی وہ لمحہ ہے جہاں سماج اپنی اخلاقی سمت کھو دیتا ہے۔ جب صحافت سوال اٹھانے سے انکار کرے اور قیادت جواب دینے سے گریز کرے تو عورت کا وقار، اقلیت کا تحفظ اور مذہبی آزادی سب سے پہلے نشانہ بنتے ہیں۔ پھر یہ زنجیر رکتی نہیں جو آج کمزور ہے وہ کل مزید کمزور ہوجاتا ہے اور جو آج خاموش ہے وہ کل پچھتانے کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ان پیمانوں کی لرزش کو معمول سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ یہی لرزش اس بڑے زلزلے کا پیش خیمہ ہوتی ہے جو بالآخر پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ خاموشی اگر بروقت نہ ٹوٹی تو وہ تاریخ کے کٹہرے میں ہمارے خلاف سب سے مضبوط گواہ بن جاتی ہے۔

بلاشبہ یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ صحافت جب اپنی اخلاقی بصیرت کھو بیٹھے اور قیادت اجتماعی احساسات کی نمائندگی سے کنارہ کش ہوجائے تو شکست و ریخت کا پہلا زخم انہی خموش اور ناتواں کندھوں پر آ لگتا ہے جو پہلے ہی صبر اور استقامت کے ساتھ حالات سے سمجھوتہ کیے رہتے ہیں۔ عورت، اقلیت اور مذہبی شناخت محض سماجی زمرے نہیں بلکہ اجتماعی انصاف کے وہ پیمانے ہیں جن پر کسی معاشرے کی اخلاقی صحت پرکھی جاتی ہے۔ جب یہ پیمانے لرزنے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ خاموشی محض خاموشی نہیں رہتی بلکہ ظلم کی ہم نوا بن جاتی ہے۔

ایسے عہد میں غیر جانب داری کا دعویٰ دراصل اخلاقی فرار کی ایک مہذب صورت بن جاتا ہے۔

وہ صحافت جو سوال کرنے کی جرأت کھو دے اور وہ قیادت جو صداقت کے اظہار سے شعوری طور پر گریز کرے، دونوں مل کر ایک ایسا خطرناک خلا پیدا کرتی ہیں جس میں صرف طاقتور کی آواز گونجتی ہے اور کمزور کی فریاد صدا بہ صحرا بن جاتی ہے۔ یہ خلا محض معلومات کی کمی نہیں بلکہ اخلاقی سمت کے فقدان کا نام ہے جہاں سچ بولنے والا تنہا اور جھوٹ بولنے والا بااختیار ہوجاتا ہے۔

ایسے ماحول میں سوال جرم بن جاتے ہیں اور وضاحتیں غداری سمجھی جانے لگتی ہیں۔ صحافت کا کام احتساب ہوتا ہے مگر جب وہ خود احتساب سے دستبردار ہوجائے تو اقتدار کے ایوان بے خوف ہوجاتے

ہیں۔ قیادت جو عوامی اعتماد کی امین ہوتی ہے جب صداقت کی بجائے خاموشی کو اپنی حکمتِ عملی بنا لے تو وہ اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار کر لیتی ہے۔ یوں طاقت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور انصاف کا پلڑ کمزوروں کے قدموں تلے ٹوٹنے لگتا ہے۔

یہاں خاموشی حکمت نہیں رہتی بلکہ ناانصافی کے ساتھ ایک غیر تحریری معاہدہ بن جاتی ہے، ایسا معاہدہ جس پہ دستخط نہیں ہوتے مگر جس کے نتائج پوری شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس معاہدے کی رو سے ظلم بولتا ہے اور ضمیر خاموش رہتا ہے، طاقت آگے بڑھتی ہے اور حق پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جو آوازیں سوال کر سکتی تھیں وہ یا تو دبا دی جاتی ہیں یا خود ہی تھک کر خاموش ہو جاتی ہیں۔

اس غیر تحریری معاہدے کی قیمت ہمیشہ وہی طبقات ادا کرتے ہیں جن کے پاس آواز کم اور زخم زیادہ ہوتے ہیں۔ عورت کی عزت، اقلیت کی شناخت اور کمزور کی جان سب سے پہلے اسی خاموشی کی نذر ہوتی ہے۔ طاقتور کو تحفظ ملتا ہے جبکہ کمزور کو صبر کا درس دے کر خاموش کرا دیا جاتا ہے۔ یوں ظلم انفرادی سانحہ نہیں رہتا بلکہ ایک اجتماعی حقیقت بن جاتا ہے۔

سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس خموشی کو توازن، اس سمجھوتے کو تدبر اور اس پسپائی کو سیاسی دانش مندی کہا جانے لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں سوال کرنے کی جرأت ختم ہو جائے اور صداقت کے اظہار کا حوصلہ ٹوٹ جائے وہاں نہ جمہوریت باقی رہتی ہے اور نہ ہی انسانیت۔ ایسے معاشروں میں تاریخ آگے نہیں بڑھتی بلکہ خود کو دہراتی ہے اور ہر بار قیمت وہی ادا کرتے ہیں جو پہلے ہی محرومی کے دائرے میں کھڑے ہوتے ہیں۔

تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ خاموشی محض وقتی مصلحت نہیں بلکہ مستقبل کی ناانصافیوں کا پیش خیمہ ہے۔ جب اجتماعی ضمیر بولنا چھوڑ دے تو تاریخ اپنے حاشیوں میں صداقت کی وہ زبان محفوظ کر لیتی ہے جس کے اظہار سے آج ڈرایا جا رہا ہے اور کل یہی حاشیے ہماری بے حسی کے خلاف فردِ جرم بن جاتے ہیں۔ وقت گذر جاتا ہے، اقتدار بدل جاتا ہے مگر تاریخ کے سوال باقی رہتے ہیں اور ان سوالوں کے جواب نہ آج ہوتے ہیں نہ کل۔

یہ حادثہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سیاسی دعوؤں کی صداقت اور نعروں کا کھوکھلا پن یکساں طور پر نمایاں ہو گیا ہے۔ خاص طور پہ جنتا دل یونائیٹڈ کے وہ رہنما جو موقع بہ موقع ملت اور قوم کی دہائی دیتے نہیں تھکتے اس موقع پہ جس طویل اور معنی خیز خاموشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ نہ صرف ناقابلِ فہم ہے بلکہ کئی سنجیدہ سوالات بھی جنم دیتا ہے۔ جن زبانوں کو عوامی جلسوں میں حق، انصاف اور ہم آہنگی کے دعوؤں نے رواں رکھا تھا وہ اس حادثے کے بعد اچانک بے زبان کیوں ہو گئیں؟

یہ خاموشی محض اتفاق نہیں لگتی بلکہ ایک سوچا سمجھا طرزِ عمل محسوس ہوتی ہے، ایسا طرزِ عمل جس میں ضمیر کی بجائے مصلحت اور اخلاق کی جگہ سیاسی بقا کو ترجیح دیا گیا ہے۔ جو رہنما خود کو ملت کا خیر خواہ، اقلیتوں کا محافظ اور قومی یکجہتی کا علمبردار کہلواتے ہیں اگر وہ ایسے نازک لمحے میں لب کشائی سے گریز کریں تو یہ سوال ناگزیر ہو جاتا ہے کہ کہیں قوم کی ہمدردی کے پس پردہ اپنی سیاسی زندگی کے تحفظ کی فکر تو کارفرما نہیں؟

سیاست اگر واقعی خدمت کا نام ہے تو اس کا امتحان نعروں کے موسم میں نہیں بلکہ ایسے ہی مشکل اور حساس مواقع پہ ہوتا ہے۔ جب ایک طبقے کے وقار کو ٹھیس پہنچے، جب مذہبی آزادی پہ سوال اٹھے اور جب جمہوری شائستگی مجروح ہو تو قیادت کی خاموشی محض غیر جانب داری نہیں رہتی بلکہ عملی طور پر ظلم کے ساتھ کھڑے ہونے کے مترادف ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ملت کے نام پہ کی گئی تمام تقریریں اور وعدے محض سیاسی سرمایہ کاری معلوم ہونے لگتے ہیں جن کا مقصد ہمدردی سمیٹنا ہوتا ہے، ذمہ داری نبھانا نہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اقتدار کے قریب رہنے کی خواہش اکثر سچ بولنے کی جرأت دبا دیتی ہے۔ جو رہنما کل تک قوم کے دکھ درد کو اپنی سیاست کا مرکز بتاتے تھے آج وہی رہنما اپنا سیاسی مستقبل خطرے میں ڈالنے سے خوف زدہ نظر آتے ہیں۔ اس خوف نے ان

کے لب سی دیے ہیں اور ان کے ضمیر کو مصلحت کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ حکومت کے خلاف کیوں نہیں بول رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ وہ حق و انصاف کے حق میں کیوں نہیں کھڑے ہو پا رہے۔ یہ خاموشی اس لیے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ یہ اُن لوگوں سے صادر ہو رہی ہے جن سے ملت نے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ جنہیں اپنا سمجھا گیا، جن پر اعتماد کیا گیا اگر وہی مشکل گھڑی میں لاتعلقی اختیار کر لیں تو یہ صرف سیاسی بے حسی نہیں بلکہ ایک اخلاقی شکست بھی ہے۔ ایسی خاموشی اعتماد کو توڑتی ہے اور سیاست کو محض مفاد کا کھیل ثابت کر دیتی ہے۔

کل آنے والے وقت میں تاریخ ان رہنماؤں کو ان کی تقریروں سے نہیں بلکہ ان کی خاموشیوں سے پہچانے گی۔ وہ پوچھے گی کہ جب وقار پامال ہو رہا تھا، جب آئینی اقدار مجروح ہو رہے تھے اور جب ملت کو آواز کی ضرورت تھی تو یہ رہنما کہاں تھے؟ اگر آج اس سوال کا جواب مصلحت ہے تو کل تاریخ کے کٹہرے میں یہ جواب کافی نہیں ہوگا۔ وہاں نہ سیاسی مجبوری چلے گی، نہ اقتدار کی قربت اور نہ ہی خاموشی کا کوئی جواز باقی رہے گا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حجاب کے احترام کو محض ایک مذہبی مسئلہ نہ سمجھیں بلکہ انسانی وقار، آئینی آزادی اور جمہوری اخلاقیات کے وسیع اور ہمہ گیر تناظر میں دیکھیں۔ یہ معاملہ کسی ایک طبقے کے جذبات یا کسی ایک قوم کی مذہبی شناخت تک محدود نہیں بلکہ اس اصول سے جڑا ہوا ہے کہ ریاست اور سماج فرد کے انتخاب، اس کی عزت اور اس کی روحانی وابستگی کا کس حد تک احترام کرتے ہیں۔ جہاں لباس کے انتخاب پہ تضحیک کی اجازت دی جائے وہاں ضمیر کی آزادی زیادہ دیر سلامت نہیں رہتی۔

سچ کے ساتھ کھڑا ہونا، اصولوں پر ڈٹ جانا اور مظلوم کی آواز بننا محض اخلاقی نعرے نہیں بلکہ جمہوریت کی بقا کی عملی شرائط ہیں۔ یہ وہ قدریں ہیں جو آئین کو روح بخشتی ہیں، قانون کو انسان دوست بناتی ہیں اور اقتدار کو جواب دہی کے دائرے میں رکھتی ہیں۔ جب معاشرہ ان اقدار سے دستبردار ہو جائے تو جمہوریت محض انتخابی مشق رہ جاتی ہے اور انصاف محض ایک بے معنیٰ لفظ۔

اگر آج ہم خاموش رہے تو کل تاریخ ہمیں بھی اسی خاموشی کے کٹہرے میں کھڑا کرے گی اور اس کٹہرے میں کوئی تاویل، کوئی مصلحت اور کوئی عذر کارگر نہیں ہوگا۔ وہاں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ہم کس مصلحت کے اسیر تھے بلکہ یہ سوال ہوگا کہ حق واضح ہونے کے باوجود ہم نے خاموشی کیوں اختیار کی۔ وہاں عذرِ زمانہ قابلِ قبول نہ ہوگا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ طاقت کے مقابلے میں ہم نے سچ کا ساتھ دیا یا سہولت کا۔ وہاں حالات کی سختی کا حوالہ نہیں چلے گا، صرف یہ پرکھا جائے گا کہ خوف کے لمحوں میں ہمارا ضمیر کس کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں یہ نہیں سنا جائے گا کہ مجبوریاں بہت تھیں، یہ پوچھا جائے گا کہ ایمان کی قیمت پر کی گئی مصلحت ہمیں کیوں عزیز تھی۔ وہاں صرف نیتوں کا نہیں، اعمال کا بھی حساب ہوگا اور خاموشی بھی ایک عمل کے طور پر لکھی جا چکی ہوگی۔ وہاں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ہم کن مصلحتوں کے سبب خموش تھے بلکہ یہ سوال کیا جائے گا کہ جب وقار پامال ہو رہا تھا، جب آزادی مجروح کی جا رہی تھی اور جب انصاف کا ترازو جھک رہا تھا تو ہم کہاں کھڑے تھے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہر فرد، ہر ادارہ اور ہر قلم کار کو اپنا موقف طے کرنا ہوتا ہے۔ یا تو وہ سچ کے ساتھ کھڑا ہو کر تاریخ کا روشن باب بن جائے یا پھر خاموشی اختیار کر کے تاریخ کے حاشیوں میں بے حسی کی مثال قرار پائے۔ حجاب کے احترام کا دفاع دراصل انسان کے احترام کا دفاع ہے اور انسان کے وقار کا تحفظ ہی کسی بھی مہذب معاشرے کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

اگر ہم نے آج یہ پہچان بچا لی تو آنے والی نسلیں ہمیں شکر گزاری کی نگاہ سے یاد کریں گی اور اگر ہم نے مصلحت کو اصول پہ ترجیح دیا تو تاریخ ہمارے نام کے ساتھ ایک خاموش سوال چھوڑ دے گی، ایسا سوال جو وقت گذرنے کے باوجود جواب مانگتا رہے گا۔

□□□□

ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی
faizanzeyai.ssm@gmail.com

جب تاریخ سوال بن جائے اور قیادت خاموش رہے

تاریخ جب کروٹ لیتی ہے تو صرف نقشے نہیں بدلتی، ضمیروں کا امتحان بھی لیتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کون وقت کے شور میں سچ کی آواز پہچان پاتا ہے اور کون مصلحت کی آڑ میں خموشی کو حکمت کا نام دیتا ہے۔ ایسے لمحوں میں قوموں کے اصل چہرے بے نقاب ہوتے ہیں، کہیں جرأت تاریخ بن جاتی ہے اور کہیں خوف، دائمی ندامت۔

یہی وہ ساعتیں ہوتی ہیں جب ایوانوں کی خموشی بھی فیصلے میں بدل جاتی ہے اور ایک ایک لمحہ آنے والی نسلوں کا مقدر لکھ دیتا ہے۔

عالمی منظرنامہ آج ایسے موڑ پہ کھڑا ہے جہاں طاقت کی زبان سب سے بلند اور حق کی صدا سب سے کمزور ہو چکی ہے۔ یہاں انصاف کو مفاد کے ترازو میں تولا جاتا ہے اور انسان کی قیمت اس کے جغرافیے سے طے ہوتی ہے۔

اصول معاہدوں کے حاشیوں میں دب گئے ہیں اور مظلوم کی آہ سفارتی بیانات میں گم ہو چکی ہے۔ ایسے عالم میں خموشی غیر جانب داری نہیں رہتی بلکہ ظلم کی سب سے مہذب تائید بن جاتی ہے۔

ایوانِ اقتدار میں بیٹھے ہوئے حکمران مسکراتے ہیں، معاہدے پہ دستخط ہوتے ہیں، کیمرے چمکتے ہیں--مگر انہی لمحوں میں کہیں فلسطین کا بچہ ملبے تلے سسک رہا ہوتا ہے، کہیں کشمیر کی وادی آنسوؤں سے تر ہوتی ہے اور کہیں یمن کی ماؤں کی دعائیں آسمان کی دہلیز پہ ٹھٹھک جاتی ہیں۔

انسانیت کراہتی ہے مگر عالمی کانفرنسوں میں صرف قراردادوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ لاشیں گنتی میں بدل جاتی ہیں اور خون کے دھبے رپورٹوں کے حاشیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔

دنیا آگ میں جلتی ہے اور ضمیر ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں اخلاقیات پہ لمبے لمبے خطبے دیتا ہے۔ یہ وہ لمحے ہیں جہاں انسان مرنے سے پہلے بے معنیٰ بنا دیا جاتا ہے اور ظلم، قانون کی مہر لگا کر قابلِ قبول سچ قرار پا جاتا ہے۔

یہ محض عالمی سیاست کا بحران نہیں یہ انسانیت کے زوال کی داستان ہے اور اس داستان کا سب سے دردناک باب وہ ہے جہاں مسلم دنیا کے حکمراں جنہیں تاریخ نے عدل، جرأت اور قیادت کی امانت سونپی تھی آج خموش تماشائی بنے کھڑے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ امت کے ذمہ دار کہاں کھڑے ہیں؟

اسی سوال کی بازگشت میں یہ تحریر عالمی منظرنامے سے پردے اٹھاتی ہے اور مسلم حکمرانوں کی اس غفلت کا تجزیہ پیش کرتی ہے جو صرف سیاسی نہیں، فکری اور اخلاقی بھی ہے۔

عالمی منظرنامہ آج ایک ایسی کروٹ لے چکا ہے جہاں طاقت، مفاد اور فریب کی مثلث نے اخلاق، انصاف اور انسانی قدروں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

ریاستیں اب اصولوں سے نہیں، فائدے کے حساب سے پہچانی جاتی ہیں اور ضمیر کو سفارتی لغت میں غیر ضروری شی سمجھ لیا گیا ہے۔

سچ کو اس کی افادیت کے پیمانے پہ پرکھا جاتا ہے اور انصاف وہی معتبر ٹھہرتا ہے جو طاقت کے مفاد سے ٹکرا نہ جائے۔

ایسے ماحول میں انسان محض ایک عدد بن کر رہ جاتا ہے، کبھی ہلاکتوں کی فہرست میں، کبھی بے گھر افراد کی رپورٹ میں۔ اس کا نام خبر کی سرخی نہیں بنتا، اس کی چیخ اعداد و شمار کے شور میں دب جاتی ہے۔

وہ جیتے جی مسئلہ کہلاتا ہے اور مرنے کے بعد محض ایک حوالہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یوں انسان کی حرمت فائلوں کے بوجھ تلے دفن ہو جاتی ہے اور ضمیر شماریات کی زبان سیکھ لیتا ہے اور پھر اخلاق کی جگہ حکمتِ عملی اور عدل کی جگہ مصلحت تخت نشین ہو جاتی ہے۔

عالمی سیاست اب اصولوں کی نہیں، مفادات کی زبان بولتی ہے یہاں معاہدے عارضی، وعدے بے وزن اور انسانی جانیں سفارتی اصطلاحات کی نذر ہو چکی ہیں۔ اس بدلتے ہوئے منظر میں سب سے زیادہ الم ناک پہلو یہ ہے کہ امتِ مسلمہ جو کبھی تاریخ عالم کی اخلاقی رہنما تھی آج خود عالمی بساط پہ محض تماشائی بن کر رہ گئی ہے اور اس تماشے کی سب سے بڑی قیمت مظلوم مسلم عوام ادا کر رہے ہیں۔

آج کی دنیا میں طاقت کا مرکز اسلحہ، معیشت اور میڈیا کے گٹھ جوڑ سے متعین ہوتا ہے۔ عالمی ادارے جو انصاف کے ضامن سمجھے جاتے تھے اب طاقتور ریاستوں کے مفادات کے ترجمان بن چکے ہیں۔ فلسطین، کشمیر، شام، یمن اور میانمار جیسے المیے چیخ چیخ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا انسانی حقوق محض کمزور اقوام کے لیے ایک خوش نما فریب ہیں؟

اس تناظر میں مسلم دنیا کی خاموشی محض سفارتی مجبوری نہیں بلکہ ایک فکری اور اخلاقی انحطاط کی علامت بن چکی ہے۔

مسلم حکمرانوں کی اکثریت آج اقتدار کے تحفظ، ذاتی سلامتی اور وقتی سیاسی مصلحتوں میں اس حد تک الجھ چکی ہے کہ انہیں نہ امت کی اجتماعی نبض کا احساس ہے، نہ تاریخ کے بے رحم سوالات کا خوف۔ وہ ایوانوں میں بیٹھ کر عالمی بیانیے کی تائید تو کرتے ہیں مگر امت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی جرأت ان میں باقی نہیں رہی۔ یہ غفلت محض سیاسی نہیں، فکری بھی ہے۔

قرآن نے جنہیں ''قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ'' بننے کا حکم دیا تھا وہی آج ظلم کے سامنے مصلحت کی چادر تان کر سو رہے ہیں۔ حق گوئی جسے ایمان کی علامت کہا گیا تھا وہ مصلحت کے شور میں دب کر رہ گئی ہے اور عدل جسے شریعت کی روح قرار دیا گیا تھا، اقتدار کی دہلیز پر سہم کر کھڑا ہے۔ زبانیں ہیں مگر گویائی کا حوصلہ نہیں، آنکھیں ہیں مگر ظلم و ستم کے مناظر دیکھ کر بھی نم نہیں ہوتیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ظلم اب صرف ظالم کا گناہ نہیں رہا بلکہ خاموش تماشائیوں کی رضامندی سے ایک سماجی روایت بن چکا ہے اور یہی وہ لمحۂ فکریہ ہے جہاں امت کا ضمیر سب سے زیادہ مجروح دکھائی دیتا ہے۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جب حکمرانوں نے عدل، شجاعت اور جواب دہی کو اپنا شعار بنایا تو اقلیت میں ہونے کے باوجود وہ دنیا کی تاریخ بدل گئے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا دربار ہو یا حضرت صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کا خیمہ، طاقت ہمیشہ اخلاق کے تابع رہی۔ وہاں شمشیر سے پہلے ضمیر بیدار تھا اور فتوحات سے قبل نفس محاسبے کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا تھا۔ اقتدار کو حق نہیں بلکہ امانت سمجھا جاتا تھا اور رعایا کو بوجھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ذمہ داری۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے فیصلے جغرافیے نہیں، تاریخ رقم کرتے تھے اور ان کی حکمرانی سرحدوں سے زیادہ دلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

مگر آج کا مسلم حکمران تاریخ کے اس آئینے میں جھانکنے سے کتراتا ہے کیونکہ اسے وہاں اپنی کمزوری، اپنی خموشی اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ آئینہ چاپلوسی کے غبار سے دھندلا نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی اسے مصلحت کے پردوں سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ اس کے سامنے تو وہی سوال کھڑا ہوتا ہے جو ہر دور کے اقتدار سے پوچھا گیا ہے: ''کیا طاقت حق کی خادم ہے یا حق طاقت کا اسیر؟'' اور جب اس سوال کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ ہو تو تاریخ سے نظریں چرا لینا ہی سب سے آسان راستہ بن جاتا ہے مگر یہی فرار کل کے احتساب کو اور زیادہ سخت بنا دیتا ہے۔

عالمی میڈیا نے مظلوم اور ظالم کی تعریف بدل دی ہے۔ اب سچ کو سیاق و سباق کے ہجوم میں گم کر دیا جاتا ہے اور ظلم کو الفاظ کی چمک

میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ جو خون بہتا ہے وہ خبر نہیں بنتا اور جو بیانیہ طاقت کے مطابق ڈھل جائے وہی ''حقیقت'' کہلاتا ہے۔ یوں کیمرے کی آنکھ سچ نہیں دیکھتی بلکہ وہی دکھاتی ہے جو مفاد کے عدسے سے چھن کر آئے اور اسی بصری فریب نے دنیا کے ضمیر کو بے حسی کی نیند سلا دیا ہے۔

افسوس کہ مسلم حکمران اس فکری یلغار کا کوئی مؤثر جواب دینے میں ناکام رہے ہیں۔ نہ کوئی متحدہ بیانیہ، نہ فکری قیادت، نہ اخلاقی جرأت، نتیجہ یہ کہ امت کا مقدمہ خود امت کے ایوانوں میں کمزور پڑ گیا ہے۔ جہاں صف بندی ہونی چاہیے تھی وہاں انتشار نے جگہ لے لی اور جہاں حق کی وکالت درکار تھی وہاں خاموش سفارت کاری کو دانش مندی سمجھ لیا گیا۔ یوں دشمن کے الزامات کا بوجھ بھی ہم نے خود اٹھا لیا اور اپنے دفاع کا حق بھی خود ہی ترک کر دیا حتیٰ کہ ظلم کے خلاف بلند ہونے والی ہر صدا مفاد کی میز پر رکھ کر خاموش کر دی گئی۔

یہ کہنا شاید تلخ ہو مگر حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ کا اصل بحران وسائل کی کمی نہیں، قیادت کی قلت ہے۔ وہ قیادت جو خوف کی بجائے ایمان سے فیصلے کرے، جو وقتی فائدے کی جگہ تاریخی ذمہ داری سامنے رکھے اور جو اقتدار کو امانت سمجھے، غنیمت نہیں۔ آج مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس آواز نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ آواز کو سمت دینے والا ضمیر کمزور پڑ چکا ہے۔ بصورتِ دیگر تاریخ گواہ ہے کہ جب قیادت سچ کے ساتھ کھڑی ہوئی تو وسائل خود راستہ بناتے چلے گئے اور جب قیادت مصلحت کی اسیر بنی تو دولت، افواج اور اتحاد سب بوجھ بن کر رہ گئے۔

تاریخ کا ایک اصول ہے: جو قومیں ظلم پر خاموش رہتی ہیں، تاریخ انہیں بھی ظالموں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ مسلم حکمرانوں کو سمجھنا ہوگا کہ عالمی منظر نامہ تیزی سے بدل رہا ہے اور یہ تبدیلی محض جغرافیائی نہیں، اخلاقی بھی ہے۔

اگر آج بھی غفلت کا یہ سفر جاری رہا تو آنے والی نسلیں سوال کریں گی: جب امت جل رہی تھی تب اس کے محافظ کہاں تھے؟ کیا وہ ایوانوں میں مصلحتوں کے چراغ جلا رہے تھے؟ کیا وہ خاموش معاہدوں اور سفارتی مسکراہٹوں میں سچ دفن کر رہے تھے؟ یا تاریخ کے سب سے بڑے المیے کو ''حالات کی مجبوری'' کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کر چکے تھے؟ آنے والی نسلیں یہ بھی پوچھیں گی کہ جب حق کو زبان کی ضرورت تھی تو آوازیں کیوں خموش ہوگئیں؟ جب ظلم بے نقاب تھا تو بصیرت کیوں اندھی ہوگئی؟ اور جب قیادت کو امت کا سہارا بننا تھا تب وہ خود کن سہاروں کی تلاش میں بھٹکتی رہی؟ اور شاید اس سوال کا جواب دینا کسی عالمی فورم پر تقریر کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوگا۔

اے اہلِ ملت! تاریخ کسی قوم کے سوئے رہنے کا زیادہ انتظار نہیں کرتی۔ وہ بار بار دستک نہیں دیتی، ایک لمحہ آتا ہے فیصلہ ہوتا ہے اور پھر نسلیں اس کے نتائج بھگتتی ہیں۔ آج امتِ مسلمہ اسی نازک موڑ پہ کھڑی ہے جہاں خموشی عبادت نہیں اور مصلحت حکمت نہیں رہی۔ یہ وہ ساعت ہے جہاں حق کے ساتھ کھڑا ہونا ایمان کا تقاضا ہے، نہ کہ سفارتی مجبوری۔

یہ سمجھ لینا بھی ایک فریب ہے کہ ذمہ داری صرف حکمرانوں کی ہے۔ جب قومیں اپنے شعور کو گروی رکھ دیتی ہیں تو ایوانوں میں غفلت ہی تخت نشین ہوتی ہے۔ منبر اگر خاموش ہو جائیں، قلم اگر مصلحت کا اسیر بن جائے اور عوام اگر ظلم کو مقدر سمجھ لیں تو پھر تاریخ نئے فرعون تراش لیتی ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ امت اپنے باطن میں جھانکے، اپنی ایمانی غیرت کو آواز دے اور اپنا اجتماعی ضمیر پھر سے زندہ کرے۔

اٹھو! اپنی صفوں میں وہ روح واپس لاؤ جو بدر میں تھی، وہ بصیرت جو حدیبیہ میں تھی اور وہ استقامت جو کربلا میں جلوہ گر ہوئی۔

اپنے ایمان کو خوف کے خول سے آزاد کرو، اپنے ضمیر کو مصلحت کی زنجیروں سے رہائی دو۔ حق کے لیے اٹھنے کا نام بغاوت نہیں یہ انبیائی وراثت کی تجدید ہے۔

یاد رکھو! جو قومیں سچ کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہیں تاریخ ان کے قدموں کے نیچے راستے خود بچھا دیتی ہے۔ **(باقی صفحہ 31 پر۔۔۔)**

حافظ رضی الدین
hafizraziuddin785@gmail.come

غزہ: ایک زخمی سجدہ اور مسلم قیادت کا امتحان

یہ تحریر کسی خبر کی توسیع نہیں، یہ امت کے ضمیر پر دستک ہے۔ یہ ان زخموں کا بیان ہے جو صرف غزہ کی گلیوں میں نہیں، مسلم دنیا کے اجتماعی شعور میں بھی رس رہے ہیں۔ یہ درد خاموش نہیں اور نہ ہی محض مشاہدے کا موضوع ہے یہ ایک چیلنج ہے، ایک سوال ہے جو ہر مسلمان قیادت سے پوچھتا ہے کہ ہم مظلوم کی پکار کا جواب کس اعتبار سے دیتے ہیں؟ کیا ہم اسے محض رسمی بیانات، مختصر مذمتوں یا عارضی امداد کے پیمانے سے ناپتے ہیں؟ یا ہم اپنے اعمال، اپنی نیت اور اپنے ضمیر کے معیار سے اس کا جواب دیتے ہیں؟ جب طاقت کے ایوان خاموش رہیں اور اقتدار کی چمک مظلوم کی آنکھوں پر سایہ ڈالے تو سوال اور بھی پراثر ہو جاتا ہے۔ یہ سوال صرف غزہ کے لیے نہیں بلکہ امت کے ہر گوشے کے لیے ایک عکاسی ہے کہ ہم اپنے ایمان اور اخلاق کی پیمائش کہاں تک کرتے ہیں۔

یہ زخم یاد دلاتے ہیں کہ طاقت کے پیچھے دبے ہوئے ضمیر کتنے نازک اور کتنے ناتواں ہیں- یہ ضمیر اگرچہ خاموش نظر آتا ہے مگر ہر دھڑکن پر حقیقت کی صدا سناتا ہے۔ یہ زخم ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ قوت کی چمک انسانیت کے اصولوں کو چھپا نہیں سکتی اور اقتدار کی بلند عمارتیں اخلاق کے کٹہرے میں کمزور ثابت ہو جاتی ہیں۔ یہاں ہر آنسو، ہر نوحہ، اور ہر خاموش فریاد ایک آئینہ ہے جو بتاتا ہے کہ نیت اور کردار طاقت سے کہیں زیادہ اہم ہیں

اس دستک میں الفاظ کمزور ہو جاتے ہیں لیکن شعور کی بازگشت تاریخ کے صفحات پر دیر تک گونجتی رہتی ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب سوال دشمن سے نہیں، اپنے آپ سے پوچھا جاتا ہے----اور یہ سوال اکثر سب سے زیادہ کٹھن اور دردناک ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحے ہیں جب انسان کو اپنے اعمال، اپنے ضمیر اور اپنی نیت کا محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ طاقت کے بادل چھائے ہوں یا امن کے دعوے بلند، یہ لمحے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ سچائی صرف الفاظ میں نہیں، عمل میں ثابت ہوتی ہے۔ یہی وقت ہے جب امت کا حقیقی امتحان سامنے آتا ہے کہ کیا ہم مظلوم کے حق میں کھڑے ہیں یا اپنی راحت اور سیاست کے پس منظر میں خاموش رہ گئے؟

آج غزہ اسی سوال کا نام ہے۔ یہ سوال ایمان کی صداقت، قیادت کی دیانت اور اقتدار کی ترجیحات سے متعلق ہے۔

روحانی نگاہ سے دیکھا جائے تو امت کا درد صرف ملبے اور لاشوں کا درد نہیں بلکہ قیادت کی خاموشیوں کا نوحہ بھی ہے- یہ خاموشیاں صرف وقت کی زنجیروں میں بند نہیں ہیں، بلکہ ضمیر کے دروازوں پر بھی دستک دیتی ہیں۔ جب فیصلے الفاظ تک محدود رہ جائیں اور عمل کی سانسیں رک جائیں تو یہ نوحہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہی نوحہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ امت کی طاقت صرف عسکری یا سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی فیصلوں کی بھی محتاج ہے -مسلم حکمرانوں کے ایوانوں میں چراغ تو روشن ہیں مگر وہاں سے اٹھنے والی روشنی غزہ تک نہیں پہنچتی۔قراردادیں اور بیانات جتنے بھی شفاف دکھائی دیں، وہ وہاں کے اندھیروں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ طاقت

کے اکھاڑوں میں مصروف یہ چراغ مظلوم کی گلیوں تک رہنمائی نہیں دے پاتے اور انصاف کی جستجو خالی ہاتھ رہ جاتی ہے۔ یہی خاموشی امت کے ضمیر پر سوال چھوڑ جاتی ہے کہ کیا ہم صرف روشنی کے دکھاوے کے قائل ہیں یا مظلوم تک حقیقت کی روشنی پہنچانے کے ذمہ دار بھی؟

بیانات تو ہیں مگر بے اثر، مذمتیں بھی ہیں مگر بے جان اور دعائیں ہیں مگر عمل سے عاری۔ یہ سب کچھ ایک خالی صحن کی مانند ہے جہاں شور ضرور ہے مگر صدا نہیں۔ طاقت کے ایوان اپنی مصروفیات میں مگن ہیں مگر ان کی حکمت مظلوم کے زخموں تک نہیں پہنچتی۔ یہی عدم ہم آہنگی امت کے ایمان کو جھنجھوڑتی ہے اور یاد دلاتی ہے کہ الفاظ کی چمک کبھی عمل کی طاقت کے بغیر حقیقت نہیں بنتی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاست نے ایمان کو مصلحت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور حکمت کے نام پر بے حسی کو دانش بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے وہ لوگ جنہیں امت کا محافظ کہا جاتا ہے اکثر اپنے عہدوں کی سلامتی اور اقتدار کی حفاظت میں حقیقت کی آواز دبا دیتے ہیں۔ اصولوں کی جگہ مصلحتیں آ جاتی ہیں اور حق کی فریاد محض خموش سرگوشی بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں امت کا ضمیر سوال کرتا ہے کہ کیا ہم ایمان کو صرف لفظوں تک محدود رکھ کر راحت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اس کے لیے عمل کا بوجھ بھی اٹھائیں گے؟

یہ تمہید اس احساسِ زیاں سے جنم لیتی ہے کہ جس امت کو ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ'' کا خطاب ملا تھا وہ آج اپنے سب سے مظلوم حصے کے لیے محض قراردادوں اور رسمی بیانات پر اکتفا کر رہی ہے۔ مسلم حکمران اگر چاہیں تو ان کی خاموشی گرج بن سکتی ہے اور ان کا اتحاد تاریخ کا رخ موڑ سکتا ہے مگر افسوس کہ اقتدار کے تحفظ نے غیرتِ ایمانی کو پس منظر میں ڈھکیل دیا ہے۔ جہاں قیادت کی ترجیحات عارضی مفادات اور سیاسی چالاکیوں کے گرد گھومتی ہیں وہاں مظلوم کی پکار محض سرگوشی بن کر رہ جاتی ہے۔ اصول اور اخلاق کی گواہی طاقت کے سائے تلے دب کر خموش ہو جاتی ہے اور امت کے ضمیر پر سوال رہ جاتا ہے کہ کیا ہم صرف دیکھنے والے ہیں یا ان کی آواز پہ عمل کرنے والے بھی؟ یہی پس منظر غزہ کی گلیوں میں کھڑا درد ہے جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ حقیقی قیادت صرف عہد و عمل سے قائم ہوتی ہے، الفاظ سے نہیں۔

غزہ اسی پس منظر کی سب سے روشن مگر سب سے دردناک تصویر ہے۔

یہ تحریر اسی لیے روحانی ہے کہ یہ طاقت کے توازن کی نہیں، نیت کے وزن کی بات کرتی ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ کون کتنا طاقتور ہے، سوال یہ ہے کہ کون کتنا بیدار ہے۔ غزہ کے ملبے کے نیچے دبی ہوئی دعائیں آج امت کی قیادت سے جواب مانگ رہی ہیں--- یہ صرف زمین پر نہیں بلکہ آسمان تک صدا دے رہی ہیں۔ ہر آنسو، ہر نوحہ اور ہر خاموش فریاد قیادت کے ضمیر پر دستک دے رہی ہے کہ انصاف اور رحمت کے اصول کہاں ہیں۔ یہ دعائیں طاقت کی بلند عمارتوں کو چیلنج کر رہی ہیں اور یاد دلا رہی ہیں کہ امت کی عظمت صرف اقتدار یا رعب میں نہیں بلکہ مظلوم کے حق میں کھڑے ہونے میں ہے۔ اور اگر یہ صدا سننے والا نہ ہو تو تاریخ خود گواہی دے گی کہ کون خاموش رہا اور کون حق کے ساتھ کھڑا رہا اور یہی جواب اس مضمون کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور اس کی اصل معنویت بھی۔

غزہ آج صرف ایک جغرافیہ نہیں رہا، یہ ضمیرِ انسانی کا امتحان بن چکا ہے۔ یہاں ملبہ صرف عمارتوں کا نہیں گرتا، یہاں لفظ، وعدے اور عالمی ضابطے بھی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

یہاں اقوام کے منشور کاغذ بن کر جلتے ہیں اور انسانی حقوق کے باب آہنی دروازوں کے پیچھے بند ہو جاتے ہیں۔ انصاف کے میزان پر طاقت کا ہاتھ اس قدر بھاری ہے کہ سچ کا پلڑا اٹھ ہی نہیں پاتا۔ اس ویرانی میں قانون کی زبان گونگی ہو جاتی ہے اور ضمیر کی عدالتیں ملتوی در ملتوی چلتی رہتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ تہذیب اپنے ہی اصولوں کے ملبے تلے دب کر ہمیں پکار رہی ہو۔

صبح کی اذان جب فضا میں بکھرتی ہے تو اس کی بازگشت میں بارود کی بو شامل ہوتی ہے اور شام کی سرخی سورج کی نہیں، خون کی ہوتی

ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں بچپن وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے اور مائیں لوریوں کے ساتھ دعائیں نہیں، وصیتیں سکھاتی ہیں۔ جہاں کھلونوں کی جگہ ملبہ اور کہانیوں کی جگہ چیخیں لے لیتی ہیں۔ یہاں ننھے ہاتھ بستے نہیں، کفن تھامتے ہیں اور آنکھیں خواب نہیں، زندہ رہنے کی ترکیبیں سیکھتی ہیں۔ وقت یہاں کیلنڈر سے نہیں، دھاکوں کے وقفوں سے ناپا جاتا ہے اور ہر نیا دن ایک پرانے زخم کی تجدید بن کر طلوع ہوتا ہے۔

میں نے غزہ کو خبروں میں نہیں، خاموشیوں میں پڑھا ہے۔ ان خاموشیوں میں جو بمباری کے بعد اُترتی ہیں، جب گرد بیٹھتی ہے اور آنکھیں اپنے پیاروں کو تلاش کرتی ہیں۔

یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جہاں سانس بھی اجازت لے کر چلتی ہے اور دل اپنے دھڑکنے پر شرمندگی سی محسوس کرتا ہے۔ اس سکوت میں سوال نہیں ہوتے، صرف نام ہوتے ہیں جو لبوں پر آ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی خاموشیاں سب سے سچی گواہ ہیں کیونکہ یہاں کوئی بیان نہیں، صرف بچھڑ جانے کی صداقت ہے۔

یہاں ہر اینٹ ایک سوال ہے: کیا انسانیت کی کوئی سرحد بھی ہے؟ اور ہر سوال کے جواب میں دنیا کی بے حسی ایک طویل سناٹا بن کر کھڑی ہے۔ یہ سناٹا سب سے زیادہ چیختا ہے۔ اس چیخ میں عدالتوں کی تاخیر، ایوانوں کی مصلحت، مسلم حکمرانوں کی خاموشی اور منبروں کی مجبوری سب عیاں ہو جاتی ہیں۔ آوازیں جب دبائی جائیں تو خاموشی ہی احتجاج بن جاتی ہے اور یہی احتجاج غزہ کی گلیوں میں ملبے کے ساتھ بکھرا پڑا ہے۔ وقت اس سناٹے کو تاریخ میں ثبت کر رہا ہے تاکہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں خبر نہ تھی۔

غزہ کے بچے جب آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ستارے نہیں گنتے، جہاز پہچانتے ہیں۔ ان کی معصوم آنکھوں میں تجسس نہیں، اندیشے تیرتے ہیں اور ہر سایہ ایک خدشہ بن کر اترتا ہے۔ کھیل کے میدان سہمے ہوئے کھنڈرات میں بدل چکے ہیں، جہاں ہنسی بھی دبے پاؤں چلتی ہے۔ یہ بچے عمر سے پہلے تاریخ پڑھ رہے ہیں، ایک ایسی تاریخ جو انہیں مسکرانا نہیں، برداشت کرنا سکھا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں خوف کا جو سایہ ہے وہ ہمارے آرام دہ کمروں میں بیٹھے تجزیوں سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ یہاں ایمان ملبے کے نیچے بھی زندہ ہے ایک ماں کا صبر، ایک باپ کی خاموش استقامت اور ایک بچے کی مسکراہٹ----- یہ سب شہادتیں ہیں کہ ظلم جتنا بھی منظم ہو، حق کی سانسیں رُکتی نہیں۔ زخموں سے پھوٹتی دعائیں آسمان تک راستہ بنا لیتی ہیں اور آنسوؤں کے سلسلے بھی سجدے ہو جائیں تو رد نہیں ہوتے۔ غزہ کی یہ استقامت اعلان ہے کہ ایمان صرف محفوظ محرابوں میں نہیں، آزمائش کے ملبے تلے بھی پوری شان سے زندہ رہتا ہے۔ یہ محض سیاست کا قضیہ نہیں، یہ اخلاق کا باب ہے۔ یہاں فیصلہ طاقت کے ایوانوں میں نہیں، ضمیر کی عدالت میں ہونا چاہیے۔ جب مصلحت انسانیت پر غالب آ جائے تو تاریخ رحم نہیں کرتی، صرف نشان لگا دیتی ہے۔ غزہ اسی نشان کا نام ہے--- جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خاموشی بھی ایک موقف ہوتی ہے اور اکثر سب سے بھاری۔

طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے مسکراتے چہرے، قراردادوں کی فائلیں اور سفارتی بیانات--- سب اس وقت بے معنیٰ ہو جاتے ہیں جب ایک بچہ اپنی ماں کو پکارے اور جواب میں دھواں اُٹھے۔ ایسے لمحوں میں الفاظ اپنی ساکھ کھو دیتے ہیں اور بیان کی جگہ چیخ لے لیتی ہے۔ ضابطے کاغذوں کی بند مٹھی میں قید رہ جاتے ہیں جبکہ سچ ملبے کے نیچے کراہتا ہے۔ یہی وہ گھڑی ہے جہاں دنیا کی دانش، اس کی تہذیب اور اس کے دعوے سب امتحان گاہ میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔

غزہ ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ تاریخ کے کٹہرے میں قومیں اپنے ہتھیاروں سے نہیں، اپنے رویّوں سے پہچانی جاتی ہیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ توپوں کی گونج مدھم ہو جاتی ہے مگر بے حسی کی گواہی باقی رہتی ہے۔ آنے والی نسلیں یہ نہیں پوچھیں گی کہ کس کے پاس کتنی قوت تھی بلکہ یہ دیکھیں گی کہ کمزور کے حق میں کون کھڑا ہوا۔ غزہ اسی سوال کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی معنوی طاقت ہے۔

روحانی نظر سے دیکھیں تو غزہ ایک سجدہ ہے--- لمبا، خاموش اور زخمی۔ اس سجدے میں وہی سرخرو ہے جو حق کے ساتھ کھڑا ہو، چاہے اس کے پاس الفاظ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ وہ عبادت ہے جو وقت کی پیشانی پہ نقش ہو رہی ہے، جس کا جواب طاقت نہیں، صداقت دیتی ہے۔ یہاں جھکی ہوئی گردنیں ہمیں سکھاتی ہیں کہ اصل بلندی حق پہ ثابت قدم رہنے میں ہے، چاہے راستہ ملبے سے ہو کر ہی کیوں نہ گذرے۔

اور شاید یہی امتحان ہے: کیا ہم لفظوں کو دعا بناتے ہیں یا خاموشی کو عذر؟ غزہ آج بھی کھڑا ہے، ملبے میں بھی، دعا میں بھی--- اور ہم سے سوال کر رہا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہ سوال کسی ایک لمحے تک محدود نہیں، یہ ضمیر کے دروازے پر مسلسل دستک ہے۔ وقت گذر جائے گا، منظر بدل جائیں گے مگر اس سوال کی بازگشت تاریخ کے صفحات میں دیر تک سنائی دیتی رہے گی۔

یہ سوال کسی ایک لمحے کی پیداوار نہیں، یہ وقت کی گہرائیوں سے ابھرنے والی وہ صدا ہے جو ہر دور کے ضمیر کو مخاطب کرتی ہے۔ جب ظلم معمول بن جائے اور بے حسی روایت کا درجہ حاصل کر لے تو تاریخ سوال نہیں پوچھتی، آئینہ دکھاتی ہے۔ اس آئینے میں چہرے نہیں، کردار نظر آتے ہیں نیتیں بے نقاب ہوتی ہیں اور دعووں کی پرتیں خود بخود اترنے لگتی ہیں۔

روحانی سطح پر یہ سوال ایک مسلسل محاسبہ ہے--- ایسا محاسبہ جو نہ کسی عدالت میں درج ہوتا ہے، نہ کسی فائل میں محفوظ بلکہ دل کے نہاں خانوں میں رقم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب انسان اپنے ایمان، اپنی اخلاقی ترجیحات اور اپنی خاموشیوں کا وزن محسوس کرتا ہے۔ وقت کے بدلتے مناظر اس سوال کو مٹا نہیں پاتے بلکہ اسے اور گہرا کر دیتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ آزمائش کے موسم میں کون چراغ بنا اور کون صرف تماشائی رہا۔

□□□□

(صفحہ 27 کا باقی۔۔۔)

آج اگر ہم نے حق کا علم تھام لیا تو کل ہماری نسلیں آزادی کو وراثت میں پائیں گی اور اگر آج ہم نے خاموشی کو شعار بنایا تو آنے والا کل ہمیں غلامی کی مثال بنا کر سنائے گا۔ یہ وقت نعروں کا نہیں، شعور کا ہے، یہ ساعت محض احتجاج کی نہیں کردار کی ہے۔ اگر ہم نے آج سچ کے حق میں بولنا نہ سیکھا تو کل ہماری خاموشی ہمارے بچوں کی وراثت بن جائے گی۔ وہ بچے جو ہم سے پوچھیں گے کہ جب حق سسک رہا تھا تو تمہاری زبانیں کیوں خموش تھیں؟ جب ظلم بے نقاب تھا تو تمہاری غیرت نے آنکھیں کیوں چرالیں؟

یاد رکھو! قومیں تقریروں سے نہیں، قربانی سے زندہ رہتی ہیں اور تاریخ صرف وہی نام محفوظ رکھتی ہے جو حق کے لیے کھڑے ہوئے نہ کہ وہ جو حالات کے پیچھے چھپ گئے۔ آج اگر ہم نے اپنے کردار سے سچ کی گواہی دے دی تو آنے والا کل ہمیں سرخرو لکھے گا ورنہ ہماری خاموشی ہی ہمارا سب سے بڑا جرم بن کر ہمیں ہماری شناخت دے گی۔

یاد رکھو! امتیں اس دن مرتی نہیں جب ان پر ظلم ہوتا ہے، امتیں اس دن مر جاتی ہیں جب وہ ظلم دیکھ کر بھی بیدار نہیں ہوتیں۔ جب آنکھیں کھلی ہوں مگر بصیرت سو جائے، جب زبان سلامت ہو مگر حق کے لیے خاموش رہے تو یہی قوموں کی موت کی پہلی علامت ہوتی ہے۔ ظلم کا سب سے بڑا ہتھیار تلوار نہیں بلکہ مظلوم کی بے حسی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے بے حسی کو تقدیر مان لیا انہوں نے اپنی تقدیر خود مٹا دی۔

ابھی وقت ہے-- سوئے ہوئے شعور کو جھنجھوڑنے کا، بکھری ہوئی صفوں کو سنوارنے کا کیونکہ جو قوم بیداری کا سبق پڑھ لیتی ہے اسے پھر کوئی طاقت سلا نہیں سکتی۔ ابھی وقت ہے-- ضمیر کو جگانے کا، سچ کو تھامنے کا اور تاریخ کو یہ بتانے کا کہ یہ قوم اگرچہ آزمائی گئی، مگر مٹی نہیں، جھکائی گئی، مگر ٹوٹی نہیں خاموش کی گئی، مگر بے حس نہیں۔

آج اگر ہم جاگ گئے تو کل کی صبح ہماری ہوگی اور اگر آج بھی ہم سوئے رہے-- تو آنے والا کل ہمیں معاف نہیں کرے گا۔

□□□□

مفتی فیض احمد رضوی
استاذ: جامعہ حمیدیہ رضویہ مدن پورہ، بنارس

خدا کی تلاش یا صداقت سے فرار

خدا کے وجود پہ مباحثہ: ایک تنقیدی مطالعہ

عصرِ حاضر کی فکری فضا ایک عجیب اضطراب سے دوچار ہے۔ جامعات کے ہال ہوں یا ڈیجیٹل دنیا کے منبر، ٹیلی وژن اسکرینیں ہوں یا سوشل میڈیا کے شوریدہ بازار ہر جگہ ایک ہی سوال بار بار دہرایا جا رہا ہے: کیا خدا ہے؟

یہ سوال بظاہر فلسفیانہ ہے مگر اس کے لہجے میں فلسفے کی سنجیدگی کم اور فکری بالادستی کی خواہش زیادہ جھلکتی ہے۔ یہاں جستجو کی سادگی نہیں، برتری کا احساس بولتا ہے۔ سوال حقیقت تک پہنچنے کے لیے نہیں بلکہ مخاطَب کو دفاعی خانے میں ڈھکیلنے کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکالمہ علم کی روشنی میں نہیں بلکہ ذہنی دباؤ اور فکری رعب کے سائے میں ترتیب دیا جا رہا ہے۔

یہ وہ فلسفہ نہیں جس کی بنیاد شک سے یقین تک کے سفر پر ہو بلکہ وہ اسلوب ہے جس میں شک کو ہتھیار اور یقین کو ملزم بنا دیا جاتا ہے۔ دلیل یہاں چراغ نہیں رہتی بلکہ ایک ایسی ترازو بن جاتی ہے جس کا پلڑا پہلے ہی جھکا ہوا ہوتا ہے۔ سوال کرنے والا خود کو عقلِ مطلق کے منصب پر فائز کر لیتا ہے اور سامنے والے کو اس کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے جہاں وضاحت بھی صفائی سمجھی جاتی ہے اور ایمان بھی جرم ٹھہرتا ہے۔

ایسے مباحث میں سنجیدہ فلسفے کی وہ تہذیب مفقود نظر آتی ہے جو اختلاف کو احترام اور سوال کو امانت سمجھتی ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ خدا کو سمجھا جائے بلکہ یہ ہے کہ ایمان کو کس طرح غیر معقول، روایت کو فرسودہ اور وحی کو غیر متعلق ثابت کیا جائے۔ اسی لیے سوالات کا لہجہ معصوم نہیں رہتا، اس میں طنز کی دھار، تحقیر کی ہلکی سی مسکراہٹ اور ایک غیر اعلانیہ فتح کا احساس شامل ہوتا ہے۔

یہ طرزِ سوال دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ مقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ فکری غلبہ ہے۔ اور جب سوال اس نیت سے اٹھے تو جواب چاہے کتنا ہی مدلل، شفاف اور گہرا کیوں نہ ہو وہ قبول نہیں کیا جاتا کیونکہ یہاں سماعت بند اور فیصلہ پہلے سے لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسے مباحث میں خاموش وقار بھی ایک احتجاج بن جاتا ہے اور سنجیدہ جواب بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ایمان ابھی زندہ ہے۔ اور زندہ ایمان کو سب سے زیادہ وہی سوال کھٹکتا ہے جو خود کو فلسفہ کہلواتا ہے مگر دراصل اقتدارِ فکر کی ایک نئی صورت ہوتا ہے۔

حالیہ مباحث و مذاکروں میں یہ سوال محض علمی جستجو نہیں رہا بلکہ ایک طے شدہ بیانیے کے ساتھ پیش کیا جانے لگا ہے جس میں سوال کرنے والا خود کو عقلِ کُل اور مخاطَب کو ملزم کی حیثیت میں کھڑا کرتا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان تمام مباحث و مذاکروں میں، خواہ وہ بین الاقوامی سطح کے فورمز ہوں یا مقامی علمی نشستیں، میز کے دونوں اطراف تقریباً ہمیشہ مسلمان ہی دکھائی دیتے ہیں۔ گویا خدا کے وجود کی ذمہ داری صرف انہی کے سر آن پڑی ہو۔

حالانکہ خدا کے انکار کا اعلان اگر واقعی ایک عالمی فکری چیلنج ہے تو اس کی زد میں دنیا کے تمام ادیان و مذاہب آتے ہیں جن کے فکری ڈھانچے میں الوہیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر یہ کیسا فکری

انتخاب ہے کہ سوال عالمی ہو اور جواب دہی صرف ایک امت کے حصے میں آئے؟

یہ صورتِ حال محض اتفاق نہیں لگتی۔ حالیہ مباحث کے اسلوب، سوالات کی سمت اور مکالمے کی ترتیب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بحث کا مقصد محض حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ ایک خاص مذہبی شناخت کو دفاعی پوزیشن میں ڈھکیلنا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو بار بار اس کٹہرے میں کھڑا کرنا دراصل اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ اسلام کا تصورِ خدا سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ خالص اور سب سے زیادہ غیر مبہم ہے۔ یہی وہ تصور ہے جسے کمزور کیے بغیر الحاد کی فکری عمارت مضبوط نہیں ہو سکتی۔

ان مباحث میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ دلیل کی جگہ طنز، استدلال کی جگہ تمسخر اور مکالمے کی بجائے محاکمے کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ گفتگو خود اس بات کا اعلان ہے کہ مسئلہ علم کا نہیں بلکہ بیانیے کی برتری کا ہے۔ یہاں سوال سننے کے لیے نہیں، گھیرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اور جواب سمجھنے کے لیے نہیں رد کرنے کے لیے مانگے جاتے ہیں۔ یوں مجلسِ علم آہستہ آہستہ عدالت کا منظر پیش کرنے لگتی ہے جہاں منصف بھی وہی ہوتا ہے، وکیل بھی وہی اور فیصلہ بھی پہلے سے محفوظ۔

اس محاکمانہ فضا میں دلیل کا وقار مجروح ہو جاتا ہے اور تحقیق کا حسن پامال۔ الفاظ ترازو نہیں رہتے بلکہ ہتھوڑے بن جاتے ہیں اور مکالمہ جو دراصل دو ذہنوں کے درمیان حق و صداقت کی تلاش کا سفر ہوتا ہے محض ایک نمائشی معرکہ بن کر رہ جاتا ہے جس کا مقصد سچ کا ظہور نہیں بلکہ مخالف کی پسپائی ہوتی ہے۔

یہ اسلوب اس بات کی علامت ہے کہ اصل خوف دلیل سے نہیں بلکہ اس سچ سے ہے جو دلیل کے پردے میں جھلکتا ہے۔ چنانچہ سوالات اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ جواب دینے والا خود کو صفائی پیش کرنے والا محسوس کرے اور سامعین کے ذہن میں یہ تاثر جڑ پکڑ لے کہ ایمان کسی جرم کی مانند ہے جسے بار بار ثابت کرنا پڑتا ہے۔

ایسے ماحول میں علم خاموش ہو جاتا ہے اور شور بولنے لگتا ہے۔ بیانیہ حقیقت پر سبقت لے جاتا ہے اور ذہن سازی کا عمل اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں فہم نہیں بلکہ تاثر فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کا حاصل اکثر کوئی فکری پیش رفت نہیں بلکہ محض یہ اعلان ہوتا ہے کہ کس کا بیانیہ زیادہ زوردار، زیادہ پُراثر اور زیادہ غالب ہے۔

مگر تاریخ گواہ ہے کہ بیانیے وقتی طور پر غالب آسکتے ہیں، سچ کو ہمیشہ نہیں دبا سکتے۔ کیونکہ مکالمہ اگرچہ وقتی طور پر محاکمے میں بدل دیا جائے مگر سچ اپنی فطرت میں خود ایک زندہ مکالمہ ہے جو ہر دور میں ہر شور کے بعد کسی نہ کسی دل میں اپنی آواز پھر سے بلند کر لیتا ہے۔

مسلمان یہاں مدعو نہیں کیے جاتے بلکہ لاشعوری طور پر پیش کیے جاتے ہیں ایک ایسے مقدمے میں جہاں سوال پہلے سے طے شدہ اور فیصلے کا رخ متعین ہوتا ہے۔ اسی پس منظر میں یہ تحریر اس امر کا جائزہ لینے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے کہ آخر کیوں حالیہ فکری مباحث میں خدا کا سوال اسلام کے گرد گھما دیا گیا ہے؟

کیا یہ محض علمی سہولت ہے یا ایک گہری فکری حکمتِ عملی؟ اور کیا مسلمانوں کو اب بھی اس غیر منصفانہ تقسیمِ کردار کو خاموشی سے قبول کر لینا چاہیے؟

یہ تمہید دراصل اسی فکری اضطراب کی آواز ہے ایک ایسی آواز جو شور میں دبائی جا رہی ہے مگر جس کا جواب دینا اب ناگزیر ہو چکا ہے۔ دنیا کی فکری تاریخ پر اگر ایک گہری نگاہ ڈالی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ انسان ہمیشہ دو بڑے طبقات میں منقسم رہا ہے: ایک وہ جو کسی نہ کسی صورت میں خدا کے وجود پہ ایمان رکھتا ہے اور دوسرا وہ جو خدا کے وجود ہی کا منکر ہے۔ یہ تقسیم محض عقیدے کی نہیں بلکہ فکر، شعور اور تہذیبی سمت کی بھی ہے۔ لیکن ایک سوال جو بار بار ذہن کو چونکاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی خدا کے وجود و عدمِ وجود پر مباحثہ، مذاکرہ یا مناظرہ برپا ہوتا ہے تو میز کی ایک طرف تقریباً ہمیشہ مسلمان ہی کیوں بٹھائے جاتے ہیں؟

یہ کیسا فکری انتخاب ہے؟ یہ کیسی مناظرانہ ترتیب ہے؟ اور اس

کے پسِ پردہ کون سی نادیدہ حکمتِ عملی کارفرما ہے؟ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ سوال ہمیشہ ایک ہی سمت سے اٹھتا ہے اور جواب دہی کا بوجھ بھی ایک ہی طبقے پر ڈال دیا جاتا ہے؟ کیا یہ سادہ سی علمی سہولت ہے یا پھر شعوری طور پر طے کی گئی وہ تقسیمِ کردار ہے جس میں ایک فریق کو مسلسل مدافع اور دوسرے کو مستقل مدعی بنا دیا گیا ہے؟ اگر مسئلہ واقعی خدا کے وجود کا ہے تو پھر یہ انتخاب اتنا محدود کیوں اور یہ دائرہ اتنا تنگ کیوں رکھا گیا ہے؟

یہ مناظرانہ ترتیب اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بحث کا میدان پہلے ہی ہموار کرلیا گیا ہے۔ سوالات کی سمت، مثالوں کا انتخاب اور حوالوں کی ترتیب سب کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ نتیجہ غیر محسوس طور پر ایک خاص رخ اختیار کر لے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بحث نہیں ہو رہی ہو بلکہ ایک فکری اسکرپٹ پڑھا جا رہا ہو جس میں ہر کردار کو اس کا مکالمہ پہلے ہی تھما دیا گیا ہے۔ پسِ پردہ کارفرما حکمتِ عملی یہ ہے کہ اسلام کو ایک ہمہ گیر سچائی کی بجائے محض ایک قابلِ بحث نظریہ بنا کر پیش کیا جائے۔ جب کسی دین کو بار بار مناظرے کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے تو آہستہ آہستہ اس کی حیثیت مرجع سے مدعا علیہ میں بدل جاتی ہے اور جب یہ تبدیلی ذہنوں میں راسخ ہو جائے تو پھر سوال یہ نہیں رہتا کہ خدا ہے یا نہیں بلکہ یہ بن جاتا ہے کہ کیا ایمان رکھنے کا کوئی جواز بھی باقی رہ گیا ہے؟ یہی وہ نادیدہ حکمتِ عملی ہے جس کے ذریعے عقیدے کو رائے میں، یقین کو احتمال میں اور وحی کو محض ایک تاریخی بیانیے میں سمیٹ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ فکری یلغار شور کے ساتھ نہیں بلکہ ترتیب اور تکرار کے ذریعے کی جاتی ہے۔

بار بار وہی سوال، وہی لہجہ، وہی مخاطَب، حتیٰ کہ ذہن خود اس تقسیم کو فطری ماننے لگے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس صداقت کو بار بار چیلنج کا سامنا کرنا پڑے وہ کمزور نہیں بلکہ زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور جس فکر کو منصوبہ بندی کے ساتھ نشانے پر رکھا جائے وہ دراصل اپنی تاثیر کا اعتراف بن جاتی ہے۔ اسی لیے یہ سوالات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ معاملہ محض فکری اختلاف کا نہیں بلکہ اس سچ سے خوف کا ہے جو اب بھی اپنے پورے وقار کے ساتھ زندہ ہے۔ اگر انصاف اور فکری دیانت کا تقاضا پورا کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ملحد صرف اسلام اور مسلمانوں کو نہیں بلکہ دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کو چیلنج کر رہا ہوتا ہے، خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، ہندو ہوں، سکھ ہوں یا کسی اور مذہبی روایت سے وابستہ ہوں۔ کیونکہ ان سب کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں ایک اعلیٰ طاقت، ماورائی ہستی یا الوہیت کا تصور موجود ہے۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ ”یہ سارا بوجھ صرف مسلمانوں کے کندھوں پہ کیوں ڈال دیا جاتا ہے؟“ یہ محض اتفاق نہیں، یہ محض سہولت کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی فکری حکمتِ عملی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور نہایت پاکیزہ، شفاف، غیر مجسم، غیر مبہم اور غیر متنازع ہے۔ اسلام کا خدا نہ کسی انسانی صفات کا محتاج ہے، نہ کسی اساطیری داستان کا اسیر، نہ کسی مجسمے میں قید، نہ کسی خاندان، نسل یا قوم تک محدود۔ قل هو الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحد۔ وہ واحد ہے، یکتا ہے۔ لم یلد ہے، ولم یولد ہے۔

نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، نہ خیال میں محدود کیا جا سکتا ہے، زمان و مکان سے ماورا مگر ہر شے پر محیط یہی وہ تصور ہے جو ملحدانہ فکر کو سب سے زیادہ بے چین کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں اسے کسی اساطیری تضاد، تثلیثی الجھاؤ یا تجسیمی کمزوری کا سہارا نہیں ملتا۔

یہاں خدا کا تصور اتنا صاف، اتنا منطقی اور اتنا بلند ہے کہ انکار کے لیے محض تمسخر، جذباتیت یا سطحی سوالات کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

مسلمانوں کو ہدف بنانے کی وجہ یہ ہے کہ ملحدانہ فکر یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ: اگر اسلامی تصورِ خدا کمزور ہوا اگر مسلمان ذہنی طور پہ دفاعی پوزیشن میں چلے گئے۔ اگر اسلام کو محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک فکری مسئلہ بنا کر پیش کر دیا گیا تو باقی مذاہب خود بہ خود پس منظر میں چلے جائیں گے۔ اس لیے بحث کا مرکز اسلام، سوالات کا رخ مسلمان

اور طنز و تشکیک کا ہدف قرآن و سنت کو بنایا جاتا ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں یہ معاملہ محض فکری اختلاف کا نہیں رہتا بلکہ منصوبہ بند فکری یلغار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ایک ایسی یلغار جس کا مقصد خدا کے تصور کو مشکوک بنانا۔ ایمان کو غیر عقلی ثابت کرنا اور مسلمانوں کو مسلسل دفاعی کیفیت میں رکھنا ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ سب کچھ اتفاقی نہیں بلکہ ایک منظم ذہن سازی کا حصہ ہے۔ میڈیا، اکیڈمک فورمز، سوشل پلیٹ فارمز اور نام نہاد فکری مباحث میں بار بار اسلام کو نشانہ بنانا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی جڑیں محض چند افراد تک محدود نہیں بلکہ ایک گہرے فکری نیٹ ورک میں پیوست ہیں۔

یہ نیٹ ورک جانتا ہے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل فکری نظام ہے، ایک تہذیبی شناخت اور ایک زندہ ضمیر ہے۔ یہ انسان کو صرف عبادت کا طریقہ نہیں دیتا بلکہ سوچنے کا سلیقہ، جینے کا قرینہ اور مرنے کا وقار بھی عطا کرتا ہے۔

اسلام فرد کا باطن بھی منور کرتا ہے اور معاشرے کا ظاہر بھی منظم کرتا ہے یہ دل میں خدا کی عظمت بساتا ہے تو ہاتھ میں عدل کا ترازو بھی تھما دیتا ہے۔ یہ محض چند رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ اقدار، اصول اور ذمہ داریوں کی ایسی ہم آہنگ ترتیب ہے جو انسان کو خواہش کا غلام نہیں، حق کا امین بناتی ہے۔ اسی لیے اسلام جہاں ایمان کا مطالبہ کرتا ہے وہیں شعور کی تربیت بھی کرتا ہے اور جہاں بندگی سکھاتا ہے وہیں آزادیِ نفس کا مفہوم بھی واضح کرتا ہے۔ لہٰذا اسے کمزور کیے بغیر الحاد کی فکری فتح ممکن نہیں۔ ایسے نازک اور آزمائشی ماحول میں اہلِ ایمان سے یہ تقاضا ہے کہ وہ وقتی جذبات سے بلند ہو کر اپنے کردار کی عظمت کا ثبوت دیں، ایسے ماحول میں مسلمانوں کی ذمہداری محض ردِعمل دینا نہیں بلکہ علمی تیاری، فکری وقار، اخلاقی استقامت اور اعتمادِ ایمانی کے ساتھ میدان میں اترنا ہے۔

ہمیں یہ باور کرانا ہوگا کہ خدا کا سوال کسی ایک مذہب کا نہیں بلکہ انسانیت کے وجودی شعور کا سوال ہے اور اگر بحث ہونی ہے تو وہ تمام خدا پرست روایتوں کی مشترکہ نمائندگی کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ صرف مسلمانوں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے۔

خدا کے وجود پر سوال اٹھانا کوئی نئی بات نہیں لیکن صرف مسلمانوں کو اس سوال کے سامنے لا کھڑا کرنا ایک غیر منصفانہ، غیر متوازن اور مشتبہ طرزِ عمل ہے۔ اسلام خوف کی پیداوار نہیں، بیدار ضمیر کی صدا ہے۔ نہ روایت کی مجبوری بلکہ عقل کی روشنی، فطرت کی آواز اور وحی کی گواہی کا حسین امتزاج ہے۔ جو اس تصور سے خائف ہے وہ دراصل کسی مذہب سے نہیں، سچائی کی طاقت سے خوف زدہ ہے۔

آخر کار سوال یہ نہیں رہ جاتا کہ خدا ہے یا نہیں، اصل سوال یہ بن جاتا ہے کہ انسان اپنے وجود کی تعبیر کس روشنی میں کرنا چاہتا ہے۔ وہ روشنی جو وحی سے پھوٹتی ہے، فطرت سے ہم آہنگ ہے اور عقل کو سجدۂ شعور عطا کرتی ہے۔ یا وہ تاریکی جو انسان کو خود اس کا معبود بنا دیتی ہے اور کائنات کو محض ایک اندھا اتفاق قرار دے کر دل کو معنویت سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ اندھی روشنی جو محض آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے مگر دل کو بصیرت سے محروم کر دیتی ہے؟ ایک راستہ انسان کو اس کے خالق سے جوڑ کر معنیٰ، مقصد اور جواب دہی کا احساس بخشتا ہے جبکہ دوسرا راستہ اسے خود اس کا مرکز بنا کر لبھاتی آزادی کا سراب تو دیتا ہے مگر دائمی سکون چھین لیتا ہے۔ وحی کی روشنی میں عقل قید نہیں ہوتی بلکہ مہذب ہوتی ہے اور فطرت دبائی نہیں جاتی بلکہ اپنی اصل پہچان پا لیتی ہے۔

یہی وہ نور ہے جو انسان کو محض ہونے سے نکال کر ہدف رکھنے والا وجود بناتا ہے جو زندگی کو حادثہ نہیں بلکہ امانت سمجھنا سکھاتا ہے اور جس کے بغیر علم بھی بوجھ بن جاتا ہے اور آزادی بھی تنہائی میں بدل جاتی ہے۔ مسلمان جب ان مباحث و مذاکروں میں تنہا کھڑا دکھائی دیتا ہے تو یہ اس کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی حقانیت کی گواہی ہے۔ وہ امت جس کے پاس خدا کا تصور سب سے زیادہ پاکیزہ، سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ توحیدی ہے وہی سب سے پہلے نشانے پر آتی ہے۔ یہ ایک لمحۂ فخر بھی ہے اور لمحۂ احتساب بھی کہ کیا ہم نے اس امانتِ ایمان کی حفاظت کے لیے علم، حکمت اور کردار کا وہ حق ادا کیا ہے جو ہم سے مطلوب تھا؟ (باقی صفحہ 47 پر۔۔۔)

مولانا مختار اشرف، ممبئی

امانت وعدل: حسنِ سلوک کی قرآنی بنیادیں

انسانی معاشرہ محض قوانین، ضابطوں اور ظاہری نظم ونسق سے زندہ نہیں رہتا بلکہ اس کی اصل روح اُن اقدار سے سانس لیتی ہے جو دلوں کو جوڑیں، رویّوں کو مہذب بنائیں اور طاقت کو اخلاق کے تابع رکھیں۔ جب امانت اور انصاف زندگی سے رخصت ہو جائیں تو رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں، اعتماد ٹوٹ جاتا ہے اور انسان، انسان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تہذیب کا چراغ بجھنے لگتا ہے اور سماج محض ہجوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے انسان کو محض چند مخصوص عبادات کا پابند نہیں بنایا بلکہ اسے کردار کا امین بھی قرار دیا ہے۔ اس نے حسنِ سلوک کو وقتی اخلاقی نعرہ نہیں بلکہ زندگی کی مستقل بنیاد بنایا اور اس بنیاد کے لیے دو ایسے اصول عطا فرمائے جو فرد کی اصلاح سے شروع ہو کر پورے معاشرے کی تعمیر تک پہنچتے ہیں: امانتوں کی ادائیگی اور عدل و انصاف۔ یہ دونوں اصول اگر دل میں اتر جائیں تو زبان سے تلخی، ہاتھ سے زیادتی اور رویّوں سے ظلم خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔

یہ مضمون انہی دو قرآنی اصول کی روشنی میں یہ حقیقت واضح کرنے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے کہ اچھا برتاؤ محض نرمی کا نام نہیں بلکہ ذمہ داری، دیانت اور عدل کا حسین امتزاج ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پہ چل کر انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے اور معاشرہ امن، اعتماد اور باہمی احترام کی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے۔

بنیادی طریقے: حسنِ سلوک کی قرآنی اساس

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حسنِ سلوک کی ایسی جامع اور ہمہ گیر تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو انسان کی شخصیت کو محض وقتی نیکی کا خوگر نہیں بناتیں بلکہ اسے اچھے برتاؤ کا ایسا پختہ عادی بنا دیتی ہیں کہ اس کے وجود سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ظلم، زیادتی اور بدسلوکی کا صدور ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان نہ زبان سے کسی کو آزار دیتا ہے، نہ ہاتھ اور قدم سے بلکہ ہر حق دار کا حق ادا کرنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بنیادی حقیقت کی طرف یوں رہنمائی فرماتا ہے: إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ’’بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بیشک اللہ تمہیں بہت ہی عمدہ نصیحت فرماتا ہے اور اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔‘‘ (پ ۵، النساء: ۵۸)

یہ آیتِ کریمہ حسنِ سلوک کے دو بنیادی اور فیصلہ کن اصول ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

(۱) امانتوں کی ادائیگی اور (۲) فیصلوں میں عدل وانصاف۔

جو شخص زندگی کے ہر شعبے میں ان دونوں اصولوں کو حرزِ جاں بنا لیتا ہے وہ نہ صرف اپنی ذات کے ساتھ بلکہ اپنے خاندان، اپنے معاشرے اور اپنی قوم وملت کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حق ادا کرتا ہے۔ ایسے ہی افراد کے طفیل معاشرہ امن، سکون اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے اور یہی افراد معاشرے سے عقیدت، محبت اور عزت واحترام کا صلہ پاتے ہیں۔ آیئے ان دونوں قرآنی اصولوں کی قدرے تفصیل بیان کی جائے۔

امانتوں کی ادائیگی

انسان کے لیے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں کہ خالقِ کائنات نے اسے اپنی نعمتوں کا امین قرار دیا۔ ہاتھ، پاؤں، جسم وجان، اہل وعیال، مال واسباب، حتیٰ کہ دنیا کی ہر متاع اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانت ہے اور انسان اس کا نگہبان ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق استعمال کرے۔

اس اعزاز کی بقا اسی میں ہے کہ انسان اس اعتماد پر پورا اترے جو اس کے رب نے اس پر فرمایا ہے ورنہ یہی اعتماد ٹوٹ جائے تو ذلت وخواری اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس امانت دار افراد ہمیشہ باعزت، باوقار اور بارعب ہوتے ہیں۔ بسا اوقات بڑے بڑے شاہانِ وقت بھی ان کے سامنے سرنگوں نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہر مرحلے پر ان کے شاملِ حال رہتی ہے اور کامیابی وکامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔ بڑے بڑے طوفان ان سے ٹکرا کر گذر جاتے ہیں مگر ان کی استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ وہ ظلم وستم کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں نور بن کر چمکتے ہیں اور بھٹکتے ہوئے انسانوں کے لیے منارۂ نور ثابت ہوتے ہیں۔ جس منزل کی طرف وہ قدم بڑھاتے ہیں منزل خود ان کی طرف بڑھ آتی ہے۔

اسی لیے اللہ رب العزت نے انسانیت کے رہبر ورا ہنما، نبیِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس صفتِ امانت سے اس درجہ آراستہ فرمایا کہ آپ کے دیگر کمالات کے منکر بھی اس وصف کا انکار نہ کر سکے۔

جن زبانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (معاذ اللہ) مجنون اور دیوانہ کہا، انہی زبانوں نے آپ کو ’’الامین‘‘ کہہ کر پکارا اور شدید عداوت کے باوجود اپنی قیمتی امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اعزازِ الٰہی کا حق اس نازک ترین وقت میں بھی ادا فرمایا جب عموماً انسان اپنوں کا حق بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ہجرت کے موقع پہ جب دشمنوں نے مصائب وآلام کے پہاڑ توڑ دیے تھے اور وطن چھوڑنے پہ مجبور کر دیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وطن چھوڑنے سے قبل انہی دشمنوں کی امانتوں کی ادائیگی کا اہتمام فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے محبوب ترین صحابی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے بستر پر سوئیں تاکہ کوئی یہ الزام نہ لگا سکے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری امانتیں لے کر چلے گئے۔

پھر فرمایا: ’’اے علی! جب دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے بستر تک پہنچیں تو بلا تاخیر ان کی امانتیں ان کے حوالے کر دینا‘‘

یہ امانت داری کی وہ بے مثال تاریخ ہے جس پہ انسانیت ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ قرآنِ کریم جن مومنین کو فلاح وکامیابی کی بشارت دیتا ہے ان میں امانت دار افراد بھی شامل ہیں:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ’’اور وہ جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں۔‘‘ (پ۱۸، المؤمنون: ۸)

دوسرے مقام پہ فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ’’اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں۔‘‘ (پ۲۹، المعارج: ۳۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاذ ہی کسی خطبے میں یہ ارشاد نہ فرماتے ہوں: لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ ’’جس میں امانت داری نہیں اس کا ایمان کامل نہیں اور جو وعدہ پورا نہ کرے اس کا دین معتبر نہیں۔‘‘ (مشکوٰۃ شریف)

اسی لیے قرآن وحدیث میں امانت کے ساتھ ایفائے عہد کا ذکر لازم وملزوم ہے کیونکہ وعدہ بھی درحقیقت ایک امانت ہی ہے۔

انصاف کرنا

عدل وانصاف حسنِ سلوک کا دوسرا عظیم اور بنیادی طریقہ ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار اس کا حکم دیا گیا ہے اور یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقسطین یعنی انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○

اور اگر ان میں فیصلہ فرماؤ تو انصاف سے فیصلہ کرو بیشک انصاف والے اللہ کو پسند ہیں۔ (المائدہ: ۴۲)

فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○

تو انصاف کے ساتھ ان میں اصلاح کر دو اور عدل کرو بیشک عدل والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (الحجرات: ۹)

أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ○

ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو بیشک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔ (الممتحنہ: ۸)

انصاف کرنے والوں کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار اپنی محبت کا اعلان فرما رہا ہے۔

عدل کا مفہوم محض دو جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنے تک محدود نہیں بلکہ ہر شخص کو اس کا حق اس طریقے سے دینا عدل ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمایا ہے۔

حاکم کا عدل یہ ہے کہ وہ شرعی قانون کے مطابق حق دار کو حق دلائے اور مجرم کو سزا دے حتیٰ کہ قاتل کو قتل کی سزا دینا بھی عین عدل ہے۔ انفرادی عدل یہ ہے کہ انسان کسی کو اذیت نہ دے اور معاشرے میں محبت والفت کے چراغ روشن کرے۔

باپ کا عدل یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد میں شفقت کا مساویانہ مظاہرہ کرے۔ شوہر کا عدل یہ ہے کہ وہ بیوی کو محبت دے اور اس کی ضروریات پوری کرے۔ بیوی کا عدل یہ ہے کہ وہ شوہر کی عزت اور خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ ماں کا عدل یہ ہے کہ وہ تمام اولاد سے یکساں محبت کرے۔

مختصر یہ کہ ہر فرد عدل کا مکلف ہے اور یہی عدل اسے اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا برتاؤ وہی ہے جو عدل و انصاف کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی شخص شرابی یا جواڑی کی مالی مدد کرے جس کے نتیجے میں وہ مزید شراب پیے یا جوا کھیلے تو بظاہر یہ ہمدردی ہے مگر حقیقت میں یہ ظلم ہے کیونکہ اس سے برائی کو سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت بلیغ انداز میں یوں بیان فرمایا: انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا

ایک صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے، ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟

فرمایا: تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَذَاكَ نَصْرُكَ إِيَّاهُ

''اسے ظلم سے روک دو، یہی اس کی مدد ہے۔'' (بخاری شریف)

ہر برائی ظلم ہے اور برائی کے وسائل مہیا کرنا ظلم میں شرکت ہے۔ ظالم کو ظلم سے روکنا خواہ اس کے لیے سختی ہی کیوں نہ کرنی پڑے درحقیقت اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ اسی لیے بیوی، بچوں یا زیرِ تربیت افراد کو غلط رویے سے روکنے کے لیے وقتی سختی کرنا بھی دراصل ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہی ہے۔

آج کا انسان شاید سب کچھ رکھتا ہے مگر امانت کے بوجھ سے گھبراتا ہے اور انصاف کی راہ سے کتراتا ہے۔ زبان پر اخلاق کے دعوے ہیں مگر عمل کے آئینے میں خودغرضی اور مصلحت کے عکس نمایاں ہیں۔ ہم نے حسنِ سلوک کو مسکراہٹوں تک محدود کر دیا اور عدل وامانت کو کتابوں کے اوراق میں قید کر دیا حالاں کہ قرآن نے انہیں زندگی کے ضمیر کا نام دیا تھا۔ یہی وہ المیہ ہے جس نے فرد کو بےچین، خاندان کو منتشر اور معاشرے کو خوف زدہ کر دیا ہے۔

جب امانتیں اہل تک نہیں پہنچتیں تو اعتماد ٹوٹ جاتا ہے اور جب فیصلے انصاف کے بغیر ہونے لگیں تو دلوں میں بغاوت جنم لیتی ہے۔ پھر نہ زبان محفوظ رہتی ہے، نہ ہاتھ پاک، نہ نیت صاف۔ ظلم کبھی قانون کی وردی پہن لیتا ہے اور کبھی ہمدردی کے لبادے میں چھپ کر آتا ہے اور ہم خاموش تماشائی بن کر خود بھی اس جرم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہی خاموشی سب سے بڑا خیانت نامہ ہے۔

یہی وہ نکتۂ درد ہے جہاں قرآن ہمیں پھر آواز دیتا ہے کہ امانت لوٹاؤ، عدل قائم کرو اور یاد رکھو کہ یہ کوئی اضافی نیکی نہیں بلکہ ایمان کی شرط ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت گواہ ہے کہ دشمنوں کی امانت بھی مقدس ہوتی ہے اور ظالم کو ظلم سے روکنا ہی اصل نصرت ہے۔ کاش ہم اس صداقت آفریں حقیقت کا درست ادراک کر لیں کہ سختی کبھی کبھی سب سے بڑی رحمت بن جاتی ہے۔

آج اگر ہم نے اپنے رویّوں کا محاسبہ نہ کیا، اگر ہم نے اپنے گھروں، اپنے منبروں، اپنی عدالتوں اور اپنی گلیوں میں عدل وامانت کو زندہ نہ کیا تو آنے والی نسلیں ہم سے سوال کریں گی کہ تم نے ایمان کے اس امانتی چراغ کو کیوں بجھنے دیا؟

اور اس سوال کا کوئی جواب اس دن ہمارے پاس نہ ہوگا جب نہ مصلحت کام آئے گی، نہ طاقت، نہ زبان کی چالاکی صرف امانت اور انصاف ہی ہمارے حق میں بولیں گے۔ یہی وقت ہے کہ ہم حسنِ سلوک کو پھر اس کے اصل مقام پر لوٹائیں۔ دلوں کی اصلاح سے شروع ہو کر اعمال کی پاکیزگی تک اور یہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو انسان اور بندے کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا سکتا ہے۔

□□□□

ڈاکٹر محمد امتیاز عالم مصباحی، جمشید پور

حوصلے کی وہ شمع جو آندھیوں میں بھی بجھتی نہیں

تاریخ کے افق پر کچھ نام ایسے طلوع ہوتے ہیں جو صرف واقعات کی گرد میں نہیں جیتے بلکہ صدیوں کے شعور میں چراغ بن کر جلتے رہتے ہیں۔ وہ نام وقت کی کتاب میں محض حروف نہیں ہوتے بلکہ ضمیرِ انسانی کی زندہ تفسیر بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگیاں حادثات کا مجموعہ نہیں بلکہ اقدار کی تشکیل، کردار کی تہذیب اور حق وصداقت کی عملی تعبیر ہوتی ہیں۔

عہد بدلتے رہتے ہیں، سلطنتیں مٹ جاتی ہیں مگر یہ نام دلوں میں باقی رہتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے زمانے کو نہیں بلکہ زمانے کی روح کو مخاطب کیا ہوتا ہے۔ یہ وہ شخصیات ہوتی ہیں جو تاریخ کا حصہ نہیں بنتیں، تاریخ ان سے اپنا مفہوم اخذ کرتی ہے اور آنے والی نسلیں ان کے ذکر سے اپنی سمتِ سفر متعین کرتی ہیں۔ یہ وہ نام ہوتے ہیں جن کی زندگی محض زمانے کی روداد نہیں ایمان کی تفسیر بن جاتی ہے جن کا صبر ماتم نہیں بنتا بلکہ اعلانِ حق ہو جاتا ہے اور جن کی خموشی بھی ظلم کے ایوانوں میں گونج بن کر ٹکراتی ہے۔ عہدِ ابتلا میں جب طاقت، تعداد اور فریب کے سہارے حق کو دبانے کی کوشش کی گئی تو اسی تاریکی میں استقامت کی وہ شمع روشن ہوئی جس کی لو صدیوں بعد بھی بجھ نہ سکی۔ یہ شمع کسی منبر کی محتاج نہ تھی، کسی لشکر کی مرہونِ منت نہ تھی، یہ شمع ایک ماں کے سینے میں جلتی تھی، ایک عورت کے یقین میں دھڑکتی تھی، ایک مؤمنہ کے لہجے میں بولتی تھی۔ یہ وہ نور تھا جو خوف کے شور میں دب نہ سکا جو زخموں کی آندھی میں بھی لرزاں نہ ہوا۔

جس کے سامنے جبر کی دیواریں بے معنیٰ ہو گئیں اور ظلم کے ہتھیار بے اثر ٹھہرے۔ اس کی طاقت بازوؤں میں نہیں یقین کی گہرائی میں تھی، اس کا ہتھیار تلوار نہیں بلکہ توکل، صبر اور رضا تھا۔ وہ خاموش تھی مگر اس کی خاموشی خطبوں سے زیادہ بلیغ اور اس کی ثابت قدمی لشکروں سے زیادہ وزنی تھی۔ یوں ایک عورت کا ایمان تاریخ کے ایوانوں میں گونج بن گیا اور اس کا صبر آنے والی نسلوں کے لیے حوصلے، وقار اور حق پر ڈٹ جانے کا استعارہ بن کر رہ گیا۔

یہ داستان صرف ایک بیٹے کی شہادت کی نہیں یہ ماں کے ایمان کی فتح کی داستان ہے۔ یہ نوحہ نہیں، نصیحت ہے یہ ماتم نہیں، معیار ہے یہ شکست نہیں، سربلندی کا اعلان ہے۔ یہاں آنسو نہیں بہتے، عزم بولتا ہے۔ یہاں گریبان نہیں چاک ہوتے، تاریخ کا گریبان تھاما جاتا ہے۔ یہاں شکست کا ماتم نہیں ہوتا یہاں حوصلے کی تجدید ہوتی ہے۔ یہاں سسکیاں نہیں سنائی دیتیں یہاں یقین کی صدا بلند ہوتی ہے۔ یہ مقام فریاد کا نہیں، فیصلے کا ہے، کمزوری کا نہیں، وقار کا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں آنکھیں نم نہیں ہوتیں بلکہ سمت دکھاتی ہیں اور ہاتھ لرزتے نہیں بلکہ عہد باندھتے ہیں۔ یوں فرد کی استقامت تاریخ کے سینے پر نقش بن جاتی ہے اور وقت خود گواہی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حق کو دبایا جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا۔ آیئے اس افسانوی نثر میں اُس استقامت کی دہلیز پر قدم رکھیں، جہاں عورت کمزور نہیں، میزانِ حق ہے، جہاں ماں صرف رونے والی نہیں راستہ دکھانے والی ہے۔ یہاں عورت حالات کی اسیر نہیں، ماحول کی تشکیل و تعمیر کرنے والی ایک فولادی عزم رکھنے والی مقدس صنف ہے۔

یہاں ماں آہوں کی علامت نہیں، نسلوں کی تربیت اور تاریخ کی معمار ہے۔ یہاں شہادت ماتم کا عنوان نہیں، بیداری کی دستک اور انقلاب کی تمہید ہے۔ یہاں لہو زمین میں جذب نہیں ہوتا، شعور میں اتر جاتا ہے اور زمانے کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ یوں کردار جنس سے

نہیں ناپا جاتا، ایمان سے پہچانا جاتا ہے اور حق کی گواہی زندگی کے بعد بھی زندگی عطا کرتی رہتی ہے، یہاں شہادت اختتام نہیں، آغاز بن جاتی ہے۔

مدینہ منورہ کی گلیوں میں جب ایمان نے آنکھ کھولی تو کچھ گھر ایسے تھے جن کی دہلیزیں صداقت سے روشن تھیں۔ انہی میں ایک گھر حضرت سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا تھا وہ گھر جہاں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے آنکھیں کھولیں اور آنکھیں کھولتے ہی صبر، غیرت اور خودداری کا درس سیکھا۔ وہ صرف ایک صحابیہ نہیں تھیں ہمت و جرأت کی وہ پیکر تھیں جن کی پیشانی پر یقین کی مہر ثبت تھی اور جن کے لہجے میں حق کی گونج۔ جن کی نگاہ میں خوف کی کوئی جگہ نہ تھی اور جن کے قدم استقامت کی زمین پر جمے ہوئے تھے۔ زمانہ جن کے سامنے سوال بن کر کھڑا ہوا وہ جواب بن کر ابھریں۔ یوں ایک مؤمنہ کا کردار لفظوں سے بلند ہو کر تاریخ کے اوراق میں نہیں، ضمیرِ انسانیت میں محفوظ ہو گیا۔ یہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تھیں جنہوں نے اپنے لختِ جگر حضرت عبد اللہ بن زبیر کو محض بازوؤں کی طاقت نہیں، دل کی بے خوفی عطا کی۔ ان کی گود تربیت گاہ بنی جہاں شجاعت دودھ کے ساتھ پلائی گئی اور استقامت لوری بن کر کانوں میں اتری۔

جہاں کمزوری کا لفظ تربیت کے لغت میں شامل نہ تھا اور خوف کو ایمان کے لمس سے مٹا دیا گیا تھا۔ جہاں بچوں کو کہانیاں نہیں، کردار ورثے میں ملے اور ماں کی گود پہلی درسگاہ بنی۔ وہاں پرورش جسم کی نہیں، ضمیر کی ہوتی تھی اور نسلیں سانس کے ساتھ حوصلہ پیتی تھیں۔ یوں ایک گھر نہیں، ایک عہد تیار ہوا جو زمانے کے ہر طوفان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا رہا۔ ماں نے بیٹے کو یہ سبق دیا کہ عزت کے ساتھ جینا بھی عبادت ہے اور حق پر مرنا بھی۔

وقت نے کروٹ لی۔ مکہ معظّمہ کے افق پر ظلم کے بادل چھائے۔ حجاج بن یوسف کے لشکر نے شہرِ امن کا محاصرہ کیا اور منجنیقوں سے پتھر برسانے لگا۔ کعبہ معظّمہ کے سائے میں کھڑا ایک مردِ مومن، تنہا مگر ثابت قدم، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نماز میں مشغول جیسے آسمان سے مدد اترنے کا انتظار ہو، دل دعا میں بھی ثابت قدم اور نگاہ یقین سے روشن ہو۔ نہ شکوہ لبوں پر، نہ لرزش قدموں میں بس بھروسہ اس وعدۂ الٰہی پر جو کبھی ٹلتا نہیں۔ خاموش لمحوں میں بھی امید سانس لیتی ہو اور صبر عبادت کی صورت اختیار کر لے۔ یوں انتظار کمزوری نہیں رہتا، ایمان کی وہ کیفیت بن جاتا ہے جس میں بندہ زمین پر کھڑا رہتے ہوئے بھی آسمان سے ہم کلام رہتا ہے۔ پھر تلوار نیام سے نکلی اور تنہا شیر لشکر پہ ٹوٹ پڑا۔ جنگ ختم ہوئی تو فتح نہیں، آزمائش اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ ماں کے پاس آیا وہ ماں جس کی آنکھوں کی روشنی جا چکی تھی مگر بصیرت سلامت تھی۔ سوال سادہ تھا مگر فیصلہ تاریخ ساز: ''امان قبول کروں یا شہادت؟''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا جواب لرزا دینے والا تھا: ''کمینے فاسق کی پیروی نہ کر، شہادت کی عزت اختیار کر۔ تیرے دن کا آخری حصہ پہلے سے زیادہ باعزت ہونا چاہیے۔''

جب بیٹے نے لاش کی بے حرمتی کا اندیشہ ظاہر کیا تو ماں نے حوصلے کی ضرب لگائی: ''دنبہ ذبح ہو جائے تو کھال اتارنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔''

یہ جملہ نہیں تھا، یہ ایمان کی منطق تھی جو دلیل سے نہیں، یقین سے بولتی ہے۔ جو حالات کے ترازو میں نہیں تولی جاتی بلکہ حق کی میزان پر پوری اترتی ہے۔ یہ وہ منطق تھی جو کمزوری کو قوت، تنہائی کو نصرت اور خاموشی کو اعلان بنا دیتی ہے۔ یوں الفاظ پیچھے رہ جاتے ہیں اور ایمان خود اپنا مقدمہ پیش کر دیتا ہے جس پر وقت بھی خاموشی سے مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ پھر وہ لمحہ آیا جب ماں نے بیٹے کو آخری بار سینے سے لگایا۔ یہ وداع آنسوؤں کی نہیں، یقین کی تھی۔ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی آواز گونجی، موت کے بادل، صبر کے بازو، تلواروں کا ہدف اور تاریخ نے دیکھ لیا کہ ہمت کا قافلہ تنہائی سے نہیں ڈرتا۔ یہ کہتے ہی وہ مردِ تنہا تقدیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ تلوار کی چمک حرم کی فضاؤں میں بجلی بن کر لپکی۔ وہ ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھتا گیا اتنا کہ دشمن حرم شریف کی دہلیز سے باہر جا گرے۔ جب وہ سب مل کر حملہ آور ہوتے تو اس کی جوابی یلغار ایسی ہوتی کہ صفیں بکھر جاتیں، قدم ڈگمگا جاتے۔ پھر زخموں نے بدن کو گھیر لیا یا شاید منجنیق کا ایک پتھر پیشانی پر لگا اور وہ زمین پر آ رہا۔ لمحے بھر میں دشمن لپکے اور شہادت کی مہر ثبت ہو گئی۔ لاش کو بیت اللہ کی دیوار پر سولی دے دی گئی، جیسے حق کو سرِ بازار آزمانا ہو۔

حجاج نے کہا: ''یوں ہی لٹکا رہنے دو، دیکھوں تو سہی ماں کیا کہتی ہے!'' اسے یقین تھا کہ آنسو بہیں گے، نوحے اٹھیں گے، گریبان چاک

ہوں گے۔ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ صبر بھی ایک سلطنت ہے اور بعض عورتوں کے سینوں میں شیروں جیسی روحیں دھڑکتی ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ جہاں ایمان نگہبان ہو وہاں آہیں ہتھیار نہیں بنتیں اور جہاں یقین حاکم ہو وہاں ماتم تقدیر نہیں بدلتا۔ اس نے کمزوری کو عورت کا مقدر سمجھا تھا مگر وہ اس حقیقت سے ناواقف رہا کہ بعض ماؤں کی خاموشی تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہے۔ وہ زخموں کو شکست کا نشان جانتا تھا اسے خبر نہ تھی کہ یہی زخم آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ بن جاتے ہیں۔ یوں اس کی فہم کی دیوار وہیں ڈھہ گئی جہاں ایک مؤمنہ کے صبر نے اعلان کر دیا کہ اصل طاقت بازوؤں میں نہیں، روح کے وقار میں ہوتی ہے۔ جب حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کعبہ معظّمہ کی سمت سے گذریں اور مردوں کے سروں کے اوپر اپنے بیٹے کو سولی پر دیکھا تو وہ لرزیں نہیں، وہ بلند ہو گئیں۔ ماں بولی مگر لہجہ شیرنی کا تھا، حواس سلامت تھے، یقین کامل۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیٹے نے حق کی نصرت میں جامِ شہادت نوش کیا ہے اور ثابت قدمی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو چکا ہے۔

انہوں نے کہا: ''اَمَا آنَ لِھٰذَا الْفَارِسِ اَنْ یَّتَرَجَّلَ؟''
کیا اس شہسوار کے گھوڑے سے اترنے کا وقت نہیں آیا؟

یہ خبر پہنچی تو حجاج بن یوسف ششدر رہ گیا۔ حکم ہوا کہ عبداللہ بن زبیر کے جسدِ خاکی کو دفن کر دیا جائے۔ یوں سنہ ۶۴ ھ کی اس روح فرسا ساعت نے تاریخ پر ایک ایسی لکیر کھینچ دی جو مٹ نہ سکی۔

یہ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیض یافتہ طالبہ تھیں جن کی گود نے شیروں کو جنم دیا۔ اپنے ایمان کی صداقت سے انہوں نے آنے والی ماؤں کے لیے عزت و خودداری کی راہیں کھول دیں اور دنیا کو استقامت اور عظمتِ انسانی کا سبق پڑھایا۔ انہوں نے تاریخ کے اوراق میں ایماندار عورت کا وقار بلند کیا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ بعض عورتیں بہت سے مردوں سے بلند ہو جاتی ہیں۔

آج اگر تہذیب و ثقافت کی دلدادہ عورت کو حضرت اسماء اور حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے آئینے میں پرکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ سچ ہی کہا گیا ہے:

إِذَا كَانَ النِّسَاءُ كَمَنْ فَقَدْنَا
لَفُضِّلَتِ النِّسَاءُ عَلَى الرِّجَالِ

اگر عورتیں ویسی ہی ہوں جیسی ہم کھو چکے ہیں
تو عورتیں بہت سے مردوں پر سبقت لے جائیں گی۔

یہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا ورثہ ہے، خاموش نہیں، سربلند، شکستہ نہیں، ثابت قدم، رونے والا نہیں، راستہ دکھانے والا۔

یوں یہ داستان آنسوؤں پر نہیں، یقین پر تمام ہوتی ہے۔ یہاں ماتم کی صدا نہیں اٹھتی بلکہ صبر کی گونج تاریخ کے ایوانوں میں دیر تک سنائی دیتی ہے۔ سولی پر لٹکا ہوا جسم وقت کی آنکھوں میں کانٹا بن جاتا ہے مگر ماں کا ایمان فاتح ٹھہرتا ہے۔ ظلم اپنے تمام ہتھیار آزما کر بھی ایک سچے دل کی شکست رقم نہیں کر پاتا۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے یہ ثابت کر دیا کہ عورت کی عظمت اس کی کمزوری میں نہیں اس کے یقین میں ہے، اس کے آنسوؤں میں نہیں اس کے وقار میں ہے۔ انہوں نے دنیا کو سکھایا کہ شہادت پر صبر کرنا بھی ایک جہاد ہے اور حق پر خاموشی سے کھڑے رہنا بھی اعلانِ حق ہوتا ہے۔ ان کی استقامت نے حجاج کے غرور کو بے آواز شکست دی، ایسی شکست جس کا اعلان تاریخ نے خود کیا۔

آج جب طاقت کے معیار بدل گئے ہیں اور عزت کو سہولت کے ترازو میں تولا جاتا ہے یہ واقعہ ایک آئینہ بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تہذیب کی اصل روح ملبوسات میں نہیں، کردار میں ہے اور ثقافت کی پہچان نعرہ نہیں، قربانی ہے۔ جن گھروں میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جیسی مائیں پروان چڑھتی ہیں وہاں حضرت ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ جیسے کردار جنم لیتے ہیں اور قومیں اسی نسبت سے زندہ رہتی ہیں۔

یہ انجام نہیں ایک پیغام ہے کہ حق وقتی طور پر سولی پر چڑھایا جا سکتا ہے مگر سرنگوں نہیں کہ ماں اگر مومن ہو تو تاریخ کی سمت بدل دیتی ہے اور ایمان جب صبر سے ہم رشتہ ہو جائے تو وہ داستان بن کر نہیں، ہدایت بن کر زندہ رہتا ہے۔ ایسی ہدایت جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی، جو نسلوں کے رویّوں میں سانس لیتی ہے اور کردار کی صورت چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ یہ وہ وراثت ہے جو خون سے نہیں، یقین سے منتقل ہوتی ہے، جو آنکھوں میں خواب نہیں، ضمیر میں چراغ جلاتی ہے۔ جہاں ماں کی دعا تقدیر کا نقش بدل دیتی ہے اور اس کی تربیت وقت کے جبر پر غالب آ جاتی ہے۔

یوں ایک عورت کا ایمان صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ صدیوں کے سفر میں انسانیت کے لیے راستہ بن کر روشن رہتا ہے۔

□□□□

ڈاکٹر عزیز احسن
abdulazizkhan49@gmil.com
Whatsapp: 0092-318-8093456
مکان نمبر: A-12، بلاک 13، گلستانِ جوہر، کراچی، پاکستان (پوسٹل کوڈ: 75290)

نعتیہ شاعری، ادب، احتیاط اور تقاضے!

(دوسری قسط)

قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کو بڑا ''ظلم'' قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت ۶۸)

ترجمہ: میں نے حضور ﷺ کی محبت میں ایسے ایسے اشعار دیکھے ہیں کہ سلبِ ایمان کا خطرہ پیدا ہو گیا، مثلاً قمر جلالوی کا ایک شعر ہے:

محمد عرش پر بیٹھے ہیں چپ، خالق یہ کہتا ہے
تمہارا گھر ہے اپنے گھر میں شرمایا نہیں کرتے (ہلال جعفری، کشکول ہلال، بزم شعروادب، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۴۰)

اس شعر میں، شاعر نے پورے کا پورا مصرع (تمہارا گھر ہے اپنے گھر میں شرمایا نہیں کرتے) [نعوذُ باللہ] اللہ تعالیٰ کا قول بنا دیا۔ ایسے ہی اشعار یا اقوال پر ''اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کا ظلم ثابت ہوتا ہے''۔

ایک شاعر کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کسی متن کو قرآنی متن قرار دینا کس قدر قبیح فعل ہے؟ وہ لکھتا ہے:

ہیں حسن اور حسین گلشنِ زہرا کے دو پھول
جن کو قرآں نے کہا لولو و مرجانِ رسول ﷺ

(پروفیسر محمد طاہر صدیقی، کلیات نعت، فیصل آباد، ۲۰۲۲ء صفحہ ۲۴۰)

اس شعر کا پہلا مصرعہ بے وزن بھی ہے.....قرآنِ کریم میں کہیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ حضرات حسنین کو لولو و مرجان رسول ﷺ کہا گیا ہو۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی نے تفسیری نوٹ میں لکھا ہے: ''یعنی بحیرہ روم و بحیرہ فارس سے موتی، مونگے نکلتے ہیں اس صوت میں تاویل کی ضرورت نہیں یا میٹھے و کھاری سے نکلتے ہیں تو معنیٰ ہیں ان کے بعض یعنی صرف کھاری ہے جیسے کہا جاتا ہے نر و مادہ سے بچہ پیدا ہوتا ہے...... صوفیاء فرماتے ہیں کہ روح و قلب سے موتی مونگے نکلتے ہیں۔ حضرت علی و فاطمہ زہرا سے حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین موتی مونگے کی طرح پیدا ہوئے''۔ (مفتی احمد یار خاں نعیمی، نور العرفان، صفحہ ۸۴۹)

اس موقع پر مفسر نے پہلے تو سورہ الرحمٰن ۵۵، کی آیت ۲۲ ''يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ'' کی ممکنہ تفسیر کی ہے پھر صوفیاء کا قول نقل کیا ہے۔ صوفیاء نے بھی محض تشبیہی پہلو سامنے رکھا ہے۔ براہِ راست قرآنی متن میں اپنے اس خیال کا عکس نہیں دیکھا ہے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی محبت میں غلو کی یہ بہت ہی خطرناک مثال ہے۔ شاعر موصوف نے صوفیاء کے قولِ مجہول کو قرآنِ کریم کے متن سے جوڑ دیا۔ یہ بہت بڑی اور ناقابلِ قبول جسارت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کے حوالے سے ایک تنبیہی بات فرمائی ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (الحاقۃ ۶۹، آیات ۴۴-۴۶)

(اگر وہ [محمد ﷺ] خود گڑھ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگِ دل) (الحاقہ ۶۹، آیات ۴۴-۴۶، ترجمہ پیر کرم شاہ ازہری)

حضور ﷺ کی صداقت کی تصدیق ، اس آیتِ کریمہ سے خوب خوب ہو رہی ہے۔ کیوں کہ اپنی طرف سے گڑھ کے بات کرنا تو کجا، حضور ﷺ کے لیے ایسا سوچنا بھی محال تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پیرائے میں بات فرما کے آپ ﷺ کی سچائی پر مہرِ تصدیق ثبت فرمادی۔ ہاں کسی کاذب مدعیٔ نبوت یا عام آدمیوں کے لیے یہ تنبیہ ہرگز نہیں تھی کیوں کہ عام جھوٹے انسانوں کے اعمال و افعال کا حساب کتاب دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹے مدعیانِ نبوت کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ہاتھوں فی النّار کروایا۔ از خود دنیا میں کوئی سزا نہیں دی۔ غلام احمد قادیانی کو جو کُھل کھیلنے کا موقع ملا وہ دنیاوی مہلت تھی۔ آخرت تو اس کی خراب ہی ہونی تھی جو ہو گئی۔

بہر حال حمد و نعت گو شعراء کو قرآن و احادیث کی تنبیہات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

بعض شعراء نعتیہ کلام کے ساتھ کچھ مناقب بھی لکھتے ہیں یہ ایک اچھی روش ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے منقبت نویسی کی آڑ میں کچھ لوگ اپنے تفضیلی نظریات پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رشید وارثی نے اپنے مجموعۂ نعت میں کیا ہے۔ انہوں نے، عبداللہ ابن سبا کے اختراعی نظریۂ امامت کی خوب خوب تبلیغ کی ہے۔ ایک منقبتی شعر میں کہتے ہیں:

امامت میں علی مولیٰ ہیں نائبِ مولیٰ کُل کے
خلافت کے ضمن میں سبقتِ صدیقِ اکبر ہے

(رشید وارثی، خوشبوئے التفات، بزم وارث ۱/ ۱۹۰/ قصر وارث، شاہ فیصل کالونی، کراچی، مئی ۲۰۰۴ء، صفحہ ۶۷)

اس شعر میں دو مسئلے ملفوظی اسقام سے متعلق ہیں اور ایک مسئلہ شعر کے متن، نفسِ مضمون یا مافیہ سے تعلق رکھتا ہے:

☆ 'مولیٰ کُل' کی ترکیب میں مولا کا الف گر گیا۔

☆ 'ضمن' میں 'میم' متحرک ہو گیا جو ساکن ہے۔ اس 'ضِمن' میں میرؔ کا شعر ملاحظہ ہو:

حیف وہ بے تہ نہ رکھے جو کہ تیری دوستی
اک وِلا کے ضِمن میں تیری ہزاروں میں ثواب

اب آیئے مسئلۂ 'امامت' کی طرف۔ یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے، اس لیے پہلے اس مسئلے کا پس منظر اور پھر سوادِ اعظم اہلِ سنّت کے مسلمہ عقائد کی روشنی میں اس ناچیز کی معروضات۔

قرآنِ کریم میں لفظ ''امام'' غالباً چھ مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ ھود، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ فرقان اور سورۂ احقاف۔ رشید وارثی کے اس شعر میں نظریۂ امامت کو اہلِ تسنن کا مقبول نظریہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو چودہ سو برس سے اہلِ سنت و جماعت نے قرآن و سنّت اور اجماعِ امت بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم کے طرزِ عمل کی روشنی میں جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا پا کر رد کر دیا تھا۔ امامِ اہلِ سنّت مجدد ملت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی کے یہ اشعار خود حضرت رشید وارثی نے بھی اپنے ایک مضمون میں نقل فرمائے ہیں:

اے عدوئے کفر و نصب و رفض و تفضیل و خروج
اے علوئے سنتِ دینِ ہدیٰ امداد کن
ناصبی را بغضِ تو سوئے جہنم رہ نمود
رافضی از حبِ کاذب در سقر در آمدہ

اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی نے سلام میں بھی لکھا:

اوّلیں دافعِ اہلِ رفض و خروج
چارمی رُکنِ ملت پہ لاکھوں سلام
ماحیِ رفض و تفضیل ونصب و خروج
حامیٔ دین و سنت پہ لاکھوں سلام

ان اشعار کی شرح میں مولانا غلام حسین قادری لکھتے ہیں:

(شعر ۱۴۵) سیدنا علی شیر خدا نے سب سے پہلے رافضیوں اور خارجیوں (دشمنانِ صحابہ و اہلِ بیت) کے ساتھ با قاعدہ جنگ کر کے ان کے فتنوں کا قلع قمع فرمایا اور ملتِ اسلامیہ کے چوتھے خلیفۂ راشد اور دین کا مضبوط ستون بن کر مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی اور بڑی جرأت سے ساری عمر فتنوں کا مقابلہ فرماتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان پہ کروڑوں سلام ہوں'' (شرح حدائق بخشش، صفحہ ۱۰۶۸)

(شعر ۱۴۷) رافضیت و خارجیت چاہے وہ ناصبیت کی شکل میں ہو یا تفضیلیت کی شکل میں، ان تمام کی بدعقیدگیوں کا خاتمہ کر کے دینِ اسلام اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ کی حمایت کرنے والے مولیٰ علی پہ لاکھوں سلام'' (الحافظ القاری مولانا غلام حسن قادری، شرح کلام رضا---شرح حدائق بخشش، مشتاق بک کارنر، لاہور، صفحہ ۱۰۶۹)

اہلِ تشیع کا دعویٰ ہے کہ عقیدۂ امامت پر ایمان لائے بغیر ایمان نامکمل ہے۔ حال آں کہ پورے قرآنِ کریم میں عقیدۂ امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (محمود اشرف، عقیدۂ امامت اور حدیث غدیر، مکتبہ دارالعلوم کراچی، فروری ۱۹۹۹ء، صفحہ ۲۱)

''پورے معتبر ذخیرۂ حدیث میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں ملتی جس میں اُن بارہ ائمۂ معصومین کا ذکر کیا گیا ہو جن کے بارے میں شیعہ عقیدۂ امامت کے قائل ہیں'' (ایضاً)

دراصل معاملہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے دنیا سے بظاہر پردہ فرمانے کے بعد متعدد کاذب مدعیانِ نبوت پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اہلِ اسلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی میں ان کا قلع قمع کر دیا۔ ایسی صورت میں نبوت کے تسلسل کا نظریہ پیش کرنے میں تو عبداللہ ابن سبا کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اس کے خلاف باقاعدہ جنگ کر کے، اس نظریے اور اس کے ایجاد کنندہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ اس لیے اس نے نظریۂ ''امامت'' پیش کر کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلا امامِ معصوم قرار دیا اور پھر اس کے پیروکاروں نے بارہ اماموں کو معصوم عن الخطاء مان لیا...... ہمیں رافضیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن اہلِ سنت میں گُھسے ہوئے تفضیلیوں اور نیم رافضیوں کے باطل نظریات کی ضرور بیخ کنی کرنی ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ اب سنیوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو نعت کی آڑ میں رفض پھیلا رہے ہیں۔ ''نعت'' صرف اور صرف حضور ﷺ کی تعریف و توصیف کے لیے وقف ایک صنفِ سخن ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور اہلِ بیتِ کرام و ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہن کے لیے جو اشعار کہے جاتے ہیں ان کو ''منقبت'' کہا جاتا ہے۔ لیکن ایک صاحب کہتے ہیں:

حسن، حسین و علی و زہرا
سبھی کی نعتیں سنا رہا ہوں
ہے کام مشکل کشائی جن کا
علی کی نعتیں سُنا رہا ہوں
ولایتوں کے ہر ایک مظہر
ولی کی نعتیں سُنا رہا ہوں (پروفیسر محمد طاہر صدیقی، کلیات نعت، نعت، پوسٹ بکس نمبر ۲۵، فیصل آباد، اکتوبر ۲۰۲۲ء، صفحہ ۶۷)

اہلِ تشیع کی پیروی میں حضراتِ اہلِ بیت کے لیے غلو آمیز اشعار لکھنا بعض اہلِ سنّت و جماعت کے افراد نے بھی اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ منقبت کے درجِ بالا اشعار کو ''نعت'' قرار دینا بھی اسی اصول پر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حسنینِ کریمین رضوان اللہ عنہم اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نبی علیہ السلام کے درجے کے مساوی درجہ (Equal Status) دے دیا جائے اور نبی علیہ السلام کی انفرادیت اور اسلام کے مسلّم منہج ''رسول ﷺ مرکزیت'' سے امت کو ہٹا دیا جائے۔

نعتیہ کلام میں خیالی مضمون آفرینی سے کذب کا عنصر بھی پیدا ہو رہا ہے۔ بیشتر شعراء قبر، حشر، قیامت اور حساب کتاب کو ''واقعہ'' بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں ذرا خیال نہیں آتا کہ کائنات کے سب سے سچے انسان اور رسول ﷺ کے حضور وہ کس قدر دریدہ دہنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چند مثالیں:

مخدوم غضنفرؔ عباس ہاشمی کی تصنیف ''مُستنیر عالم ہوا'' میں پائے گئے چند اشعار دیکھیے:

محشر بپا تھا جونہی شافعِ حشر آئے
ہوگئے رہا غضنفرؔ جرم و قصور والے

ایک تو شعر کی بنت بہت ناقص ہے۔ دوسرے اس بیان سے ایسا لگ رہا ہے جیسے شاعر آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو!...... یہ شعر کذب پر مبنی ہے......ص ۲۲

کُھلے بامِ ارم رب کی طرف سے تب غضنفر پر
لحد میں جب نکیروں کو تیری مدحت سنائی ہے

(ص ۲۴)

☆ یہاں دوسرے مصرعے میں ''تیری'' پڑھنے سے شعر کا وزن ساقط ہو گیا۔ ترِی ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا لکھا ہے ویسا پڑھنا پڑے گا۔ بات یہاں بھی فکشن (Fiction) پر مبنی ہے۔ اصل حقیقت ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے جھوٹے اشعار کہنے والے کا تو ایمان بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔

میں غضنفرؔ قبر کی تاریکیوں میں غرق تھا
آپ نے رکھا قدم نوری اُجالا کردیا

(ص ۷۰)

☆ کیا یہ شعر سچائی پر مبنی ہو سکتا ہے؟؟؟

مرقد مرا ہے گلشنِ رضواں بنا ہوا
میں بے خبر ہوں قبر کی وحشت کدھر گئی

(ص ۹۳)

☆ صریح جھوٹ......فکشن

وہ حسنِ کائنات جونہی جلوہ گر ہوئے
جنت کی خوشبو میری لحد میں بکھر گئی

(ص ۹۳)

☆ خوشبو کے تلفظ میں تخفیفِ صوت ہے۔ متن جھوٹا ہے۔

میں گِھر گیا تھا چاروں طرف سے عذاب میں
آقا ملے تو نور سے مرقد نکھر گئی

(ص ۹۳)

☆ فکشن......جھوٹا افسانہ۔

نور الہدیٰ کا عکس غضنفرؔ پڑا تو پھر
عیبوں سے کالی قبر اجالوں سے بھر گئی

(ص ۹۴)

☆ کذبِ بیاں......محض فکشن۔ خیالی پلاؤ۔

اے نکیرو، ذرا چپ رہو
میرا وقتِ ملاقات ہے

(ص ۱۲۴)

☆ کیا کسی مرحوم کو قبر میں اس طرح کی صورتِ حال میں نکیرین کو خاموش رہنے کا حکم دینا نصیب ہوگا؟ شاعر تو ابھی مادی دنیا میں ہے۔ یہ بھی محض کذب بیانی ہے......محض فکشن ہے۔ (مخدوم غضنفر عباس ہاشمی، ''مستنیر عالم ہوا'')

میاں منیر احمد منیرؔ کی تصنیف ''جمالِ نعت'' میں اس طرح کے اشعار ہیں:

کب تک ترے عاصی پہ رہے دھوپ کڑی
اے ظلِ کرم حشر کے میدان میں آ

(ص ۴۳)

☆ شعر خیالی دنیا کی سیر کا عکاس ہے۔ شاعر پر حشر کا عالم نہیں گذرا۔ اس نے صرف تصور کر لیا کہ میدانِ محشر میں کھڑا ہے اور وہاں سے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بلا رہا ہے۔ یہ تو نِرا فکشن (Fiction) ہوا۔ نعت تو سچائی کی متقاضی ہوتی ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس طرح بُلانا بھی سوءِ ادب ہے۔

ملتا ہے وہ سُرور، نہ ہو پائے جو بیاں
جب چومتا ہوں جالی سے اپنے لگا کے ہاتھ

(ص ۹۴)

☆ جالی کی ''ی'' ساقط ہوئی۔ عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ روضۂ انور پر حاضر ہوتے ہیں انہیں جالیوں سے ہاتھ مس کرنے کا موقع دیا ہی نہیں جاتا ہے۔ یہ مضمون بھی خیالی ہے، جھوٹا ہے۔

حروفِ نعت زندگی کا انتساب ہو گئے
ہم عاصیاں بروزِ حشر کامیاب ہو گئے

(ص ۳۶۵)

ہوا جو اک اشارۂ شفاعتِ شفیعِ حشر
رواں بہ خلد عاصیاں بلا حساب ہو گئے

(ص ۳۶۵)

☆ یہ نعتیہ شاعری ہے یا حشر کا رپورتاژ (Reportage) یہ سب اشعار خیالی دنیا میں کہے گئے ہیں۔ حشر کا روز تو ابھی شاعر نے

دیکھا ہی نہیں۔تمنائی لہجہ ہوتا تو ان اشعار کے متون (Texts) پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔(میاں منیر احمد منیر، جمال نعت)

زبان و بیان:

دنیا بھر میں شاعری کے لیے فصیح زبان استعمال کی جاتی ہے۔ غیر فصیح زبان میں جو شعر ڈھلے وہ سخن فہم لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔نعتیہ شاعری اس لیے زیادہ فصاحت کی متقاضی ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ کائنات کی فصیح ترین ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نذر کیا جاتا ہے۔عرب ہزاروں برس سے خود کو زبان دان اور خوش بیان کہتے آئے تھے اور ان کی نظر میں باقی ساری دنیا کے لوگ عجمی (گونگے) تھے۔زبان کے ضمن میں ان کی حساسیت کا یہ عالم تھا کہ ایک نئی نویلی دلہن شبِ عروسی میں اپنے شوہر سے صرف اس لیے برگشتہ ہوگئی کہ اس کی زبان سے کوئی محاورہ بے محل نکل گیا تھا۔اس واقعے کو جعفر طاہر نے اپنی کتاب ''ہفت کشور'' میں عربوں کی لسانیاتی دانش ظاہر کرنے کی غرض سے نظم کیا تھا......نظم میں شاعر،عربوں سے مخاطب ہے:

مرے رفیقو!
بُرا نہ مانو تو بات پوچھوں
بتوں سے یہ رسم و راہ کیا ہے؟
یہ کیسا آئینِ دلبری ہے؟
یہ دوستی ہے تو کافری کیا ہے؟
دیکھتا ہوں
بتوں کو تم اب رسول کہنے لگے ہو
کانٹوں کو پھول کہنے لگے ہو
اپنی زباں کو اپنے ادب کو پامال کر رہے ہو
کہاں وہ دن
جب شبِ زِفاف اک عروس نے
اپنے شوہرِ نامدار سے
اک محاورہ بے محل سنا تو
حریر و دیبا کی خلوتوں سے نکل کے بھاگی
تڑپ کے چیخی
''قبیلے والو!
عرب نہادو!
یہ شخص میری زباں کی توہین کر رہا ہے
یہ واجب القتل ہے کہ آدابِ لفظ و معنی سے بے خبر ہے'' (جعفر طاہر، ہفت کشور، گلڈ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی، جولائی ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۳۹)

عرب کے اسی ماحول میں حضور ﷺ نے اپنی فصاحت کا لوہا منوایا تھا۔آپ کی نبوت کے انکار کے باوجود کبھی کسی نے آپ ﷺ کی زبان دانی کے حوالے سے حرف گیری کی جرأت نہیں کی۔کیوں کہ زبان دانی کے جوہر آپ ﷺ کی گفتگو سے کھل رہے تھے اور سارے عرب کو اس فصاحت پر رشک آ رہا تھا۔

نعتیہ شاعری میں جہاں متن (Text) کی ''واقعیت'' لازمی ہے وہیں زبان کی فصاحت بھی ضروری ہے۔شاعر کسی بھی زبان میں نعت کہے، ضروری ہے کہ اس زبان کے معیاراتِ فصاحت کا خیال رکھے۔اردو لغات میں کسی بھی لفظ کے تلفظ کو جانچنے اور اس کے درست ہونے کے لیے سند کے طور پر ہمیشہ ''اشعار'' ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ اب اردو نعت میں زبان کے بے محل اور انتہائی غلط استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک بہت معتبر شاعر، عارف عبدالمتین کے شعر میں بھی زبان کی انتہائی درجے کی غلطی سامنے آئی:

تری حدیث ترے رو برو سناؤں تجھے
یہ آرزو ہے کبھی آئینہ دکھاؤں تجھے

(عارف عبدالمتین، بے مثال)

☆ پہلے مصرعے میں ''ترے روبرو'' کہنے کے بعد ''تجھے'' کی گنجائش نہیں تھی۔ ''تجھے'' حشو ہے۔

☆ حضور ﷺ کو اُن کی حدیث سنانے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کو کوئی بات یاد دلائی جائے۔گویا کوئی ایسی بات یاد دلائی جائے کہ [نعوذ باللہ] آپ ﷺ کے عمل سے اس بات کی نفی ہو رہی ہو!

☆ آئینہ دکھانے کا مطلب ہے ''عیب ظاہر کرنا''......مومن خاں مومن کہتے ہیں:

سیاہ رو نہ کرے ترک الفتِ گل فام

میں بوالہوس کو دکھاؤں ہزار آئینہ

ان معروضات کی روشنی میں عارف عبدالمتین کا شعر ''مَدْح'' کی بجائے ''قَدْح'' یا ''ذَم'' کا عکاس بن گیا۔ اللہ تعالیٰ شاعر کی لسانی غلطی معاف فرمائے۔ (آمین)

امید فاضلی نے کہا:

جنہیں خبر ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِدھر سے گذرے ہیں

وہ آسمان کو سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں (امید فاضلی، مرے آقا)

آسمان سر پر اٹھانے کا مطلب تو ''شور شرابا کرنا'' ہوتا ہے۔ جیسے رندؔ نے کہا تھا:

شور و شر کرتے ہیں یہ ہستیٔ دو روزہ پر

آسماں اہلِ زمیں سر پہ اٹھا لیتے ہیں

(رندؔ)

دیکھیے اس شعر میں، محاورے کی کس قدر بھیانک غلطی ہوئی ہے۔

مزید تفصیلات میں جائے بغیر اب صرف یہ درخواست کر کے رخصت چاہوں گا کہ نعت گو شعراء نعتیہ شعری کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے لسانیاتی (Linguistic)، متنی (Textual) اور اسلوبی (Stylistic) تقاضوں کو پیشِ نظر رکھیں تا کہ نعتیہ شاعری کو ادب العالیہ کا حقیقت پسندانہ ظہاریہ بنایا جا سکے۔ قرآن وسنت سے متصادم متون کی شعری بنت سے ایمان خطرے میں پڑتا ہے۔ لسانیاتی کجی سے زبان بگڑتی ہے......اور......اسلوبی حُسن سے عاری بیان، شاعری کے لیے سمِّ قاتل ہے۔ جب تک یہ تمام تقاضے پورے نہیں کیے جاتے، قابلِ قبول نعتیہ شاعری، نہیں ہو سکتی...... عام شاعری کے لیے صرف یہ ضروری ہے ''کیسے کہا گیا ہے''...... ''کیا کہا گیا ہے'' سے عام شاعری کا کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ اِس شاعری میں تو خوابناک بیان، واہموں، فریبِ نظر اور جنسی خواہشات کا شعری اظہار بھی قابلِ قبول بلکہ مستحسن سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسی، مادر پدر آزاد شاعری کو سُرریل ازم (Suurealism) سے جوڑ دیں تو مغرب زدہ ناقدین اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔

□□□□

(صفحہ 35 کا باقی حصہ۔۔۔)

دینی درد کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس چیلنج کو محض فکری مناظرے کا مسئلہ نہ سمجھیں بلکہ اسے روحانی بحران کے طور پہ دیکھیں۔ کیونکہ الحاد صرف خدا کے انکار کا نام نہیں یہ انسان کو اس کے رب سے کاٹ کر اس کی روح کو یتیم کر دینے کی ایک منظم کوشش ہے۔ اس فکر کے زیرِ اثر انسان کائنات میں بے مقصد، تاریخ میں بے سمت اور زندگی میں بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ جب آسمان سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو زمین پر قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور ضمیر کی روشنی عقل کی چالاکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

الحاد انسان کو آزادی کا فریب دے کر دراصل اسے خواہشات، مفادات اور طاقت کے غیر مرئی بتوں کے سامنے جھکا دیتا ہے، جہاں نہ جواب دہی باقی رہتی ہے اور نہ اخلاق کی کوئی دائمی بنیاد۔ یوں انسان بظاہر خود مختار دکھائی دیتا ہے مگر باطن میں ایک ایسی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے جس کا کوئی مداوا مادّی ترقی بھی نہیں کر پاتی۔

جب خدا دل سے نکلتا ہے تو رحم، عدل، حیا اور جواب دہی کا احساس بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو جاتا ہے اور یہی وہ خلا ہے جس میں ظلم فلسفہ بن جاتا ہے اور انا کو تقدس عطا کر دیا جاتا ہے۔ آج امتِ مسلمہ سے مطالبہ یہ نہیں کہ وہ شور میں شور ملائے بلکہ یہ ہے کہ وہ علم میں گہرائی، فکر میں توازن اور لہجے میں وقار کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کرے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کا دفاع چیخ کر نہیں بلکہ صداقت بیانی کی خاموش قوت سے کیا جاتا ہے۔ وہ خدا جس نے کہا ہے: ''ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود انسانوں کے نفس میں بھی'' وہ اپنی دلیل خود ہے مگر بندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس دلیل کے آئینہ دار بنیں۔ یہ اختتام نہیں، ایک آغاز ہے، ایمان کی تجدید کا، فکر کی تطہیر کا اور اس عہد کی تجدید کا کہ ہم خدا کے تصور کو نہ خوف سے چھپائیں گے، نہ معذرت کے لہجے میں پیش کریں گے بلکہ یقین، محبت اور ذمہ داری کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھیں گے۔ کیونکہ جو قوم خدا کو سینے میں چراغ بنا کر رکھتی ہے، وہ فکری تاریکیوں سے نہیں ڈرتی، وہ انہیں روشن کرنے کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔

□□□□

مولانا عبدالمتین ضیائی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
amzeyai@gmail.com

صدرالافاضل: علم وعرفان کا نیر تاباں

ایک ایسے قلم کا نذرانۂ عقیدت جو فراموش شدہ تاریخ کو بیداری میں بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے صفحات پہ کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے دھندلکوں میں کھو نہیں جاتے، بلکہ زمانہ ان کے فیضان سے اپنی سمت پاتا ہے۔ انہی آفتابِ علم وفضل میں ایک درخشاں نام ہے، صدرالافاضل حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز کا۔ وہ جنہوں نے علم کو عبادت کا درجہ دیا اور قلم کو منبرِ تبلیغ بنایا۔ ان کی تحریروں سے جہاں فہمِ قرآن کی روشنی پھوٹی، وہیں عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو نے دلوں کو معطر بھی کیا۔

کتاب کا نام:	سوانح صدرالافاضل
مصنف ومؤلف:	مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی ککرالوی
رابطہ :	نوری دارالافتاء، مدینہ مسجد، محلہ علی خان، کاشی پورہ، اتراکھنڈ
صفحات :	جلد اول، ۷۳۰، جلد دوم ۷۰۰
سن اشاعت:	۱۴۴۳ھ/ 2022ء
ہدیہ :	درج نہیں
ملنے کے پتے:	سنی پبلیکیشنز، دہلی
	مکتبہ نعیمیہ مرادآباد، جامعہ نعیمیہ مرادآباد

حالیہ دنوں میں مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی کی یہ روشن تالیف، ایک علمی وروحانی کارنامہ بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ محض ایک سوانح نہیں بلکہ ایک تاریخی مرقع، فکری تجزیہ اور روحانی مطالعہ ہے جس میں حضرت صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کی حیاتِ مبارکہ ان کے علمی کمالات، فقہی بصیرت، سیاسی شعور، جماعتی تصور، تفسیری اجتہاد اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لبریز طرزِ نگارش کو جس دلآویزی اور تحقیق کے امتزاج سے پیش کیا گیا ہے وہ اردو دینی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کتاب یاد دلاتی ہے کہ علم اگر اخلاص سے ہم رشتہ ہو تو تحریر بھی عبادت بن جاتی ہے اور تحقیق اگر محبت سے مزیّن ہو تو کتاب بھی ذکرِ اولیاء کی تصویر بن جاتی ہے۔

صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کی زندگی دراصل اسی امتزاج کا تابناک نمونہ ہے، جہاں عقل دلیل سے سیراب ہوتی ہے اور دل عشق سے معمور۔

اس علمی خدمت کا خیر مقدم ہے، کیونکہ ایسے کارنامے محض شخصیت کی نہیں، فکر کی تجدید کا اعلان ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اہلِ علم کے لیے رہنمائی اور طالبانِ حق کے لیے روشنی کا مینار ہے۔

اے باوقار قاریو!

جب آپ یہ صفحات پلٹیں گے تو محسوس کریں گے کہ یہاں الفاظ نہیں، انوار بولتے ہیں، یہاں تحقیق کا ہر جملہ تسبیح بن کر گنگناتا ہے اور عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر حرف دل کے گوشوں میں صلاۃ وسلام کی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔ یہ کتاب صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں، دراصل علم وعشق کے ایک عہد کی تجدید ہے اور یہ نوٹ اسی عہد کی ادبی وروحانی سلامی ہے۔

تاریخ کے افق پہ جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو کچھ چہرے ایسے دکھائی دیتے ہیں جن کے فیضانِ علمی وفکری سے زمانہ اب تک روشن ہے۔ انہی میں ایک نام صدر الافاضل حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وہ عالم جنہوں نے فکر کو یقین کا لباس پہنایا اور علم کو عشق کی خوشبو میں بسا دیا، ان کی علمی وروحانی زندگی محض درس و تدریس کا باب نہیں بلکہ ایک ایسا عہد ہے جس نے امت کے ذہن و

ضمیر کو قرآن و سنّت کی روشنی میں درست سمت عطا کی۔ انہوں نے اپنے قلم سے علم و عرفان کے جو چراغ جلائے وہ آج بھی دینی فکر کی پیشانی پہ روشنی بن کر جگمگا رہے ہیں۔

مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی کی یہ تالیف اسی روشنی کا عکس ہے، ایک ایسا تحقیقی و تاثراتی سفر جو صرف شخصیت کی سوانح نہیں بلکہ ایک پورے فکری عہد کا بیان ہے۔ یہ کتاب یاد دلاتی ہے کہ صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز محض ایک مفسر یا فقیہ نہیں تھے بلکہ وہ ایک ایسی روحانی تحریک کے ترجمان تھے جس نے علم کو محبت اور تحقیق کو عقیدت میں ڈھال دیا تھا۔

بیسویں صدی کا ابتدائی نصف ہندستان میں اسلام کی علمی و فکری تاریخ میں ایک ایسا دور ہے جب مذہب صرف مصلحت کا مظہر نہیں، بلکہ تحریک اور تجدید کا محرک بن چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منبر سے محراب تک اور مدرسے سے معاشرے تک ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی، علم کو عشق کی روشنی میں زندہ رکھا جائے۔

اسی فکری ارتعاش کے درمیان صدرالافاضل علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز کا ظہور ہوا۔ آپ نے جس بصیرت سے قرآن کی تفسیر، حدیث کی تشریح اور عقائد کی توضیح فرمائی اس نے نہ صرف علمی روایت کو تازگی بخشی بلکہ دین کی فکری اساس کو عوام و خواص دونوں کے دلوں میں از سرِ نو مستحکم کر دیا۔

ان کی نگارشات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ علم کو محض نصابی اور مناظرانہ دائرے تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اسے روحِ ایمان کے طور پہ دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک عالم وہ نہیں جو صرف حوالہ جات سے بات کرے، بلکہ وہ ہے جو معرفت کے چراغ سے قلوب کو منور و تابناک کرے۔ اسی لیے ان کے یہاں علم و عرفان کا امتزاج ایک نئی تہذیبی زبان میں ڈھل کر سامنے آتا ہے جس میں استدلال کی صلابت بھی ہے اور عشقِ رسالت مآب ﷺ کی لطافت بھی۔

اسی دور میں جب علمی و اعتقادی میدان میں نئے طوفان اٹھ رہے تھے تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ العزیز نے ایمان و علم کی وہ شمع روشن کی جس کی تابانی نے پورے عہد کو نور بار کر دیا۔ اس فیضانِ رضوی سے جن خوش بختوں کے دل و دماغ روشن ہوئے، ان میں حضرت صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کا نام صفِ اوّل میں نظر آتا ہے۔ آپ اعلیٰ حضرت کے ان منتخب تلامذہ میں سے تھے جنھیں امام اہلِ سنّت کے علمی دربار کے نورتنوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یقیناً وہ ایک گوہرِ نایاب تھے جنھوں نے اعلیٰ حضرت کے علم و عرفان کے چراغ کو اپنے زمانے میں فروزاں رکھا۔

امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی دبستان سے فیض حاصل کرنے کے بعد جن شخصیات نے برصغیر میں علم و عمل، فکر و بصیرت کے آفاق روشن کیے ان میں صدرالافاضل کا نام اور کام آفتاب علم و فضل کی مانند درخشاں و تاباں ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت کے منتخب تلامذہ میں سے تھے جنھیں علمی و فکری وراثت کا امین بنایا گیا، ان کی تربیت امام احمد رضا کے فیضانِ صحبت سے ہوئی وہ محض ایک روایت پسند شاگرد نہیں بلکہ علم رضا کے ترجمان اور افکار رضا کے شارح بنے، امام احمد رضا نے اپنے تلامذہ میں جس علمی توازن، دینی بصیرت اور فقہی استقامت کو پروان چڑھایا اس کی ایک روشن مثال صدرالافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی کی ذات و شخصیت ہے۔

صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت اس سدا بہار شجر کی مانند ہے جس کی جڑیں امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں پیوست ہیں اور جس کے پھل آج بھی علمی و روحانی ذائقے عطا کر رہے ہیں ان کی علمی خدمات و فکری مرکزیت کا مطالعہ دراصل امام احمد رضا قادری بریلوی کے فیضِ دوام کا مطالعہ ہے ایک ایسا فیض جو حدود زمان و مکان سے اوپر اٹھ کر آج بھی علم و عشق کی روشنی تقسیم کر رہا ہے۔

صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد و استاذ کی تعلیمات کو صرف ذہن میں محفوظ نہیں کیا بلکہ روح میں جذب کر کے قلم میں منتقل کیا۔ انہوں نے رضوی مکتبِ فکر کو دلائل کی قوت، تفسیر کی گہرائی اور عشقِ مصطفوی ﷺ کی روشنی میں اس طرح پروان چڑھایا کہ وہ ایک مستقل علمی و روحانی مکتب کی صورت اختیار کر گیا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ وہ محض مفسر نہیں بلکہ مبلغِ فکرِ رضوی تھے، ایک ایسے عالم جنہوں نے عقل کی جولانی کو عشق کی حضوری میں سمیٹا اور علومِ دینیہ کو زبانِ دل عطا کی۔

مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی ککرالوی نے اپنی تالیف میں اسی روحانی اور علمی تسلسل کو نہایت باریک نکتہ شناسی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مفتی صاحب کی پیش کردہ یہ تصنیف اپنے معنوی سفر کا آغاز کرتی ہے۔ وہ صدر الافاضل قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت کو محض تاریخی تناظر میں نہیں بلکہ روحانی تداوم کے ایک زندہ تسلسل کے طور پہ دیکھتے ہیں گویا ماضی کی روشنی حال کے شعور میں سانس لے رہی ہو۔

تاریخ کے اوراق پہ جب نگاہ پڑتی ہے تو ایک سرد خموشی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شخصیات، جنہوں نے ملت کی کشتی کو طوفانوں میں ساحلِ نجات تک پہنچایا اور وہ چراغ، جنہوں نے ظلمتوں میں روشنی کے مینار روشن کیے، رفتہ رفتہ گردِ فراموشی کے نیچے دب گئے۔ تاریخ کی سطور اکثر سلاطین کی تلواروں اور فاتحین کے نقوش سے مزین ہیں مگر ان اہلِ علم وعرفان کا ذکر کم ملتا ہے جنہوں نے اپنے فکر و قلم سے امت کے زخموں پہ روحانیت کا مرہم رکھا، اس کے ایمان کی اساس کو محفوظ بنایا۔

وقت کے فراموش کردہ انہی درخشندہ ناموں میں ایک نام صدرالافاضل حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔ صدرالافاضل کا تذکرہ آتا ہے تو ذہن میں محض ایک عالمِ دین کا تصور نہیں اُبھرتا، بلکہ ایک ایسی ہمہ گیر اور مردِ قلندر شخصیت سامنے آتی ہے جس نے اپنے عہد کے فکری و علمی چیلینجیز کا شجاعانہ مقابلہ کیا۔ وہ قلم کے سچے مجاہد تھے، جنہوں نے فرنگی فکر کے فتنوں، وہابیت کی سختیوں اور اہلِ بدعات کے اعتراضات کے درمیان اہلِ سنّت کے ایوان کو استقامت، عزت اور فکری سرفرازی بخشی۔

ان کی تصانیف، ان کے مقالات اور ان کی علمی تگ ودو وہ سرمایہ ہیں جنہوں نے اہلِ سنّت کے نوجوانوں اور علما دونوں کو حق کی راہ پہ استقامت عطا کی۔ وہ صرف ایک مصنف نہیں بلکہ ایک تحریک تھے، صرف ایک مقرر نہیں بلکہ ایک ترجمان اور محض ایک مدرس نہیں بلکہ خود ایک ادارہ تھے، وہ عہد ساز تھے۔ ان کی ذات میں قلم کی آبرو، علم کی روشنی اور فکر کی بلندی یکجا تھیں۔ ان کا وجود اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ قوموں کی بقا تلواروں سے نہیں بلکہ علم وفکر کی قوت سے ہوتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ایسے نابغۂ روزگار کا ذکر ہمارے نصابِ علم و کتابِ دل سے رفتہ رفتہ مٹنے لگا ہے۔ ہماری علمی محافل ان کے نام سے خالی ہیں، گویا مورخ کی غفلت اور قوم کی بے توجہی نے اس درخشندہ ستارے پہ ایک دبیز پردہ ڈال دیا۔ یہ وہ ناسپاسی ہے جو آنے والی نسلوں کے سامنے ہمیں شرمندگی سے دوچار کرے گی۔ کیا یہ انصاف ہے کہ وہ درویش باصفا، جس نے اپنی زندگی اہلِ سنّت کی عظمت کے لیے وقف کر دی، آج ہماری نگاہِ خیال سے اوجھل رہے؟

یہ تحریر دراصل ایک ناتواں دل کی پکار ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو یاد کریں، ان کے تذکروں سے اپنے دلوں کو منور کریں۔ کیونکہ جو قوم اپنے علما کو بھلا دیتی ہے، وہ خود تاریخ کے سمندر میں گم ہو جاتی ہے۔

صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کا نام علمی تاریخ کے ان میناروں میں سے ہے جن سے آج بھی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کا ذکر زندہ رکھیں اور اپنی نسلوں کو بتائیں کہ یہ تھے وہ رہنما جنہوں نے علم وایمان کے چراغوں سے امت کی راہیں روشن کیں۔

مفتی محمد ذوالفقار نعیمی کی یہ تصنیف لاریب احیائے شعور کا اعلان ہے۔ دو ضخیم جلدوں پہ مشتمل تصنیف دراصل صدرالافاضل کے علمی و فکری قد کے اعتراف اور ان کی خدمات کے احیاء کا سنہری باب ہے۔ یہ کتاب محض ایک تعارف نہیں، بلکہ ایک علمی واخلاقی تلافی ہے۔ اس ناسپاسی کی جس نے ہمارے محسنوں کو پردۂ فراموشی کے پیچھے ڈھکیل دیا۔

علم کے آسمان پہ کچھ ستارے ایسے بھی طلوع ہوتے ہیں جو اپنی روشنی سے صرف درسگاہوں کو نہیں، بلکہ دلوں کو منور کرتے ہیں۔ مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی ککرالوی ایسی ہی ایک علمی وروحانی شخصیت ہیں، جن کے قلم کی روشنائی میں اخلاص کی حرارت، فکر کی گہرائی اور ملت کا درد یکجا

ہو گیا ہے، وہ ایک ذی استعداد مدرس، باصلاحیت عالمِ دین اور جماعتی شعور رکھنے والے دردآشنا مفکر ہیں، جن کے سینے میں امت کی تڑپ اور اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ موجزن ہے۔ ان کی طبیعت میں تدریس کی سنجیدگی، تحقیق کی جستجو اور تحریر کی روانی فطری طور پہ جمع ہیں۔ آپ کا قلم محض نوکِ قرطاس پہ نہیں چلتا، بلکہ دل کے آئینے پہ لکھتا ہے۔ ان کے الفاظ میں علم کی وقار آمیز چمک بھی ہے اور درونِ دل کی وہ لطافت و پاکیزگی بھی جو محبت رسول ﷺ سے جنم لیتی ہے۔ وہ ان اہلِ قلم میں سے ہیں جو لکھتے وقت زمانے کے مزاج کو نہیں دیکھتے، بلکہ حق کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کی ضخیم اور محققانہ تصنیف ''سوانحِ صدرالافاضل'' دراصل ان کے اندر چھپے ہوئے روحانی محقق اور محبت آمیز عالم کا آئینہ ہے۔ یہ کتاب صرف ایک علمی خدمت نہیں، بلکہ تجدیدِ فکر کے ایک روشن عہد کی علامت ہے۔ اس میں سیرت و سوانح کا بیان محض واقعات کی ترتیب نہیں بلکہ روح کی تاریخ کی قرأت ہے، ایک ایسی تاریخ جو عشقِ رسول ﷺ کے لہو سے لکھی گئی ہے۔

مصنف کا اندازِ تحریر دل نشیں بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔ وہ جب لکھتے ہیں تو الفاظ دعاؤں میں ڈھل جاتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو خطابت میں صداقت کی خوشبو رچ بس جاتی ہے۔ ان کی شخصیت علم و عمل کا حسین امتزاج ہے، جہاں مدرسے کا درس بھی ہے، محراب کی للکار بھی اور جماعت کی خیر خواہی بھی۔

درحقیقت وہ ان اصحابِ قلم میں سے ہیں جن کے فکر میں اصلاح کا جذبہ، اسلوب میں ادب کی لطافت اور دل میں دین کی حرارت برابر رواں دواں ہے۔

ان کی تصنیف ''سوانح صدرالافاضل'' کی ضخیم مجلدات قاری کو محض عبارت نہیں دیتیں بلکہ ایک فکری و روحانی سفر میں شریک کرتی ہیں۔ ان کے اوراق میں جہاں صدرالافاضل کی علمی عظمت جھلکتی ہے، وہیں ہماری تاریخ کی غفلت پہ ایک محبت آمیز سرزنش بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر صفحہ قاری سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو: ''یہ وہ ہستی تھی جسے تم نے نظرانداز کیا مگر وہ علم کے ایوانوں میں تاقیامت زندہ رہے گی۔''

صاحب کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں انہوں نے محض سوانحی خاکہ نہیں بلکہ صدر الافاضل کی فکری جہات، تصنیفی بصیرت، تفسیر و حدیث میں مہارت اور اہلِ سنّت کے دفاع میں ان کے ہمہ جہتی کردار متوازن انداز میں پیش کیے ہیں۔ یہ وہ کام ہے جو صرف دردِ دل رکھنے والے قلمکار کے حصے میں آتا ہے۔

کتاب کا ادبی اسلوب ایک روحانی تاثیر رکھتا ہے۔ نہ یہ خشک تذکرہ ہے نہ محض لفاظی، بلکہ حقیقت اور تاثیر کا حسین امتزاج ہے۔ قاری جب اس کے اوراق الٹتا ہے تو اسے محض معلومات نہیں ملتیں بلکہ قلبی روشنی نصیب ہوتی ہے۔ یہ تصنیف ایک دعوت ہے کہ آؤ اپنے بزرگوں کو پہچانو، ان کے تذکرے سے دلوں کی دھڑکن میں ایمانی حرارت پیدا کرو اور ان کی یاد سے اپنی سمت درست کرو۔

مفتی محمد ذوالفقار نعیمی نے جیسے صدر الافاضل کے تذکرے کو محفوظ کیا ہے، وہ آنے والی نسلوں کے لیے معیار و سند ہے۔ یہ گویا بوسیدہ تاریخ پہ تازہ روشنائی پھیرنے کا عمل ہے، ایک ایسا چراغ جو نسلوں کو یہ باور کراتا ہے کہ محسن فراموشی علمی بنیادوں کے انہدام کا پیش خیمہ ہے۔ کتاب کے ہر صفحے میں ایک خموش سوال ہے: ''کیا تم اپنے محسنوں کو یاد رکھنے کا ظرف رکھتے ہو؟'' اور ساتھ ہی ایک جواب بھی: ''یہ تصنیف اس اسلاف فراموشی کا کفارہ ہے، ایک علمی صدقۂ جاریہ جس کا فیض دیر تک قائم رہے گا۔''

تحقیق، اسلوب اور فکری اعتدال

مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی ککرالوی نے اس کتاب میں تحقیق کا وہ معیار پیش کیا ہے جو اعلیٰ دینی تحقیق کی پہچان ہے۔ مراجع و مصادر کی وسعت کے ساتھ صحت و استناد کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر قول اور واقعہ معتبر حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ کتاب محض عقیدت کا سرنامہ نہیں بلکہ علمی دستاویز بن گئی ہے۔

تحقیقی انداز میں جذباتیت کی بجائے عقل و استدلال کی متانت نمایاں ہے۔ مصنف نے حضرت صدر الافاضل کے مقام کو شخصی عقیدت نہیں بلکہ علمی معیار سے جانچا اور پرکھا ہے۔

دونوں جلدیں اہلِ سنّت کے فکری ورثے کو زندہ کرنے کی ایک منصوبہ بند کوشش ہیں۔ مصنف نے صدر الافاضل کی حیات کے حوالے سے موجودہ فکری کمزوریوں اور تاریخی تغافل پہ بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب یاددلاتی ہے کہ شخصیات کا ذکر تعظیم نہیں بلکہ فکری تسلسل کی حفاظت ہے، یہ تصنیف جماعتی شعور کے احیاء کی منظم تحریک ہے، نوجوانوں کے لیے فکری بیداری کا آئینہ اور علما کے لیے منصبِ علم کی یاد دہانی۔ اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ صفحوں کے اندر ایک خاموش فکری تحریک رواں ہے، جو دلوں کو مقصد کے شعور سے معمور کرتی ہے۔

اس کتاب میں احترامِ شخصیت اور معروضیتِ تحقیق کا حسین توازن برقرار ہے۔ نہ علم کا وقار جذبات کی روانی کو روکتا ہے، نہ عشق کی شدت علم وفکر کے توازن کو بگاڑتی ہے۔ اردو دینی ادب میں ایسی تحقیقی کاوشیں کم ہی ملتی ہیں جن میں تحقیق، جذبہ اور اسلوب اس ہم آہنگی کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔

تاریخ کے سفر میں کچھ کتابیں ایسی لکھی جاتی ہیں جو صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ احساس وذمہ داری کا آئینہ بن جاتی ہیں۔ وہ قاری سے محض مطالعہ نہیں بلکہ مکالمہ چاہتی ہیں۔ مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی کی یہ کتاب بھی انہی میں سے ہے۔

اس کے صفحات میں صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ کے افکار ونظریات کی روشنی بھی ہے اور امت کے فراموش کردہ شعور کی صدا بھی۔ یہاں ہر سطر گویا ایک آئینہ ہے جس میں تاریخ اپنے گم شدہ چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔ قاری جب ان الفاظ کے درمیان سانس لیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ یہ محض تحریر نہیں، ایک زندہ روایت کی دھڑکن ہے، جہاں علم عبادت بن جاتا ہے اور عشق بصیرت اختیار کر لیتا ہے۔ قاری یہاں صرف ایک بزرگ کا تذکرہ نہیں پڑھتا بلکہ اپنی علمی تاریخ کی بازگشت سنتا ہے۔

یہ کتاب محض دو جلدوں کا علمی کارنامہ نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری تجدید کا اعلان ہے۔ اس کے اوراق میں علم کی خوشبو بھی ہے اور ایمان کے زخموں پہ مرہم بھی، یہ کتاب عقل کو روشنی دیتی ہے اور دل کو یقین کی حرارت، اس کے صفحات میں علم کا وقار بھی ہے اور عشق کا سرور بھی۔ یہاں تاریخ محض ماضی نہیں، حال کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ یہ کتاب ذہن کو بیدار کرتی ہے اور دل کو جھکنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس کے حرفوں میں تحقیق کی صداقت بھی ہے اور عقیدت کی لطافت بھی، یہ تحریر ماضی کی شہادت بھی ہے اور مستقبل کی بشارت بھی، اس کے جملوں میں علم کی ژرف نگاہی بھی ہے اور دردِ ملت کی صدائے خموش بھی، اس کے صفحات میں تاریخ کی صداقت سانس لیتی ہے اور وجدان کی گرمی اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے، یہ کتاب فکر کی سمت بھی درست کرتی ہے اور احساس کی گہرائی بھی بڑھاتی ہے۔

صاحب کتاب نے جس محبت، خلوص، عرق ریزی، وسعتِ مطالعہ اور فکری دیانت کے ساتھ صدر الافاضل قدس سرہٗ العزیز کی حیات وخدمات کے تاریخی گوشے پیش کیے ہیں، وہ دراصل امت کے فکری سفر کی نئی منزل ہے۔

یہ تصنیف اس بات کی دلیل ہے کہ جب دل عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منور ہو اور قلم خلوصِ علم سے تروتازہ، تو تحریریں تاریخ نہیں بلکہ زندہ امتیں تشکیل دیتی ہیں۔ یہ تحریر حضرت صدر الافاضل قدس سرہٗ العزیز کی یادگار کے وسیلے سے امت کو اس کے فکری رشتے، علمی تسلسل اور جماعتی وقار سے مربوط کرنے کی سنجیدہ کوشش ہے۔ ہمیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اہلِ حق کے تذکرے محض ماضی کی یاد نہیں بلکہ حال کی بیداری اور مستقبل کی سمت طے کرتے ہیں۔

افسوس کہ اس جاں فشانی اور عرق ریزی پہ جماعتِ اہلِ سنت کے زندہ ضمیر اربابِ علم وفضل کی جانب سے جس حوصلہ افزائی کی توقع تھی، وہ کتاب کی اشاعت کے بعد نظر نہیں آئی۔ شاید ہمارے ذوقِ مطالعہ نے بھی سبکدوشی اختیار کر لی ہے اور علم کی خوشبو اب صرف تعزیتی تقریروں میں محسوس کی جاتی ہے۔ کتاب چھپ گئی، لیکن قاری شاید ابھی پیدا نہیں ہوا۔ عہدِ حاضر کی یہی داستان ہے کہ کتابیں اب الماریوں میں نہیں، دلوں سے غائب ہیں شاید یہی ہماری علمی ترقی کی تازہ تعریف ہے۔ کبھی جماعتِ اہلِ سنّت کی تاریخ میں اہلِ علم کو تاج پہنائے جاتے تھے، اب ان کی کتابوں پہ گرد جمائی جاتی ہے۔ ہم نے

اس دور میں ایک نیا دستور بنالیا ہے: علماء کی قربانیوں کا اعتراف تقریروں میں محفوظ کرلیا جائے، عملی زندگی میں نہیں۔

ہمارے عہد کے اہلِ قلم کے لیے سب سے بڑا انعام اب خاموشی ہے کیونکہ داد دینے کا حوصلہ فیس بُک کے ایک ''لائک'' میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ علم دوستی کا چراغ ہم نے بجھایا نہیں، بس موبائل کی روشنی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ وہ زمانہ ہے جہاں کتابوں کی محنت پہ تعریف نہیں، تعجب کیا جاتا ہے۔ کبھی اہلِ علم کی تحریریں ایمان جگاتی تھیں، اب ایمان بیدار ہو تو تحریر سو جاتی ہے اور یہی وہ المیہ ہے جو علم کی روشنی کو دھیرے دھیرے زوال کے اندھیروں میں بدل دیتا ہے۔ اللہ کریم ہمیں دوبارہ وہ بینائی عطا فرمائے جو علم کی حرمت پہ جھکنے والے دلوں میں ہوتی تھی۔ ہماری جماعت کو وہ احساس نصیب ہو جو اہلِ حق کی میراث تھی اور ہمارے قلم کو وہ جرأتِ صداقت واپس ملے جو کبھی منبر و محراب سے امت کے دلوں میں ایمان کی حرارت جگاتی تھی۔ کتابوں کی گرد جھاڑنے کا حوصلہ ہمیں عطا ہو، تاکہ علم کے وہ چراغ جو خموشیوں میں ٹمٹما رہے ہیں، دوبارہ روشنی دینے لگیں۔

صاحبِ کتاب نے اپنے قلم سے یہ ثابت کردیا کہ ابھی چراغِ علم بجھے نہیں، ابھی دامنِ ملت میں وہ روشنی باقی ہے جو عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے منور دلوں میں جلتی ہے، ابھی ایمان کی خوشبو مٹی سے رخصت نہیں ہوئی ہے، ابھی عشقِ رسول ﷺ کی حرارت دلوں میں زندہ ہے۔ ان کی یہ تصنیف محض تحقیق کی داستان نہیں بلکہ ایمان کی بیداری اور شعورِ امت کی تازہ تعبیر ہے، یہ ماضی کی محض ایک بازیافت نہیں، بلکہ مستقبل کی تعمیر کی دعوت ہے۔ ہر صفحہ گواہی دیتا ہے کہ علم اگر اخلاص کے دامن میں پروان چڑھے اور تحقیق عشق کی خوشبو میں بھیگی ہو، تو تحریر صرف ماضی کی یاد نہیں رہتی بلکہ آنے والے کل کا پیغام بن جاتی ہے۔

یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ امتیں ماضی کے تذکروں سے نہیں، اپنے صالح اسلاف کی فکری وراثت سے جیتی ہیں۔ صاحبِ کتاب نے صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کی حیات و خدمات کو نہ صرف تاریخ کے آئینے میں روشن کیا بلکہ ایمان کے چراغ سے منور کر دیا۔ یہ کام محض علمی کاوش نہیں بلکہ عشق و درد کا زندہ ترجمہ ہے۔

افسوس کہ ہمارے عہد کی بے حسی نے ایسے رجالِ علم کے قدموں کے نشان مٹانے کی کوشش کی ہے، اب جہاں کتابیں چھپتی ہیں وہاں قاری غائب ہے اور جہاں علم کے چراغ جلتے ہیں، وہاں روشنی دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ہم نے اہلِ علم کی قربانیوں کا اعتراف تقریروں میں محفوظ کرلیا ہے، مگر عمل کی دنیا ان کے پیغام سے خالی ہے۔ لیکن امید ابھی زندہ ہے۔ جب تک ایسے صاحبِ درد قلم کار موجود ہیں جو امت کے زخموں پہ علم اور عشق دونوں سے مرہم رکھتے ہیں، زوال کے اندھیروں میں بھی طلوعِ فجر کا یقین باقی ہے۔

دعا ہے کہ مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی کا یہ علمی و فکری کارنامہ جماعتِ اہلِ سنت کے لیے شعور کی بیداری کا سنگِ میل بنے، ان کے قلم میں صداقت کی تابندگی قائم رہے، ان کی فکر کو دوام اور ان کی کاوش کو قبولیتِ ربانی نصیب ہو، انہوں نے تحقیق و تفتیش کے اس مرحلے سے گذرتے ہوئے خاموش الفاظ میں پیغام دیا ہے کہ جو قوم اپنے علما کا احترام کھو دیتی ہے، وہ اپنی فکری بنیادوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

پروردگار ہمیں وہ بینائی واپس عطا فرمادے جو علم کی تعظیم میں جھکے ہوئے دلوں کی پہچان تھی اور وہ جرأتِ حق بخش دے جو منبر و محراب سے ایمان کی حرارت جگایا کرتی تھی۔

مولائے کریم! مؤلفِ موصوف کی یہ مخلصانہ کاوش اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور اسے ان کے لیے صدقۂ جاریہ اور اہلِ علم کے لیے تسلسلِ خیر و ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ موصوف کی یہ کاوش ہمارے اس عہدِ غفلت میں فکری بیداری اور علمی تجدید کا پیش خیمہ ثابت ہو اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم ماضی کی روشنی کو حال کے شعور میں سانس لیتا ہوا دیکھ سکیں، ربِ قدیر اہلِ سنّت کی علمی روایت کو ہمیشہ تازگی، وقار اور بقا عطا فرمائے۔

یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا وہ چراغ ہے جو نہ صرف صدرالافاضل قدس سرہٗ العزیز کی یاد زندہ رکھے گا بلکہ امت کو اپنے ماضی سے وفاداری اور مستقبل سے امید کا سبق بھی دیتا رہے گا۔

□□□□

پرویز عالم، یونٹ ہڈ روزنامہ قومی تنظیم لکھنؤ
parwezqtd@yahoo.com

خموش سطور کی اذان

نام کتاب	:	مجلہ الکوثر، شمارہ دوم
مدیر اعلیٰ	:	مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی
صفحات	:	ایک سو
ہدیہ	:	درج نہیں
ملنے کا پتا	:	دارالعلوم خیریہ نظامیہ بارہ دری، سہسرام
رابطے	:	7050055786/9892471264
ای میل	:	parwezqtd@yahoo.com

ہر عہد کی ایک زبان ہوتی ہے اور ہر دور کا ایک منبر۔ جب منبر مسجد کی چہار دیواری تک محدود ہو جائے اور خطبے کی آواز زمانے کے شور میں دبنے لگے تو تاریخ نے قلم کو منبر عطا کیا اور صحافت کو دعوت کا وسیلہ بنایا۔

مذہبی صحافت دراصل اسی تسلسل کا نام ہے--- یہ نہ محض خبر ہے، نہ صرف تبصرہ بلکہ یہ ایمان کی ترجمانی، ضمیر کی بیداری اور حق کی شہادت ہے یہ وہ چراغ ہے جو فتنوں کی دھند میں سمت کا تعین کرتا ہے جو طاقت کے ایوانوں میں حق وصداقت کی دستک بن کر گونجتا ہے اور مظلوم کی خاموش آہ کو لفظوں کی قبا عطا کرتا ہے۔ یہ دلوں میں خوف نہیں، حوصلہ جگاتی ہے، مایوسی کے اندھیروں میں امید کی شمع روشن کرتی ہے اور یاد دلاتی ہے کہ قلم جب امانت بن جائے تو وہ محض لکھتا نہیں--- قوموں کی تقدیر سنوارتا ہے۔

مذہبی صحافت دراصل اسی تسلسل کا نام ہے--- یہ نہ محض خبر ہے، نہ صرف تبصرہ بلکہ یہ ایمان کی ترجمانی، ضمیر کی بیداری اور حق کی
شہادت ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں ملت اپنے زخم بھی دیکھتی ہے اور مرہم کی راہیں بھی تلاش کرتی ہے، جہاں ماضی کی لغزشیں حال کے منظر نامے پہ سوال بن کر ابھرتی ہیں اور حال کی بے حسی مستقبل کے اندیشوں میں ڈھلنے لگتی ہے۔

یہی آئینہ ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے، فکر بیدار کرتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ زخموں کی شناخت ہی شفا کی پہلی شرط ہے۔

اسی شعور کی روشنی میں ملت اپنے بکھرے ہوئے حوصلوں کو سمیٹتی ہے، اتحاد کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور اصلاحِ حال کی طرف قدم بڑھانے کا عزم تازہ کرتی ہے۔

رسائل وجرائد اس صحافت کی زندہ علامت ہیں، یہ کاغذ پر چھپی ہوئی تحریریں نہیں بلکہ زمانے کی نبض پہ رکھا ہوا حساس ہاتھ ہیں، یہ وہ خاموش مبلغ ہیں جو سرحدوں، زبانوں اور نسلوں سے ماورا سوچ کو سمت دیتے اور شعور کو جلا بخشتے ہیں۔

یہ معاشروں کے فکری حافظے ہوتے ہیں جہاں عہد کی لغزشیں محفوظ بھی ہوتی ہیں اور اصلاح کی صورتیں بھی۔ ان کے صفحات میں تاریخ سانس لیتی ہے، حال سوال بن کر ابھرتا ہے اور مستقبل کی سمت متعین ہونے لگتی ہے۔ یہی وہ چراغ ہیں جو فکری اندھیروں میں دلیل کی روشنی، تہذیبی انتشار میں وقار کی خوشبو اور فتنۂ اظہار کے شور میں صداقت کی خموش صدا بن کر زندہ رہتے ہیں۔

جس عہد میں سچ کو افواہ اور افواہ کو سچ بنا کر پیش کیا جا رہا ہو، جس زمانے میں میڈیا کا بڑا حصہ طاقت اور مفاد کے اردگرد طواف کر رہا ہو،

وہاں خبر کی حرمت سب سے پہلے پامال ہوتی ہے اور صحافت کا مقدس منصب محض ایک سودے میں بدل جاتا ہے۔ کیمروں کی چکاچوند اور سرخیوں کے شور میں حقائق دب جاتے ہیں جبکہ جھوٹ کو بار بار کی تکرار سے اسے ''قابلِ قبول صداقت'' بنا دیا جاتا ہے۔

میڈیا کی جانبدارانہ پالیسیاں اب اتفاق نہیں رہیں یہ سرمایہ دارانہ مفادات کی باقاعدہ حکمتِ عملی بن چکی ہیں جہاں ایڈیٹوریل فیصلے ضمیر سے نہیں، اشتہارات اور سرمایہ کاری کے ترازو پہ تولے جاتے ہیں۔ سچ وہی مانا جاتا ہے جو طاقت کے ایوانوں کو ناگوار نہ گذرے اور وہ آوازیں جو سوال اٹھائیں یا تو نظرانداز کر دی جاتی ہیں یا شور میں گم کر دی جاتی ہیں۔

یوں صحافت جو کبھی مظلوم کی ترجمان اور حق کی نگہبان تھی آج سرمایہ داروں کی مٹھی میں قید ہو کر مفاد پرست بیانیوں کی ترجمان بنتی جارہی ہے۔ اس منظرنامے میں آزاد اور باوقار صحافت محض ایک یاد نہیں بلکہ ایک مزاحمت ہے---- ایسی مزاحمت جو سچ کو زندہ رکھنے، شعور کو بیدار کرنے اور ضمیر کی شمع کو بجھنے سے بچانے کا نام ہے--- ایسے میں مذہبی رسائل و جرائد کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے، یہی وہ پلیٹ فارم ہیں جہاں دین جذبات نہیں بنتا بلکہ دلیل کے ساتھ بولتا ہے، جہاں روایت جمود نہیں بنتی بلکہ حکمت کے ساتھ عصر سے مکالمہ کرتی ہے۔

یہاں ایمان کو اشتعال کا ہتھیار نہیں بنایا جاتا بلکہ فہم و فراست کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے اور اختلاف کو فتنہ نہیں بلکہ فکری ارتقا کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی صحافت کا یہ وقار ہی اسے دنیاوی بازار کی صحافت سے ممتاز کرتا ہے کہ وہ سچ کو نفع و نقصان کے پیمانوں میں نہیں تولتی بلکہ امانتِ علم سمجھ کر آگے بڑھاتی ہے۔

یہی رسائل وہ محفوظ دائرہ فراہم کرتے ہیں جہاں شریعت کی روح، تہذیب کی نزاکت اور اخلاق کی لطافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور قاری کو محض معلومات نہیں بلکہ بصیرت عطا کی جاتی ہے۔ ایسے پلیٹ فارم جب اخلاص اور دیانت کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیں تو وہ نہ صرف فکری انتشار کا علاج بنتے ہیں بلکہ امت کے زخمی شعور پہ مرہم بھی رکھتے ہیں۔

مذہبی صحافت ملت کو صرف حالات سے باخبر نہیں رکھتی بلکہ اسے اپنے تشخص، اپنی تاریخ اور اپنی ذمہ داریوں سے جوڑتی ہے۔

یہ ایمان اور زمانے کے درمیان ایک مضبوط پُل ہے جس کے بغیر نہ فکری سفر مکمل ہوتا ہے اور نہ تہذیبی بقا ممکن۔

ایسے ہی فکری پس منظر میں جب کوئی رسالہ حق و صداقت کی اذان بن کر سامنے آتا ہے تو وہ محض ایک اشاعت نہیں رہتا بلکہ ایک تحریک، ایک امانت اور ایک فکری دستاویز بن جاتا ہے--- جسے تاریخ سنبھال کر رکھتی ہے۔

''الکوثر'' کا زیر نظر شمارۂ دوم فکری بیداری، روحانی بالیدگی اور تہذیبی شعور کا آئینہ ہے۔

یہ شمارہ محض سو صفحات پہ پھیلی ہوئی تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا فکری مرقع ہے جس میں مذہب، روحانیت، ادب، عصرِ حاضر اور نسلِ نو کی تربیت ایک ہم آہنگ وحدت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ شمارہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ اگر مدیر اور رسالے کی مجلس ادارت کا وژن واضح ہو، نیت صالح ہو اور قلم دیانت دار ہو تو رسالہ صفحات سے نکل کر ملت کے ضمیر کی آواز بن جاتا ہے۔ یہ شمارہ قاری کو محض مطالعہ نہیں کراتا بلکہ سوچنے، ٹھہرنے اور اپنا محاسبہ کرنے پہ آمادہ کرتا ہے۔ یہ سرسری نگاہوں کے لیے نہیں، سنجیدہ دلوں اور بیدار اذہان کے لیے مرتب کیا گیا ہے جہاں ہر سطر ایک سوال بن کر سامنے آتی ہے اور ہر مضمون ایک ذمہ داری کا احساس جگاتا ہے۔ اس کے صفحات قاری کو ہجومِ افکار سے نکال کر خلوتِ فکر میں لے جاتے ہیں جہاں انسان اپنے یقین، اپنے رویّے اور اپنے کردار کا بے لاگ جائزہ لینے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں یہ شمارہ صرف معلومات کا اضافہ نہیں بلکہ شعور کی تطہیر اور فکر کی درستی کا ایک خاموش مگر گہرا عمل بن جاتا ہے۔

تقدیم کے عنوان سے مدیر کا تحریر کردہ اداریہ حق وصداقت کی اذان --- ان کے فکری تشخص کا آئینہ ہے یہ درحقیقت مولانا ملک

الظفر سہسرامی کے فکری مزاج، دینی غیرت اور روحانی وابستگی کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ یہ اداریہ نہ جذباتی شور ہے، نہ وقتی ردِعمل بلکہ ایک ٹھہرا ہوا، باوقار اور دلیل سے روشن بیانیہ ہے جو عشقِ رسول ﷺ کو محض نعرہ نہیں بلکہ فکری ذمہ داری اور تہذیبی امانت کے طور پہ پیش کرتا ہے ......یہی وجہ ہے کہ اس اداریے میں حق گوئی، اعتدال اور حکمت ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ مولانا ملک الظفر سہسرامی کا اسلوب نہ تو تصادم کی راہ اپناتا ہے اور نہ ہی مصلحت کے غبار میں حق کو دھندلا ہونے دیتا ہے بلکہ وہ قاری کے سامنے صداقت ایسے وقار کے ساتھ رکھ دیتا ہے کہ انکار کی گنجائش خود بخود سمٹنے لگتی ہے۔

یہ تحریر عشقِ رسول ﷺ کو صرف جذبے کی حد تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اسے فکری بصیرت، اخلاقی ذمہ داری اور عملی کردار سے جوڑ کر پیش کرتی ہے جہاں محبت دلیل بن جاتی ہے اور دلیل تہذیب کا روپ دھار لیتی ہے۔ یوں یہ اداریہ اپنے عہد کے فکری انتشار میں ایک اذان کی مانند ہے--- جو شور نہیں مچاتی مگر دلوں کو بیدار کرتی، سمت دکھاتی اور ضمیر کو یاد دلاتی ہے کہ حق کا راستہ ہمیشہ وقار، صبر اور صداقت سے ہو کر گذرتا ہے۔

یہاں مدیرِ اعلیٰ کی تہ دار شخصیت مکمل آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے وہ ایک ذمہ دار عالم دین بھی ہیں، صاحب نظر بھی اور دردمند داعی بھی اور باخبر مبصر بھی- یقیناً ان کی شخصیت منبر کی حرارت بھی رکھتی ہے اور محراب کی خموش تاثیر بھی، قلم کی کاٹ بھی جانتی ہے اور لفظوں کی امانت بھی نبھاتی ہے۔ ان کی نگاہ حال کے ہنگاموں پر بھی ہے اور تاریخ کے آئینے میں جھانکتی ہوئی مستقبل کی سمتوں پر بھی اس لیے ان کی تحریر محض خبر نہیں بنتی بلکہ خبر کے پس منظر میں چھپی ذمہ داریوں کا احساس بھی جگاتی ہے۔ یوں مدیرِ اعلیٰ کی ذات ایک ایسے فکری مرکز کی صورت ابھرتی ہے جہاں علم، اخلاص اور شعورِ عصر باہم مل کر قاری کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی کی علمی و ادبی شخصیت اس رسالے کے ہر صفحے پہ جھلکتی ہے۔ ان کی ذات میں عالمِ دین کی سنجیدگی، ادیب کی نزاکت، صحافی کی جرأت اور مربی کی شفقت ایک ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ محض مدیر نہیں بلکہ فکری نگہبان ہیں--- جو روایت کو حال سے مربوط کرتے ہیں اور حال کو مستقبل کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں۔

مذہبیات وروحانیات روایت سے وابستگی، حال سے مکالمات کا ایک خوبصورت سلسلہ ہے- اس کے تحت جو مضامین ہیں ان میں وہ شعور ہے جو روایت سے نمو پاتا ہے، ان میں نہ جامد فکر ونظر ہے، نہ بے لگام تجدد بلکہ اہلِ سنّت کی وہی متوازن فکر جلوہ گر ہے جو دل کو ذکر سے جوڑتی ہے اور عقل کو شریعت کے دائرے میں متحرک رکھتی ہے۔

یہاں روحانیت فرارِ دنیا نہیں بلکہ تزکیۂ نفس کے ساتھ تعمیرِ حیات کا شعور بن کر ابھرتی ہے اور مذہب محض چند روایتی رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ کردار، بصیرت اور اجتماعی ذمہ داری کا زندہ ضابطہ دکھائی دیتا ہے۔ تحریریں ماضی کے چراغ سے روشنی لے کر حال کے اندھیروں کو معنیٰ عطا کرتی ہیں اور قاری کو اس مقام پہ لا کھڑا کرتی ہیں جہاں ایمان احساس بھی ہے اور فکر بھی، عبادت بھی ہے اور عمل بھی۔ یوں یہ مضامین دل میں خشیت کی حرارت اور ذہن میں فہمِ دین کی تازگی پیدا کرتے ہوئے قاری کو ایک باوقار، متوازن اور باشعور دینی سفر کی دعوت دیتے ہیں--- یہ حصہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مدیرِ اعلیٰ روحانیت کو خواب نہیں بناتے بلکہ کردار بناتے ہیں اور مذہب کو ماضی کا قصہ نہیں بلکہ عصر کا رہنما سمجھتے ہیں۔ وہ ایمان کو فقط محراب و منبر تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے زندگی کے بازار، سیاست کے ایوان اور معاشرت کے رویّوں میں زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین محض یادگار نہیں، ذمہ داری ہے، محض روایت نہیں، بصیرت ہے اور محض تذکرہ نہیں بلکہ عملی جدوجہد کا نام ہے۔

اسی لیے ان کی تحریر میں دعا کی لطافت بھی ہے اور احتساب کی سختی بھی، محبت کی حرارت بھی ہے اور حق گوئی کی کاٹ بھی۔

''الکوثر'' کا ادبی حصہ اس شمارے میں خاص طور پہ توجہ کھینچتا ہے۔ یہاں ادب محض جمالیاتی مشغلہ نہیں بلکہ فکری شائستگی اور تہذیبی

شعور کا اظہار ہے۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی کی ادارت میں ادب کو نہ وعظ میں دفن کیا گیا، نہ تفریح میں گم ہونے دیا گیا بلکہ اسے دعوت، تاریخ اور تہذیب کے درمیان ایک پُل بنایا گیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مدیر کی ادبی بصیرت، ان کے خاندانی علمی ورثے اور ذاتی مطالعات کی گہرائی خاموشی سے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ عصری موضوعات پہ مضامین اس شمارے کا ایک مضبوط ستون ہیں۔

فلسطین، وقف، داخلی سیاسی حالات، اور عالمی ناانصافیاں--- سب پہ قلم اٹھایا گیا ہے مگر نہ اشتعال کے ساتھ، نہ مصلحت کی خاموشی کے ساتھ۔ یہاں مدیرِ اعلیٰ کی وہ تہ دار شخصیت سامنے آتی ہے جو حالات کو جذبات سے نہیں، بصیرت سے دیکھتی ہے اور سچ کہنے میں نرمی رکھتی ہے مگر کمزوری نہیں۔ یہ تحریریں وقتی نعروں کی بازگشت نہیں بلکہ تاریخ کے طویل شعور سے جڑی ہوئی وہ آواز ہیں جو حال کے ہنگاموں میں بھی مستقبل کی سمت متعین کرتی ہے۔ یہاں احتجاج بھی ہے تو دلیل کے چراغ کے ساتھ اور سوال بھی اٹھایا گیا ہے تو اخلاقی ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ۔ مدیرِ اعلیٰ کا قلم نہ صرف ظلم کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ قاری کے اندر وہ حوصلہ بھی بیدار کرتا ہے جو فہم، توازن اور اصلاح کی طرف لے جاتا ہے--- یوں یہ مضامین محض حالات پہ تبصرہ نہیں کرتے بلکہ ضمیر کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

گوشۂ اطفال: ''شاہین صفات'' اس شمارے کا ایک نہایت معنیٰ خیز اضافہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ''الکوثر'' صرف حال کی اصلاح نہیں چاہتا بلکہ مستقبل کی تعمیر بھی اس کے ایجنڈے میں شامل ہے۔

بچوں کے لیے ادب، فکر اور کردار سازی--- یہ مدیرِ اعلیٰ کے اس شعور کا ثبوت ہے کہ ملت کی بقا نعروں سے نہیں، نسلوں کی تربیت سے ہوتی ہے۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی محض ایک مدیر نہیں بلکہ ایک فکری نگہبان ہیں۔ ان کی شخصیت میں عالم کی سنجیدگی، ادیب کی لطافت، داعی کا درد اور مبصر کی بصیرت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ''الکوثر'' کو ایک منفرد شناخت عطا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''الکوثر'' کا شمارۂ دوم نہ وقتی رسالہ محسوس ہوتا ہے، نہ موسمی اشاعت بلکہ ایک فکری دستاویز بن کر سامنے آتا ہے۔

''الکوثر'' شمارۂ دوم اس بات کا اعلان ہے کہ اگر نیت پاک ہو، سمت واضح ہو اور قیادت صاحبِ بصیرت ہو تو رسالہ بھی تحریک بن جاتا ہے۔ یہ شمارہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ''الکوثر'' صرف صفحات نہیں سمیٹ رہا ہے بلکہ ضمیر بیدار کر رہا ہے۔ اور یہ سب ممکن ہوا ہے مدیرِ اعلیٰ مولانا ملک الظفر سہسرامی اور ان کے رفقاء بالخصوص مولانا رحمت اللہ صدیقی کے علمی وقار، ادبی شعور اور تہ دار شخصیت کے سبب۔

ایسے دور میں جب مذہبی صحافت زوال کے خطرے سے دوچار ہے ''الکوثر'' جیسے رسائل امید کی وہ شمع ہیں جو فکری انتشار، اخلاقی ابتری اور تہذیبی اندھیروں میں بھی بجھتی نہیں۔ یہ رسالے محض خبروں یا مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک امانت ہیں---علم کی، شعور کی اور اس فکری وراثت کی جو نسل در نسل اہلِ دل نے سینے سے لگائے رکھی۔ اگر ہم نے انہیں سنبھالا، ان کی سرپرستی کو اپنی دینی و ملی ذمہ داری سمجھا اور قلم و قرطاس کا یہ مقدس رشتہ زندہ رکھا تو یہ چراغ صرف روشن ہی نہیں رہیں گے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے راہِ حق، توازن اور بصیرت کی نشان دہی بھی کریں گے۔ ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ جب اہلِ حق نے اپنے چراغوں سے غفلت برتی تو اندھیروں نے خود کو مقدر بنا لیا۔ ''الکوثر'' اسی لیے صرف ایک رسالہ نہیں، ایک عہد ہے---اور اس عہد کی حفاظت ہم سب پہ لازم ہے۔



زبان، دین اور تہذیب کی بقا کے لیے اردو رسائل خریدیں، پڑھیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔

مولانا خورشید جمال نوری
خانقاہ نوریہ جمالیہ، گونڈی، ممبئی

الفاظ کی صدا اور ''الکوثر'' کی فکری بازگشت

حضرت مولانا محمد ملک الظفر اکمل سہسرامی کو ہم نے ابھی تک دیکھا نہیں ہے لیکن طرزِ تحریر اور اسلوب سخن بہت خوب ہے۔ اجملؔ صاحب کے شعر میں تھوڑے تصرف کے ساتھ عرض ہے۔

آج تک ہم نے اکملؔ کو دیکھا نہیں پھر بھی طرزِ تکلّم بہت خوب ہے۔ہم نے اس ناقد خوش بیاں کا قلم ریڈیو پہ پڑھا تھا بہت دن ہوئے۔ان کے والد ماجد فخر بہار حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی علیہ الرحمہ کی زیارت کی ہے اور بار بار زیارت کی ہے۔ ان کے بیانات بھی خوب سنے ہیں۔ جماعتی درد ان کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ ان کی زبان وقلم سے جو الفاظ نکلتے تھے ان میں بے پناہ لطافت اور تقدس ہوتا تھا۔ جب وہ کسی واقعے کی منظر کشی کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ واقعہ ابھی محسوس پیکر میں سامنے آجائے گا۔ کبھی کبھی وہ اپنی تقریروں میں ایک ہی لفظ کی بار بار تکرار کرتے تھے ان کے اس انداز سے ایسا گمان ہوتا کہ مذہبی درد و کرب کا آتش فشاں ابھی پھوٹ پڑے گا۔ وہ اپنے اندازِ خطابت کے خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم بھی۔ ان کا تحریری انداز بھی دوسروں سے قطعی مختلف ہے۔ جماعت میں اب تک ان کا کوئی ناقل بھی پیدا نہ ہوسکا ہے۔ حضرت مولانا ملک الظفر صاحب کی زبان وقلم میں اپنے والد ماجد کی جستجو ملتی ہے۔ اگر مشق وممارست کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو دوسرے کامل سے جماعت اہلسنّت کی ملاقات ہوسکتی ہے۔

مجلّہ ''الکوثر'' کی حیثیت ابھی ایک نازک پودے کی ہے لیکن اس نازک پودے میں ایک تناور درخت کے سارے آثار ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ۔

بتا دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم میں قدر دانی کا جذبہ زندہ نہیں رہا۔ اگر جذبات واحساسات زندہ ہوتے تو ''الکوثر'' جیسے درجنوں رسائل ہماری تہذیب وثقافت کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے نظر آتے۔ اندھیروں میں جینے کی ہماری عادت سی ہوگئی ہے، ہمیں روشنی اچھی نہیں لگتی۔ افسوس یہ ہے کہ روشنی میں جینے والی قوم اندھیروں کی عادی ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے افعال وعادات ایسے ہیں کہ ہم میزانِ شریعت پہ رکھے جانے کے قابل بھی نہیں رہے۔ صدق وصداقت کا نقارہ بجتا ہے لیکن ہم اس پہ توجہ نہیں دیتے۔ ہم اسے بے وقت کی بانسری تصور کرتے ہیں۔ ''الکوثر'' کی آواز میں بے انتہا صداقت، نفاست اور درد ہے۔ ایک ایسا درد جسے کسی بھی انداز میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ آواز ہماری توجہ حاصل نہیں کرسکی تو دھیرے دھیرے یہ آواز ریت کے طوفانوں میں دب کر دم توڑ دے گی۔ اس آواز کی حوصلہ افزائی ہمارا دینی، ملی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ عہد جس میں ہم جی رہے ہیں یہ عہد خود غرضی اور ذاتی مفادات کے خول میں لپٹا ہوا ہے۔ ہم ماضی کو بھول چکے ہیں اور ہمارا حال ہر جہت سے بے حال ہو چکا ہے۔ ذاتی مفادات کا بھوت ہم پہ اس طرح

حاوی ہو چکا ہے کہ ہم شرعی فیصلے بھی ذاتی مفادات کی روشنی میں کر رہے ہیں۔ جن سے ذاتی مفادات کی زنجیریں ملتی ہیں۔ ان کے لیے پیمانے جدا ہیں اور جن سے مفادات کا تبادلہ نہیں ہوتا ان کے لیے پیمانے جدا ہیں۔ یہ عہد جاہلیت کی ذہنیت ہے۔ اسلام نے اس طرح کی ذہنیت کو اس کی شاخوں سے جدا کر دیا تھا۔ حیرت یہ ہے کہ یہ سب کچھ مسند افتا پہ بیٹھ کے کیا جا رہا ہے۔ ایک ذمہ دار ادارے کے مفتی صاحب سے راقم نے عرض کیا کہ ایک شرعی عدالت قائم ہوئی، اس میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک ہی گروپ کے لوگ تھے۔ کیا ایسی عدالت کا فیصلہ نافذ ہوگا؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ فیصلہ باطل ہے۔ لیکن جب ان پہ دباؤ بڑھا تو ان کا ذہنی جغرافیہ بدل گیا اور انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ گویا ہوئے کہ ہاں! وہ فیصلہ نافذ ہوگا۔ اس کی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ میراثِ اسلاف کی قدر و منزلت کا شعور دم توڑتا جا رہا ہے۔ میراثِ اسلاف اگر ہمارے ذاتی مفادات سے ٹکراتے ہیں تو ہم یہ آئینہ بھی بے رحمی سے توڑ دیتے ہیں۔ ہم میں جو لوگ خود کو اہلِ منصب سمجھتے ہیں ان کی خواب گاہوں کی چمک دمک دیکھ کر عوامی اضطراب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر بے سمت بہتے ہوئے طوفانوں کا رُخ موڑا نہیں گیا تو ہم میں خیر وشر کی شناخت کا شعور بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنی شناخت کی حفاظت کے لیے کفن بدوش ہو جائیں اور جو لوگ ہماری شناخت مٹانے پہ آمادہ ہیں ان سے سنجیدہ محاذ آرائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ اپنی آواز کو مؤثر اور دور تک پہنچانے کے لیے ''الکوثر'' ہمارے لیے بہترین پلیٹ فارم ہے۔

مجلّہ ''الکوثر'' کے مدیر اعلیٰ حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب اس خانوادے کے چشم و چراغ ہیں جس نے تاریخ کے کسی موڑ پہ اپنے ضمیروں کا سودا نہیں کیا ہے، حق وصداقت کی حمایت وسیادت سے لمحے بھر کے لیے کبھی غافل نہیں ہوا اور باطل کو کبھی سر اُٹھا کر جینے کا کبھی حق نہیں دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جب ان کے جدامجد حضرت مولانا مفتی محمد فرخند علی قادری نقشبندی قدس سرہٗ علوم ومعرفت کی سندات لے کر گھر واپس لوٹے اور اہلِ خانہ سے ذریعۂ معاش سے وابستگی کا اظہار کیا تو اہلِ خانہ سے جواب ملا کہ معاش کی فکر آپ اپنے دل ودماغ سے نکال دیں۔ زیورِ علم سے آراستگی میں دنیا کبھی شامل نہیں رہی۔ ہمارے گھر میں رحمت الٰہی خوب برستی ہے۔ آپ کا نائب مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ ہونا یہ ایک ایسی قیمتی دولت ہے جس کے شکر کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہم فروغِ علومِ نبوی ﷺ کے لیے آپ کو راہِ خدا میں وقف کرتے ہیں۔ آج کا عہد اس بے غبار جذبے سے محروم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی غیرت بازارِ دنیا میں کھلے عام نیلام ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں صدق وصداقت کا چراغ جل رہا ہے جس کی روشنی میں مایوسیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ دین وشریعت سے قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب اسی بے غبار جذبے کی روشن عبارت ہیں۔ اسے وقت کی تپش سے بچانے کی ضرورت ہے۔ یہ عبارت حال کا آئینہ ہے۔ اس عبارت میں جذبوں کی صداقت دیکھی جاسکتی ہے۔ نسلِ نو اندھیروں کی سمت تیزی سے بڑھ رہی ہے اگر یہ عبارت روشن رہی تو نسلِ نو کے لیے نشانِ منزل بن جائے گی۔ کبھی کبھی وقت خوشبو بکھیرتے ہوئے آتا ہے اور دبے پاؤں گذر جاتا ہے، اس لیے اپنی آنکھوں پہ نیند کے خمار کو حاوی نہ ہونے دیجیے۔ صدق وصداقت کے نغمات ہمیشہ نہیں گونجتے۔ برسات آتی ہے اور چلی جاتی ہے جو کسان برسات کی قدر نہیں کرتا اس کے کھیتوں کو ہریالی نہیں ملتی۔ مولانا محمد ملک الظفر صاحب ''الکوثر'' کا جام لیے کھڑے ہیں، ایک ایسا جام جو آپ کے ایمان وعقیدے کی تپتی ہوئی زمینوں کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ ''الکوثر'' آپ سے جذبۂ قدر دانی کا اظہار چاہتا ہے۔ یہ قدر دانی ہزاروں دلوں کی زندگی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ قدر دانی سوتے جذبوں کو بیدار کر دیتی ہے، بند آنکھوں کو کھول دیتی ہے اور حوصلوں کے بجھتے ہوئے چراغوں کی لَو تیز کر دیتی ہے۔ قدر دانی ہاری ہوئی جنگ کو جیت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ قدر دانی موت وحیات کی کشمکش میں الجھے ہوئے انسان میں جینے کی حسرت بڑھا دیتی ہے۔

حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب کی تربیت اس شخص کی گود میں ہوئی ہے جو مخالف طوفانوں کے جسم سے خون نچوڑ لیتا تھا۔ تیز ہواؤں کا رُخ بدل دیتا تھا اور دلوں میں سلگتے ہوئے مذہبی جذبوں کو آتش فشاں بنا دیتا تھا۔ خوف وخشیت کا چراغ اس کے دل میں روشن تھا اسی لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے خوف زدہ نہیں کر پاتی تھی۔ وہ عقابی نگاہ کا حامل تھا۔ حریفانِ چمن اس کے سائے سے خوف کھاتے تھے۔ اس کی پرواز بہت اونچی تھی۔ وہ بہت دور کی سوچتا تھا۔ وہ زبان، بیان، رفتار، گفتار اور فکریات کے باب میں اپنی نمایاں شناخت رکھتا تھا۔ دین و دیانت کی فلاح کے لیے اس نے خود کو وقف کر دیا تھا۔ اس کی دین داری میں بے پناہ صداقت تھی یہی وجہ ہے کہ خدائے قادر و قیوم نے اس کی فکر کو مرنے نہیں دیا۔ حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب کی زبان وقلم سے ان کے والد ماجد حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی کے جذبات واحساسات کی پھیلتی ہوئی مذہبی لہروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے جس صحافی کے قلم کی ہر تازہ کاشت کی علمی دنیا شدت سے منتظر ہوتی تھی۔ آج صورت بدل گئی ہے لیکن زبان وہی ہے، بیان وہی ہے، سوچنے کا زاویہ بھی وہی ہے، قلم کا تیور بھی وہی ہے اور باطل کو زیر وزبر کرنے کا حوصلہ بھی وہی ہے۔ کہتے ہیں کہ قلم کا زخم تلوار سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ تلوار کا زخم جلد یا بدیر بھر جاتا ہے لیکن قلم کا زخم کبھی نہیں بھرتا۔ حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب اپنے قلم کے تیر سے باطل فکر کے جسم کو جس انداز میں لہولہان کر رہے ہیں اس عہد نفاق میں اس کی نظیر بہت مشکل سے ملے گی۔ قومِ مسلم کی خستگی پہ ان کی آنکھیں اشک ریزی بھی کرتی ہیں اور ظلم و جبر کے خلاف شعلہ فشانی بھی۔ وہ اپنوں کی طرف سے غیر شرعی اعلانات، اظہارات اور استفسارات کی دلائل وشواہد کی روشنی میں تردید بھی کرتے ہیں اور اسلامی اقدار وروایات کے فروغ میں مصروف مصلحین امّت کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ وہ سوالات بھی قائم کرتے ہیں اور وقت کی کوکھ سے اٹھنے والے ہر سوال کا بروقت جواب بھی فراہم کرتے ہیں۔ وہ ان افراد کی شدت سے مخالفت بھی کرتے ہیں جو ذاتی مفادات سے متاثر ہو کر اپنے ضمیروں کا سودا کرتے ہیں اور قوم وملّت کی جگ ہنسائی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک پُرسوز داعی، مبلغ اور مصلح کو بہتر انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔

راقم الحروف پہ حضرت مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی کی تحریرات وتقریرات کا ایسا گہرا اثر ہے کہ دل بے اختیار عقیدت سے لبریز ہو اٹھتا ہے۔ آپ کے قلم میں جو سوزِ مذہب، حمیت دینی اور غیرتِ ایمانی کی جلالت ہے وہ اس پُرآشوب عہد میں چراغِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاہم یہ عرض کرنا بھی اپنی سعادت کا اظہار ہے کہ ہم پہلے ہی اس آستانۂ عالیہ سے وابستہ ہیں جہاں علم وتقویٰ کی کہکشاں درخشاں ہے--- یعنی تاجدارِ اہل سنّت، وارثِ علوم اعلیٰ حضرت، امامِ اہلِ عشق ومحبت حضور مفتیٔ اعظم ہند علامہ مفتی مصطفیٰ رضا خان نوری بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی غلامی و نیازمندی کا شرف ہماری گردن کا طوق ہے۔ یہ نسبت ہمارے لیے سرمایۂ حیات بھی ہے اور موجبِ فخر بھی۔

اگر یہ سعادت پہلے سے میسر نہ ہوتی تو بلا تردد حضرت مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی کی خدمت میں دست بستہ عرض گذار ہوتے کہ ہمیں بھی اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما کر اپنی روحانی توجہات سے سرفراز فرمائیں۔

یہ ہماری محرومی نہیں بلکہ سعادت ہے کہ ایک نسبت پہلے سے نصیب ہے ورنہ آپ کی تحریروں میں مذہبی درد کا جو شعلہ دہک رہا ہے اس سے آپ کی غیر معمولی پارسائی آشکار ہو رہی ہے ایک مرشد راہ طریقت کو جن اصولوں کا پابند ہونا چاہیے وہ سارے اصول آپ کی تحریروں میں نجوم وکہکشاں کی طرح چمک رہے ہیں اور وہ ہر صاحبِ دل کو اپنی جانب کھینچ لینے کے لیے کافی ہیں۔ اس عہدِ نفاق میں آپ کی استقامت اور حمیتِ دینی یقیناً قابلِ رشک ہے اور اہلِ حق کے لیے موجبِ تقویت۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ جن کے عمل سے مذہبی احساسات کو چوٹ لگتی ہے آپ اس کی طرف دیکھنا بھی اصول عشق کی توہین سمجھتے ہیں۔ میراثِ اسلاف سے جنون عشق آپ کی تحریرات

سے نمایاں ہے۔ آپ کی کتاب حیات کے اب تک جو اوراق نگاہوں کے سامنے آئے ہیں ان سے کتاب وسنت پہ عمل کی روشنی پھوٹتی ہے۔ یہ باتیں عقیدتِ بے جا کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ بے غبار حقیقت کی ترجمانی ہے۔

اس عہد پُر آشوب میں ہر شخص ہر محفل میں اپنی نیک نامی چاہتا ہے۔ حق گوئی، بے باکی اور بے خوفی پل صراط پہ چلنے جیسا عمل ہے۔ لوگ تھوڑے فائدے پہ اپنا سب کچھ بیچ دے رہے ہیں۔ مذہب اور مذہبیات کتابوں کے اوراق میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جو لوگ مذہب اور مذہبیات کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں انہیں ایسے نام دیے جا رہے ہیں جس کی اجازت ایک اصول پسند معاشرہ نہیں دیتا۔ آپ نے ''الکوثر'' کے اوّلین شمارے میں اپنی جو مذہبی، مسلکی اور معاشرتی پالیسی واضح کی ہے، رسائل وجرائد کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر اب تک ہماری نگاہوں سے نہیں گذری ہے۔ یہ پالیسی آپ کو بہت سارے اپنوں سے دور کردے گی لیکن ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ پالیسی بے خیالی میں وضع نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ یہ گہری بصیرت اور گہرے مذہبی شعور کا نتیجہ ہے۔ چونکہ آج صلح کلیت کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے اگر صلح کلیت کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے جراثیم کو روکا نہیں گیا تو اسلامی معاشرہ تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔ چونکہ آج کا انسان زیادہ سے زیادہ مفاد سمیٹنا چاہتا ہے اور یہ مفاد صلح کلیت کے راستے ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ''الکوثر'' کے وسیلے سے آپ نے معاشرے کی دُکھتی رگوں پہ ہاتھ رکھ دیا ہے۔ آپ کو قدم قدم پہ اپنی تنہائیوں کا احساس ہوگا لیکن تنہائیوں کا کرب دیرپا نہیں ہوگا۔ دھیرے دھیرے آپ کی جماعت اور جمعیت دونوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ پھر بستی بستی، قریہ قریہ یہ صدا گونجے گی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایک عہد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا تھا، اُس عہد کو روشن عہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اُس عہد میں فتنے بارش کے قطروں کی طرح زمین پہ اُترتے تھے لیکن اعلیٰ حضرت کی ذات پورے عہد پہ حاوی تھی۔ کوئی بھی فتنہ اعلیٰ حضرت کی نگاہ سے بچ کے نہیں نکل پاتا تھا۔ آپ کا دربار فتنوں کی قربان گاہ تھا۔ آپ کی زبان و قلم کی ضرب سے لوگ فتنوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ زندہ دل، زندہ علم اور زندہ ضمیر افراد پہ مشتمل آپ کا حاشیہ بھی تھا جو ہر وقت آپ کے اشاروں کا منتظر ہوتا تھا۔ خانقاہیں بھی تھیں، درس گاہیں بھی اور دعوت وتبلیغ کے دوسرے مراکز بھی تھے اور سب کے سب باہم متحد بھی تھے۔ جس نے فکری، نظریاتی اور اصولی اتحاد سے انکار کیا وہ تاریکیوں کے صحرا میں گم ہوگیا۔ اعلیٰ حضرت کی ذات منزل بھی تھی اور نشانِ منزل بھی اور یہ انتخاب مدینہ منورہ کا تھا۔ بہت سارے لوگ آج بھی یہ روشن فلسفہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے عشق وعرفان کی جو ڈگر متعین کی تھی آپ کے خلفاء، تلامذہ اور مستفیدین کی جماعت نے اسے غبارِ وقت سے کسی بھی طرح آلودہ ہونے نہیں دیا۔ اعلیٰ حضرت کے عہد میں خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا اور بھرپور انداز میں اس کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی۔ اُس عہد میں چراغ سے چراغ جلتے تھے اور جلتے چراغوں پہ نثار ہونے کے لیے پروانوں کا ہجوم ہر وقت کفن بدوش رہتا تھا۔ جذبوں کی صداقت نگاہوں سے چھلکتی تھی، حسرتیں صحرا میں بھٹک بھٹک کر دم نہیں توڑتی تھیں بلکہ حسرتوں کو بامُراد کرنے کے لیے دردمندوں کے قافلے جگہ جگہ کھڑے رہتے تھے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے بعد حضور حجۃ الاسلام مسند ارشاد پہ جلوہ گر ہوئے۔ آپ نے پھیلتی ہوئی شاخوں کو ڈالیوں سے الگ ہونے نہیں دیا۔ جو لوگ اعلیٰ حضرت کی فکر کے دائرے میں رہے آپ کی ذات ان کے سروں پہ سائبان بنی رہی۔ خدمت اور اعترافِ خدمت کے فلسفے آپ نے بھی بحال رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مبلغین، محرکین اور مصلحین امّت کے قافلے سمتوں میں پھیلتے رہے اور عشق وعرفان کا اُجالا عقیدت کے کٹوروں میں تقسیم کرتے رہے۔ ملک میں ہر مشرب کے لوگ تھے لیکن ان میں مشربی تعصب

نہیں تھا۔ قادری پیالے میں ہر شخص پانی پیتا تھا۔

حضور حجۃ الاسلام کو مسند سجادگی پہ بیٹھنے کا وقت بہت کم ملا۔ ۱۹۲۱ء/ ۱۳۴۰ھ میں آپ مسند ارشاد و ہدایت پہ جلوہ افروز ہوئے اور ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء میں آپ نے عالمِ بالا کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ۲۲/ ۲۳/ سالوں تک جماعت اہلسنّت آپ کے علمی، فکری اور نظریاتی فیضان کی بارش میں نہاتی رہی۔ آپ نے اہلسنّت کی جس انداز میں قیادت و سیادت کی ہے وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔ آپ ذاتی و شخصی طور پہ بھی کمالات کے جامع تھے۔ قدرت کی جانب سے آپ کو ظاہری و باطنی دونوں حُسن سے وافر حصہ ملا تھا۔ آپ کے ظاہری حسن سے متأثر ہوکر ایک بڑی جماعت حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ آپ جب علماء و مشائخ کے درمیان بیٹھتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ستاروں کے ہجوم میں چودہویں کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آپ کی پوری زندگی کتاب و سنّت کے نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ سے آپ کے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا جو تقاضا تھا اسے کسی بھی جہت سے آپ نے مجروح ہونے نہیں دیا۔ تاریخ کی یہ نادر روایت ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو اب تک جو جانشین ملے ہیں، عالمی تناظر میں اس کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

حضور حجۃ الاسلام حضرت مولانا مفتی شاہ حامد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ (م ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے وصال کے بعد حضور مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ (م ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) کے سر اقدس پہ جماعت اہلسنّت کی قیادت و سربراہی کی دستار باندھی گئی۔ آپ ذاتی طور پہ اس دستار کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن یہ مؤقر علماء و مشائخ کا اتفاقی فیصلہ تھا، اسے آپ کسی بھی طور پہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہ کہ آپ کی ولادت کے ساتھ ہی آپ کی قیادت کی بھی بشارت دے دی گئی تھی۔ اس حوالے سے نور العارفین حضرت سیّد شاہ ابوالحسین احمد نوری قادری برکاتی قدس سرہٗ سجادہ نشین خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ شریف کے ارشادات دیکھے جاسکتے ہیں۔ حضور نور العارفین نے ولادت کے وقت ہی حضور مفتیٔ اعظم ہند کو اپنے حلقۂ غلامی میں سمیٹ لیا تھا۔ یہ بیعت و ارادت خانقاہِ برکاتیہ کی روایت کے خلاف تھی۔ خانقاہِ برکاتیہ مجاہدات کے بغیر کسی کے سر پہ ارادت کی دستار نہیں سجاتی۔ بغیر مجاہدات کے پالنے میں بیعت و خلافت کی دستار سے شرفیاب ہونا صرف حضور مفتیٔ اعظم ہند کا امتیاز ہے۔ سر پہ دستار بھی سجائی گئی اور بے شمار تبرکات و بشارات سے بھی بہرہ ور کیے گئے چونکہ آپ کو عالم پناہ ہونا تھا۔

اہل اللہ سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں لیکن دنیا میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی حیات کی ہر سانس کرامت شعار ہوتی ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کا شمار دنیا کی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کا اسمِ مبارک ایسا تقدس مآب اسمِ مبارک ہے کہ جس کاغذ پہ لکھ دیا جاتا ہے اس کاغذ کا مقدر سنور جاتا ہے۔ حضرت رازؔ الہ آبادی نے کچھ اسی انداز میں آپ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

آپ کا اسمِ مقدس ہے کہ اسمِ اعظم
لکھ دیا جائے تو کاغذ کا مقدر چمکے

حضور مفتیٔ اعظم ہند کو ان کے عہد نے محترم، مکرم اور مشرف نہیں کیا بلکہ آپ نے اپنی پارسائی، بزرگی اور تقویٰ شعاری سے اپنے عہد کو مکرم بنا دیا۔ شخصیتیں تنازعات کا شکار ہوتی رہی ہیں لیکن آپ کی ذات تنازعات کی قاتل تھی۔ آپ کا شدید مخالف بھی آپ کی بزرگی و پارسائی پہ یقین رکھتا ہے۔ ایک خدا دوست بزرگ نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں فرمایا کہ میری ان بوڑھی آنکھوں نے حضور مفتیٔ اعظم ہند سے بڑا متقی نہیں دیکھا۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کی ذات ایسی ذات ہے کہ آپ کی کتابِ حیات کے کسی ورق پہ انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔ آپ کے عہد میں دین و شریعت سے جب بھی الجھنے کی کوشش ہوئی آپ نے اپنی زبان و قلم سے اس کا جنازہ نکال دیا۔ ایک ثقہ راوی کا بیان ہے کہ حضور مفتیٔ اعظم ہند کے جرأت مندانہ اقدام نے دین مصطفیٰ کو بچالیا، جس سے دنیا پہ ظاہر ہوگیا کہ مصطفیٰ رضا خاں نام ہے دین محمدی علیہ التحیۃ والثناء کی حفاظت کے لیے خدائی انتخاب کا وہ

اسلام کا بطلِ جلیل اور استقامت کا ایسا جبلِ عظیم تھا کہ نازک سے نازک وقت میں بھی اس کے پیروں میں لغزش نہ آسکی۔حضور مفتیٔ اعظم ہند کے حوالے سے راوی کا یہ بیان چمنستانِ حیات کو لالہ زار بنا دیتا ہے کہ بخاری و مسلم کا سننے والا جس یقین و اذعان کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے رسولِ کریم ﷺ کے اقوال سنے، اسی یقین و اذعان کے ساتھ حضور مفتیٔ اعظم ہند کو دیکھنے والے کو یہ حق ہے کہ کہے ہم نے رسولِ کریم ﷺ کی چلتی پھرتی سچی تصویر دیکھی ہے۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند نے دنیا کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں زندگی گذارنے کا جو شعور دیا ہے آپ کے عہد میں اس شعور کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ کہتے ہیں کہ اصحابِ فقہ و فتاویٰ کا شعور جہاں تھک کر بیٹھ جاتا تھا حضور مفتیٔ اعظم ہند کے شعور کی وہاں سے ابتدا ہوتی تھی۔ وہ آدمیت کی روشن علامت تھے۔ وہ فخر انسانیت تھے۔ وہ سنّت و شریعت کا محسوس پیکر تھے۔ ان کے عمل کو دیکھ کر اصحابِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے پورے عہد کو شعورِ دین و شریعت سے آشنا کیا۔ دنیا ان کی دہلیز پہ سر پٹکتی رہی پھر بھی اسے درونِ خانہ آنے کی کبھی اجازت نہیں ملی۔ ان کے عہد کا اعتراف ہے کہ وہ دنیا میں رہ کے بھی انہوں نے دنیا کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر اوقات سوالیوں کے ہجوم میں رہتے تھے۔ کوئی سائل کبھی ان کے در سے نامراد نہیں لوٹا۔ لیکن یہ تاریخ کا عجوبہ ہے کہ انہوں نے خود کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ وہ اپنے معمولات کے باب میں بھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی کی ہر سانس سنّت و شریعت کے نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کے عہد میں کوئی ان کا مثل تھا نہ مثیل۔ وہ اس لیے بڑے نہیں تھے کہ اعلیٰ حضرت کے شہزادے اور جانشین تھے بلکہ وہ خود بھی بہت بڑے تھے۔ لیکن انکسار کا عالم یہ تھا کہ ؎

میرے اعمال کا بدلا تو جہنم ہی تھا
میں تو جاتا مرے سرکار نے جانے نہ دیا

یہ موقع نہیں ہے کہ حضرت مفتیٔ اعظم ہند کے امتیازات، خصوصیات اور تحفظات پہ گفتگو کی جائے۔ ان کی زندگی از ابتدا تا انتہا اقوالِ مصطفیٰ جانِ رحمت و افعالِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی آئینہ دار رہی۔ ان کی ہر سانس سے عبادت کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ ان کی ذات ایک ایسی کتاب ہے جسے بار بار پڑھنے کے بعد بھی قاری کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ ان کے ذکر و فکر سے مسائل اور مصائب دونوں دور ہوتے ہیں، وہ دلوں کو توڑنے کے لیے نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اس حوالے سے ان کے روشن نشانات تاریخ کے پنوں میں محفوظ ہیں۔ ان کے ہاں جو احساسِ ذمہ داری ملتا ہے ان کے عہد میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کے ہاں آدابِ زندگی اور نازِ بندگی کا جو فلسفہ ملتا ہے اس کی بھی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی ذات اسلامی معاشرے کا ناز بھی تھی اور نیاز بھی۔ برسوں فلک گردش کرتا ہے تب جا کر کوئی حضور مفتیٔ اعظم ہند جیسی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی ذات نادرِ دہر بھی تھی اور نادرِ روزگار بھی۔ انہوں نے اپنی خدمات اور توجہات سے اپنے عہد کو رشک شمس و قمر بنا دیا تھا۔ آج کی دنیا اس عہد کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اب وہ کتابوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے، اس کا نفاذ آگ کے دریا سے گذرنے جیسا عمل ہے۔ آج تک ان کی کوئی سیرت نہیں لکھی گئی، کوئی سوانح نہیں ترتیب دی گئی۔ جماعت اہلسنّت اس قرض کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ ان کے حال و احوال پہ ماضی میں جو مضامین و مقالات لکھے گئے ہیں بار بار انہی کو دہرانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند کو ان کے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اور برادرِ اکبر حجۃ الاسلام حضرت مولانا مفتی شاہ حامد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی جانب سے جو ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں، ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں انہوں نے جو قائدانہ، عارفانہ اور مجاہدانہ رول ادا کیا ہے محراب و منبر سے آج بھی اس کا اعتراف ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہوتا رہے گا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے جو علم و فکر کا چراغ روشن کیا تھا اس کی لو کبھی مدھم نہیں ہوئی۔ چونکہ انہوں نے علم و خبر

کی جو بساط بچھائی تھی اس میں پورا دینی نظام سمٹ آیا تھا۔ باطل قوتیں نظریاتِ اسلامی کو مشکوک بنانے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ اعلیٰ حضرت کی ذمہ داری پورے دینی نظام کو بچانا ہی نہیں تھا اسے خطرات سے محفوظ بھی کرنا تھا۔ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں ان کی ذات کبھی غفلت کی شکار نہیں ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں کبھی نیند کا خمار نہیں دیکھا گیا۔ ان کی فکر کی آغوش میں پورا عرب وعجم سمٹ آیا تھا۔ ان کے جانشین بھی رحمت الٰہی کی آغوش میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ انہیں جو خلفاء، تلامذہ، مستفیدین اور احبّا ملے ان کی آنکھیں بھی دینی احساسات وتصورات کے خمار سے سرشار تھیں۔ ان کے خلفاء کی تعداد دوسو سے زائد ہے اور سب کا شمار اپنے عہد کے نادرانِ دہر میں ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی جماعت بھی نادرانِ دہر و نابغانِ عصر پہ مشتمل تھی۔ اور قیادت کی ڈور ان کے شہزادگان حضور حجۃ الاسلام اور حضور مفتیٔ اعظم ہند کے ہاتھوں میں تھی۔ اور دونوں نے قیادت وسیادت کی روح کبھی مجروح ہونے نہیں دی۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند کی کتابِ حیات کا ہر ورق چاند کی چاندنی سے بھی زیادہ صاف وشفاف ہے۔ دین آشنا شخصیات گناہ سے خوف زدہ رہتی ہیں لیکن حضور مفتیٔ اعظم ہند سے گناہ خوف زدہ رہا کرتا تھا۔ ان کی حیات کی کوئی سانس رمزِ شریعت سے بے خبر نہیں تھی۔ ماضی، حال اور مستقبل سب ان کے حضور آئینہ تھا۔ انہیں اپنے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے دینی اقدار وروایات کا بطور وراثت جو اثاثہ ملا تھا اسے انہوں نے تا حیات اپنے سینے سے لگائے رکھا اور اس کے نفاذ میں تا حیات کوشاں رہے۔ ان کا جسم پھول سے بھی زیادہ نازک تھا لیکن دینی قدروں کے نفاذ میں انہوں نے پتھریلی زمینوں اور خاردار وادیوں سے بھی گذرنے سے گریز نہیں کیا۔ دینی قدروں کے نفاذ کے وقت ان کا عزم فولادی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ نفاذ اصولِ شریعت کے جب لمحات آتے تھے تو ان کی زبان پہ مصرعہ ہوتا تھا ؎

یادِ حضور کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم

دین وشریعت کے باب میں ان کے حوصلوں کو دیکھ کر جوانوں کو بھی پسینہ آ جاتا تھا۔ ان کی ذات ایک ایسی کتاب ہے جو آج بھی شوق سے پڑھی جا رہی ہے اور بفضل ربی قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند کے بعد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نظریاتی سیادت، حضور حجۃ الاسلام کی فکری قیادت اور حضور مفتیٔ اعظم ہند کی اصولی نیابت کا تاج حضور تاج الشریعہ حضرت مولانا مفتی شاہ اختر رضا خاں قادری نوری قدس سرہٗ (۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۸ء) کے سر اقدس پہ رکھا گیا۔ اعلیٰ حضرت، حضور حجۃ الاسلام اور حضور مفتیٔ اعظم ہند کے دینی، ملی، علمی اور مسلکی جنونِ عشق کا ہر ورق حضور تاج الشریعہ کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔ انہیں جو عہد ملا وہ انتہائی پُرخطر و پُرآشوب تھا۔ ان کے سامنے مسائل بھی تھے اور مصائب بھی لیکن جس کی آنکھوں میں مدینے کا خمار ہوتا ہے وہ مسائل کا ہجوم دیکھتا ہے نہ مصائب سے دل برداشتہ ہوتا ہے۔ وہ نفاذ اصولِ شریعت کی راہ میں ہر طوفان سے بے خوف وخطر گذر جاتا ہے۔ حضور تاج الشریعہ کی آنکھوں سے اعلیٰ حضرت کی علمی چمک، حضور حجۃ الاسلام کی فکری رفعت اور حضور مفتیٔ اعظم ہند کی فقہی بصیرت کا نور جھلکتا تھا۔ انہیں اپنے آباء سے جنونِ عشق بھی ملا تھا، رسوخِ علم بھی ملا تھا اور شعورِ بندگی بھی ملا تھا۔ ان کی کتابِ حیات کے ہر ورق سے مذہبی درد کا زمزم ٹپکتا ہے۔ وہ پوری دنیا کو فکر اعلیٰ حضرت سے آشنا کر دینا چاہتے تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

جہاں میں عام پیغامِ شہِ احمد رضا کر دیں
پلٹ کر پیچھے دیکھیں پھر سے تجدید وفا کر دیں

حضور تاج الشریعہ کی شخصیت کی تفہیم میں بڑے بڑوں سے چوک ہوئی ہے۔ یہ دنیا طلبی کا نتیجہ ہے۔ ان کی شخصیت پہ بے شمار حجابات تھے۔ حجابات دینی بصیرت سے اُٹھتے ہیں۔ ایک بزرگ نے اپنے ایک نادیدہ وکیل کو بھیجا کہ جاؤ دیکھو اندر کچھ ہے یا یونہی ہجوم رہتا ہے۔ وکیل نے خبر دی کہ شخصیت گہری دینی بصیرت رکھتی ہے، وہ عارفِ حق وصداقت ہیں۔ انہیں بہت دور تک دیکھنے کا ملکہ حاصل

ہے۔ دل حرارتِ عشق سے تپش آمادہ ہے۔ ظاہر و باطن میں بڑی مطابقت ہے۔ ان کی آستینوں سے ید بیضاء کا نور جھلملاتا ہے۔ اشتیاقِ دید سے بزرگ کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ دربار میں حاضر ہوگئے۔ حضور تاج الشریعہ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ کسی کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ خود آجاتے اور جلوؤں کا ہجوم دیکھ لیتے۔ یہاں کسی کے آنے جانے پہ کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ بند آنکھوں سے وہاں تک دیکھتے تھے جہاں اہلِ حال و قال کی نگاہیں رسا نہیں تھیں۔ ان کی کتابِ حیات میں اس طرح کے واقعات بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں، ان کی خلوت و جلوت منصبی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے نور سے ہر وقت روشن رہتی تھی۔ وہ اپنے بدترین مخالف کو بھی بڑی آسانی کے ساتھ معاف کردیتے تھے۔ لیکن شرعی اصولوں کے نفاذ میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ان کے شرعی فیصلے سے جس نے اختلاف کیا وہ ہجوم میں ہمیشہ کے لیے گم ہوگیا۔ تاریخ میں اس کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں۔ ان کے مخالفین کہتے تھے کہ ان کے اہلِ عقیدت کی زمینیں سمٹتی جارہی ہیں، لیکن اپنے جنازے میں پوری دنیا کو بلا کر اپنے اہلِ عقیدت کی تعداد بھی بتادی اور بریلی شریف کی مرکزیت کا تناسب بھی بتادیا۔ ایک بزرگ شخصیت سے کسی نے کہا کہ ان کے جنازے میں بیس بائیس لاکھ لوگ شریک رہے ہوں گے۔ بزرگ نے جواب دیا کہ ان کے جنازے میں بیس بائیس لاکھ تو ان کے حاسدین تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کی مقبول ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہیں اپنے آباء سے مذہبی قدریں جو وراثت میں ملی تھیں وہ تاحیات ان قدروں کی تشہیر، ترویج اور تنفیذ میں کوشاں رہے۔ ان کی شخصیت کے ہر رُخ کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت کا ہر پہلو دینی درد سے عبارت ہے۔ انہوں نے زبان وقلم سے زمانے کا ہر وہ بُت پاش پاش کردیا جن سے مذہبی قدروں کو خطرات لاحق تھے۔ ان کی ذات حصارِ حق وصداقت تھی، جو حصار میں آیا وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ہر پیغام سے عالمی برادری کو متأثر کیا ہے۔ ان میں مذہبی شدت تھی، یہ شدت ان کے عہد کا تقاضا تھا۔ اگر ان میں شدت نہ ہوتی تو اسلام دشمن عناصر اسلام کے جسم سے اس کی روح نکال لیتے۔ ان کی شدت نے پورے دینی نظام کو ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کردیا۔ ان کی ذات مشیت کی آواز تھی اس لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے دبا نہیں سکتی تھی۔ ان کے ارشادات کی ہر فائل پہ مدینے کی مہر لگی ہوئی ہے، اس کا اظہار اور اعلان ان کے مرشد گرامی نے بھی کیا ہے۔ ان کے فرامین کی فائلوں میں یہ شہادت دیکھی جاسکتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات شریعت کا ایک ایسا چراغ ہے جسے زمانے کا بڑے سے بڑا طوفان بھی بجھا نہیں سکتا۔ جب مخالف ہوائیں تیز چلتی ہیں تو اس چراغ کی روشنی شعلوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ وہ اپنے عہد میں فکر اسلامی کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ جب شخصیت دینی قدروں کی امین و پاسبان ہوتی ہے تو قدرت اسے تحفظ فراہم کرتی ہے اور اس کے بعد اس کا متبادل پیدا فرماتی ہے تاکہ اس کی فکر کے چراغ کی لَو مدھم نہ ہونے پائے۔ اعلیٰ حضرت پہ قدرت کی بے شمار نوازشات تھیں۔ علوم وفنون، عشق وعرفان اور زہد و پارسائی کی ان کے سر پہ ایسی دستار رکھی جس کی تمثیل صدیوں میں نہیں ملتی۔ انہیں خلفاء، تلامذہ اور مستفیدین کی ایسی جماعت عطا فرمائی جن کے علوم وفنون اور خدمات کی چمک آج بھی دیکھی جارہی ہے۔ انہیں جو صلبی جانشین ملے وہ بھی اپنے عہد کی نابغۂ روزگار شخصیات تھیں۔ جن کے تقوے اور بزرگی کا یہ عالم تھا کہ صورت دیکھ کر دلوں کی کدورتیں نکل جاتی تھیں۔ وضو کے غسالے سے لاعلاج مریضوں کو شفائیں ملتی تھیں اور نفاذِ شریعت کے باب میں صرف شریعت پیش نگاہ ہوتی تھی۔ دنیا علماء کے حضور مسائل پوچھنے کے لیے آتی ہے لیکن ان آقایانِ نعمت کے حضور دنیا مسائل دیکھنے کے لیے آتی تھی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے دینی افکار، خیالات اور اصولیات کا جو ذخیرہ چھوڑا تھا ان کے بعد اس ذخیرے کی ترسیل میں ان کے خلف اکبر حضور حجۃ الاسلام مصروف

رہے۔حضور حجۃ الاسلام کے بعد اس ذخیرے کی ترسیل میں حضور مفتیٔ اعظم ہند مصروف رہے۔حضور مفتیٔ اعظم ہند کے بعد اس کی ترسیل میں حضور تاج الشریعہ مصروف رہے۔مجلّہ ''الکوثر'' اسی ذخیرے کی ترسیل کا ایک پائیدار تسلسل ہے۔''الکوثر'' کے ورق ورق میں اس فکری ذخیرے کی چمک دمک دیکھی جاسکتی ہے۔اگر اعلیٰ حضرت، حضور حجۃ الاسلام، حضور مفتیٔ اعظم ہند اور حضور تاج الشریعہ حیات سے ہوتے اور ''الکوثر'' کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔

حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب میراثِ اسلاف کی ترسیل کا ایک ذوقِ جنوں لے کر سامنے آئے ہیں۔ان کے جذبے میں صداقت بھی ہے، طہارت بھی ہے اور صلابت بھی۔وہ نسلِ نو کی سوچ کا محور، مرکز اور مصدر بدل دینا چاہتے ہیں۔ان کی فکر، فکر رضا سے حرارت لیتی ہے۔یہ شعور، یہ جنوں خیزی اور یہ شوریدگی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ان کی تربیت دینی تصورات کے شور میں ہوئی ہے، ان میں جرأت، بے باکی اور ہر مخالف طوفان سے محاذ آرائی کا حوصلہ بھی ہے۔

جس فکر، جس سوچ اور جس ذوق کی پیشانی پہ میراثِ اسلاف سے خلش کے آثار نمایاں ہیں اس ذوق کی رگوں سے وہ خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔وہ زندگی کے ہر موڑ پہ فکر رضا کا اُجالا دیکھنے کے قائل ہیں۔ان کی تحریرات کے حرف حرف سے اس جذبے کو تقویت ملتی ہے۔ان کی تحریرات کے چلمن سے جو شعور جھانکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبے سفر کے لیے رخت سفر باندھ چکے ہیں۔ان کے حاشیے پر بھی اہلِ درد کی ایک مختصر جماعت نظر آتی ہے جو ان کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرتی رہتی ہے۔ایسے اصحابِ کمال برسوں کی ریاضت کے بعد سامنے آتے ہیں، ایسے افراد کو زندہ رکھنے کا ایک مؤثر ذریعہ ''الکوثر'' ہے۔اہلِ زبان وقلم پلیٹ فارم تلاش کرتے ہیں ''الکوثر'' میراثِ اسلاف کی ترسیل کے جذبے سے سرشار ہے اس لیے اس کی حفاظت ہماری مذہبی ذمہ داری ہے۔

حضرت مولانا محمد ملک الظفر صاحب کی فکریات، نظریات اور احساسات پہ بہت طویل گفتگو کی جاسکتی ہے، لیکن ''الکوثر'' کے صفحات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ان کی فکر کے پیرہن سے اسلاف دوستی کی خوشبو پھوٹتی ہے۔اسلاف واکابر سے انہیں جو شعورِ زندگی ملا ہے، اس کی تشہیر اور ترویج کے لیے ہر وقت وہ باوضو ہوتے ہیں۔مختصر لفظوں میں اگر ان کے احساسات کی تصویر کشی کی جائے تو یہ کہنا مبنی برصداقت ہوگا کہ جس دماغ نے اپنی کتاب ''منجد سے سہارن پور تک'' میں ایک جگہ کہا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اسلام میں دوسرے جنم کا تصور ہوتا تو میں دوسرے جنم میں بھی بریلوی ہی پیدا ہوتا۔مولانا محمد ملک الظفر صاحب اسی دماغ کا عکسِ جمیل اور نقشِ شکیل ہیں۔

انہیں ایک پھول کے روپ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔پھول کی خوشبو پابند سلاسل نہیں ہوتی وہ فولادی حصار میں شگاف ڈال کر بھی انسانی معاشرے کو معطر کر دیتی ہے۔کہتے ہیں کہ۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم نازک بے اثر

پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کیسے کٹتا ہے، اگر آپ اس کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں تو مجلہ ''الکوثر'' کو اپنے مطالعہ کے میز کی زینت بنائیں۔اور اپنی مذہبی فکر کو میراث اسلاف سے ہم آغوش کریں کہ یہی وقت اور حالات کا جبری تقاضا ہے۔



اردو رسائل پڑھنا صرف مطالعہ نہیں، دل کی تطہیر اور فکر کی تازگی ہے۔
آیئے! لفظوں کے ان چراغوں سے اپنا باطن روشن کریں اور ایمان کی حرارت زندہ رکھیں۔

علامہ کامل سہسرامی علیہ الرحمۃ

آلاتِ جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال

ریڈیو کے ذریعے ہلالِ عید کا اعلان کچھ دنوں سے موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور اس بحث کا نقطۂ شباب وہ وقت ہوتا ہے جب ریڈیو اعلانِ رویت کرتا ہے اور مقامی طور پر رویت یا شرعی شہادت نہیں گذرتی۔ چنانچہ سالِ گذشتہ بھی اعلانِ ریڈیو کے بعد بعض مخلصین کا شدید تقاضا تھا کہ اعلانِ عید کر دیا جائے، لیکن خبر اور شہادت میں خاصا شرعی نقص تھا اس لیے ذمہ دار علماء اس تقاضے کا احترام نہ کر سکے۔ چونکہ عید ہر سال آئے گی اس لیے رویت ہلالِ عید کی شرعی حیثیت اسلامی دستور و قوانین کی روشنی میں متعین کر دینا نہایت ضروری تھا۔

شریعت نے جن معاملات میں جو پابندیاں عائد کی ہیں ہمارے لیے ان پابندیوں کا احترام ضروری ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے کسی فرد یا جماعت کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ مسائل فقہ اور امورِ دین میں بطور خود کوئی فیصلہ کرے۔

اذا خلا الزمان من سلطان ذو کفایۃ فالامور مؤکلۃ الی العلماء ویلزم الامۃ الرجوع الیھم۔

جب زمانہ ایسے سلطان سے خالی ہو جائے جو معاملاتِ شرعیہ میں کفایت کر سکے تو سارے کام علماء کے سپرد ہوں گے اور مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ معاملاتِ شرعیہ میں ان کی طرف رجوع کریں۔

امید ہے کہ فقہ کا یہ اہم ترین مسئلہ فقہائے اسلام کی تصریحات کی روشنی میں مفید ثابت ہوگا اور یہ رسالہ عوامی ذہن کے لیے تشفی بخش ثابت ہوگا۔ کامل سہسرامی غفرلہٗ

ماہِ رمضان المبارک کے آخر میں عید کی تیاری کے سلسلے میں بازاروں کی رونق اور خرید و فروخت میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اضافہ ہر لمحہ عید کے انتظار کو شدید سے شدید تر کرتا جاتا ہے۔ چونکہ انتظار کے صبر آزما لمحات سے جلد از جلد نجات پانا انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہے اس لیے زحمت انتظار سے بچنے کے لیے موجودہ ذرائع خبر پر اعتماد کے لیے اصرار کیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کی حیثیت متعین کی جائے کہ عید یا بقرعید کیا ہیں؟

عید یا بقرعید ہمارے تہوار نہیں بلکہ سب کی سب عبادات ہیں اور حاصلِ عبادت خدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ عبادت کے قیود و شرائط بھی محض اسی تعمیل احکام ہی کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ ورنہ نماز مقررہ اوقات، رکعتوں کی تعداد و ترکیب ہر ہر چیز کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ دوپہر کے وقت دو رکعت اور صبح کے وقت بیس رکعت پڑھ لی جائے تو کیا حرج ہے؟

ٹھیک اسی طرح روزہ ہے۔ صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک ہی کیوں؟ ۲۹ / یا ۳۰ / دن کی قید کس لیے؟ ۳۱ / دن کا رکھا جائے تو کیا مضائقہ ہے، ماہِ رمضان ہی کی قید کیوں؟ ان تمام باتوں کا جواب اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ خدا کا حکم اسی طرح ہے اور اس کے احکام کی تعمیل ہی کا نام عبادت ہے۔ انسانی رایوں کے دخل کے بعد عبادت، عبادت نہیں ہوتی۔

اسی طرح غور فرمایئے انتیس (۲۹) تاریخ کو چاند ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ سامنے آئے اور آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی محض انسانی رایوں اور روایتوں سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا

طریقہ بھی خدا اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات ہی میں تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ چاند سورج کے یہ گولے یا ان کا طلوع وغروب ہماری عبادتوں کے محور نہیں، بلکہ عبادت کا مدار حکمِ الٰہی کے اتباع پر ہے، ورنہ اگر محض عقلی طور پر دیکھا جائے تو صبحِ صادق کے پانچ منٹ بعد سحری کھانا یا غروبِ آفتاب سے چند منٹ پہلے افطار کرلینا یقیناً دن بھر کی محنت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ لیکن چونکہ حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی ارتکابِ جرم ہے، لہٰذا اس جرم کی پاداش میں اس طرح کے تمام روزے کالعدم قرار پائیں گے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ۲۹/تاریخ کو چاند ہونے یا نہ ہونے اوراسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ کسی تہوار یا قومی تقریب کی تعیین کے لیے نہیں بلکہ ایک عبادت کے ختم اور دوسری کے شروع ہونے کا مسئلہ ہے تو اس مسئلۂ عبادت کو خالص احکامِ خدا و رسول کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ قرآن، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فقہائے ملّت نے اس میں کیا فیصلہ فرمایا ہے۔

لا تصوموا حتٰی تروہ ولا تفطروا حتٰی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ۔ (بخاری)

روزہ اس وقت تک نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو اور افطار (یعنی ختم روزہ اس وقت تک نہ کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو، اگر چاند تم پر چھپ جائے تو حساب لگالو (یعنی ۳۰/دن پورے کرلو)

الشھر تسع وعشرون لیلۃً فلا تصوموا حتٰی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلٰثین۔ (بخاری)

مہینہ ۲۹/رات کا ہے اس لیے روزہ اس وقت تک نہ رکھو جب تک رمضان کا چاند نہ دیکھ لو۔ پھر اگر تم پر چاند پوشیدہ ہو جائے تو مہینے کی تعداد تیس (۳۰) دن پورے کرلو۔ چاند دیکھ کر روزے کا آغاز کرو اور چاند ہی دیکھ کر افطار (یعنی روزہ ختم کرو)

ان اللہ امدہ للرویۃ۔ (بخاری)

بیشک اللہ نے اس کا مدار رویت پر رکھا ہے۔

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ عید اور رمضان کے لیے چاند دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ایک جماعت چاند دیکھے، یا آسمان ابر آلود ہونے کی صورت میں کم از کم دو مرد عادل یا ایک مرد اور دو عورتیں قاضی یا مفتی شرع کے سامنے بلفظ اشھد یعنی اس طرح گواہی دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں مہینے کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھا۔

لا یقبل فیھا الا شھادۃ رجلین او رجل وامرأتین عدول احرار۔ (درمختار، بحرالرائق)

دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں عادل آزاد سے کم کی گواہی رمضان کے علاوہ مہینوں میں مقبول نہ ہوگی۔

فاکملوا العدۃ ثلٰثین کے تحت ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں۔

فلا تصوموا حتٰی تروا الھلال ای حتٰی یثبت عندکم رویت ھلال رمضان بشھادۃ عدلین او اکثر ویثبت بعدل واحد عند ابی حنیفۃ اذا کان فی السمآء غیم ولا تفطروا حتٰی تروہ ای ھلال شوال، قال ابن مالك حتٰی تثبت رویۃ بشھادۃ عدلین لا باقل بالاتفاق۔

روزہ اس وقت تک نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو یعنی یہاں تک کہ رویت ہلال کی شہادت دو یا اس سے زائد عادل مردوں سے ثابت ہوجائے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک عادل مرد کی گواہی سے بھی رمضان میں شہادت ثابت ہوگی، جبکہ آسمان پر بادل ہوں۔ اور نہ افطار کرو یہاں تک کہ شوال کا چاند دیکھ لو۔ حضرت ابن مالک فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ ہلالِ عید کی شہادت کم از کم دو عادل مردوں سے ثابت ہو، اس سے کم کی گواہی بالاتفاق بے اعتبار ہے۔

لان الاصل بقاء الشھور فلا ینتقل الا بدلیل۔ (ہدایہ)

اصل بات مہینوں کا باقی رہنا ہے کسی دلیل کے بغیر مہینہ نہیں بدلے گا۔

تصریحاتِ بالا سے معلوم ہوا کہ عام رویت نہ ہونے کی صورت میں رمضان کے لیے کم از کم دو گواہ عادل ضروری ہیں اور جب تک کسی

ماہ کے خلاف دوسرے مہینے کا آنا بینۂ شرعی ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اس ماہ کی تبدیلی کا حکم نہ دیا جائے گا اور بینۂ شرعی رویت یا شہادت ہے۔

شہادت اس سچی خبر کو کہتے ہیں جو اثباتِ حق کے لیے مجلسِ قضا میں بالفاظِ شہادت بیان کی جائے۔

وفی عرف اھل الشرع اخبار الحق بلفظ الشھادۃ فی مجلس القضاء۔(فتح القدیر)

فقہا کی اصطلاح میں کسی بات کے لیے بلفظ گواہ قاضی کے سامنے سچی خبر دینے کا نام شہادت ہے۔

معلوم ہوا کہ رویت ہلال خبر محض سے ثابت نہیں بلکہ ثبوت کے لیے خبر بطریق شہادت ضروری ہے۔

چنانچہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ام فضل نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیجا تھا اور انہوں نے رمضان کا چاند شام ہی میں دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اپنا کام ختم کر کے مدینہ آئے تو مدینہ شریف میں انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اپنے جمعہ کی رات میں چاند دیکھنے کی خبر بیان کی اور اس کی بھی خبر دی کہ شام میں حضرت معاویہ اور تمام لوگوں نے جمعہ کے دن سے روزے رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہاں ہم نے سنیچر کی رات کو چاند دیکھا ہے، تو ہم اسی حساب سے روزہ رکھیں گے۔ بلاشبہ تمام اصحابِ رسول ثقہ تھے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی بات کو محض اس لیے قابلِ التفات نہ سمجھا کہ کہنے والا شہادت نہیں دے رہا ہے بلکہ محض خبر سنا رہا ہے۔

لو شھد جماعۃ ان اھل بلدۃ کذا رأو ھلال رمضان قبلکم بیوم فصاموا وھذا الیوم ثلثون بحسابھم ولم یر ھٰولاء الھلال لا یباح فطر غد ولا ترك التراویح فی ھٰذہ اللیلۃ لانھم لم یشھدوا بالرویۃ ولا علی شھادۃ غیرھم انما حکوا رویۃ غیرھم۔
(فتح القدیر، عالمگیری)

اگر ایک جماعت شہادت دے کہ فلاں شہر والوں نے رمضان کا چاند تم لوگوں سے ایک دن پہلے دیکھا ہے پس لوگوں نے روزہ رکھ لیا درآں حالیکہ وہ دن ۳۰/ کا تھا ان لوگوں کے حساب سے اور ان لوگوں نے چاند نہ دیکھا تھا۔(ایسی صورت میں) جائز نہیں ہے کل کا افطار کرنا (یعنی روزہ نہ رکھنا) اور تراویح نہ پڑھنا اس رات کا۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے رویت کی شہادت نہیں دی ہے۔

مختصر یہ کہ ثبوت رویت ہلال کے لیے عام رویت یا شہادت شرعی ضروری ہے اور اس کے بغیر نا قابلِ قبول۔ اب سوال یہ ہے کہ آلاتِ جدیدہ کے ذریعہ شہادت لی جائے تو یہ شہادت عندالشرع قابلِ قبول ہے یا نہیں۔

وائرلیس، ٹیلیفون، ٹیلیگرام، ریڈیو، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ۔ یہ عہد حاضر کی دریافت ہیں۔ اس کے استعمال میں علماء نے اس کا لحاظ ہر قدم پر ضرور رکھا کہ ان چیزوں کا استعمال اسی حد تک رہے جہاں تک قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے اصول مجروح نہ ہوں۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان، خطبہ، تقریر اور وعظ کسی عالمِ دین نے نہیں روکا۔ صرف نماز کے معاملے میں ایک بنیادی اصول پر زد پڑنے کا امکان تھا، اس کے ماتحت سائنس دانوں ہی کے مختلف اقوال کی بنا پر علماء کی رائیں مختلف ہو گئیں، سائنس دانوں میں خود اس پر اتفاق نہیں ہے کہ یہ آواز متکلم کی اصل آواز ہے یا اس کی صدائے بازگشت، اور سائنس دانوں کا یہ اختلاف آج بھی جاری ہے۔ اس میں جدید آلات سے ناواقفیت یا نفرت و محبت کا کوئی دخل نہیں، اصل معاملہ اصولِ دین و شرع کی مخالفت و موافقت کا ہے۔ اسی طرح خبر رسانی کے تمام جدید آلات کی خبروں کو تمام علماء نے بلا اختلاف خبر کی حد تک تسلیم و قبول کیا ہے مگر جہاں جہاں شہادت کی ضرورت اور شاہد کی موجودگی ضروری ہے ان میں نہ دنیا کی عدالت نے انہیں کافی سمجھا، نہ اس پر علماء نے شہادت لینے کی اجازت دی۔ شہادت کے بنیادی اصول کے تحت خط، تار، ٹرنک کال، ٹیلیفون سب کے سب غیر معتبر اور ناکافی ہیں۔

لا یعتمد علی الخط ولا یعمل بہ۔(اشباہ)

خط پر اعتماد کیا جا سکتا ہے نہ اُس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

الخط یشبہ الخط فلا یعتبر ۔(ہدایہ)

خط، خط کے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

الخط یشبہ الخط فلا یلزم حجۃ لانہ یحتمل التزویر ۔(عینی)

خط، خط کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے دلیل نہیں بن سکتا کہ دھوکے کا احتمال ہے۔

الخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ الخاتم ۔(عالمگیری)

کسی کی تحریر سے تحریر ملا دینا بہت مشکل ترین کام ہے لیکن فقہا کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ خط کو شرعی شہادت کے معاملے میں محض امکانی اشتباہ کے تحت ردّ فرما دیا اور جب خط نا قابلِ اعتبار، تو ٹیلیگرام کی حیثیت از خود متعین ہوگئی کہ اس میں لکھنے والے کی تحریر بھی نہیں ہوتی اور بسا اوقات غلطیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح ٹیلیفون پر لی گئی شہادت بھی عند الشرع شہادتِ شرعی نہیں ہوسکتی، اس لیے ہر قسم کی شہادت کے لیے شاہد و مشہود کی ایک جگہ موجودگی ضروری ہے، ان میں سے ایک کی غیر موجودگی بھی شہادت کو غیر معتبر بنا دے گی۔

ولو سمع من وراء الحجاب لا یسعہ ان یشھد لاحتمال ان یکون غیرہٗ اذا النغمۃ تشبہ النغمۃ۔

اور اگر پردے کے پیچھے کوئی بات سنی تو مناسب نہیں کہ اس کی شہادت دے اس لیے کہ (پسِ پردہ) دوسرے کے ہونے کا احتمال بھی ہے کیونکہ آواز، آواز کے مشابہ ہوتی ہے۔

اذا اقرت المرأۃ من وراء الحجاب وتشھد عندہٗ اثنان انہا فلانۃ لا یجوز لمن سمع اقرارھا ان یشھد علی اقرارھا۔

اقرار کیا کسی عورت نے پردے کے پیچھے سے اور دو آدمی اس عورت کی موجودگی کی شہادت بھی دیں جب بھی (پس پردہ اقرار ہو) شہادت جائز نہیں۔

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں فقہا کی احتیاط اور اس کے پیشِ نظر قیود و شرائط سے شہادت کی شرعی اہمیت و نزاکت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی کی آواز کی نقل آسان نہیں لیکن گواہی لینے اور دینے والے کی موجودگی ضروری قرار دے دی تاکہ آواز کی نقل سے کسی دھوکے کا امکان نہ رہے۔ پھر اس طرح کہ شاہد و مشہود کے درمیان کسی طرح کا کوئی پردہ بھی حائل نہ ہو۔ اگر پردہ حائل ہوگا تو بھی شہادت ساقط الاعتبار ہوگی، گواہی دینے والی عورت پردے میں ہو اور اس کی موجودگی کی تصدیق دو مرد کر رہے ہوں کہ یہ فلاں عورت ہے تو بھی نامعتبر اور پابندی کی انتہا یہ ہے کہ اقرارِ شہادت محض چہرہ دیکھ کر قابلِ قبول نہیں بلکہ اقرار کرنے والے کا سراپا قاضی کے سامنے ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ ٹیلیفون پر جو شہادتیں گذریں گی ان میں نہ تو شہادت دینے والا موجود ہوتا ہے، نہ اس کی عدالت معلوم رہتی ہے اور نہ ان حالات میں آواز کا شناسا ہونا کچھ ضروری ہے۔ اس درجہ کمزوریوں اور خامیوں کی موجودگی میں بذریعہ ٹیلیفون لی جانے والی شہادت کسی طرح بھی شہادتِ شرعی نہیں ہوسکتی۔ اور ٹیلیفون کی شہادت جب نامعتبر ہوگی تو اس شہادت کی بنیاد پر ریڈیو کا اعلان بھی قطعی نامعتبر۔

رویت ہلال عید کے لیے بذریعہ ریڈیو حاصل شدہ خبر کو بعض علماء کرام نے قابلِ قبول تسلیم فرمایا ہے۔ لیکن ان حضرات نے بھی مجرد خبر کو مان لینے کے قابل نہیں فرمایا۔ بلکہ بہت ساری شرطوں کے بعد بھی ہر جگہ کے مقامی ذمہ دار علماء کے فیصلے پر اس کا دار و مدار رکھا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ریڈیو کے ذریعہ خبر کو جائز قرار دینے والے علماء کرام مندرجہ ذیل دو فقہی جزئیات کی بنیاد پر اسے تسلیم فرماتے ہیں۔

خبر منادی السلطان عدلا کان او فاسقًا۔ (عالمگیری)

بادشاہِ اسلام کی طرف سے منادی کرنے والے کی خبر قابلِ قبول ہے۔ منادی کرنے والا چاہے عادل ہو چاہے فاسق۔

یعنی سلطانِ اسلام کی طرف سے جس بات کا اعلان کیا جائے گا وہ قابلِ قبول ہے اورریڈیو کا اعلان بھی چونکہ کسی ذمہ دارعالم یا قاضی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور فقہا و متاخرین کی تصریحات میں قاضی سلطان کے قائم مقام ہوتا ہے اس لیے وہ اعلانِ سلطانی کے تحت اعلان وخبر کے حکم میں سمجھا جائے گا اور قابلِ قبول ہوگا۔

(۱) سلطان یا بادشاہ کی طرف سے کسی فاسق کا اعلان قابلِ قبول ضرور ہے لیکن سوال یہ ہے کہ فسق کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ ہے نہ کہ کافر کے ساتھ اورریڈیو پر اعلان کرنے والے شاذ و نادر ہی مسلمان ہوتے ہیں۔ اگر غیر مسلموں کا اعلان بھی قابلِ قبول ہوتا تو یقینی طور پر عالمگیری کی عبارت اس طرح ہوتی: **خبر منادی السلطان مقبول مسلمًا کان او کافرًا**۔ معلوم ہوا کہ کسی غیر مسلم کا اعلان قابلِ قبول نہیں۔ چاہے وہ اعلانِ سلطانی ہی کیوں نہ ہو۔ پس معلوم ہوا کہ ریڈیو کا اعلان غیر مسلموں کے ذریعہ اعلانِ سلطانی پر قیاس کرتے ہوئے بھی درست نہیں۔

(۲) ریڈیو کے ذریعہ اوّل تو ہونے والا اعلان کسی ذمہ دار عالم کی طرف منسوب نہیں ہوتا اور جن خبروں کے ساتھ نسبت ہوتی ہے ان میں بھی بعض نسبت قابلِ غور ہوتی ہے۔ مثلاً کسی صوبے کا ریڈیو کسی بہت ہی ذمہ دار اور قابلِ اعتماد عالم کی نسبت کے ساتھ اعلان رویت کرتا ہے اور نامزد قاضی شرع بھی اسی مقام اور شہر میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں از خود سوال پیدا ہوتا ہے کہ قاضی شرع کی موجودگی میں اپنے جملہ محاسن علمی کے باوصف کسی غیر قاضی کے ساتھ اعلان رویت کی نسبت درست و جائز ہے کہ نہیں۔ واضح رہے کہ اگر کہیں نامزد قاضی موجود ہے تو وہی سلطان کے قائم مقام مانا جائے گا۔ قاضی کی عدم موجودگی میں عالم۔

(۳) سالِ گذشتہ ریڈیو سے اعلانِ رویت کے بعد بذریعہ ٹرنک کال جب رویت کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ جمشید پور، جھاجھا اور غالباً چائباسہ سے شہادت ملی ہے اور اس کی بنیاد پر ریڈیو سے اعلان کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس تھوڑی دیر میں سوائے ٹیلیفون کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا اور اوپر گذر چکا ہے کہ ٹیلیفون کی شہادت کسی طرح بھی شہادتِ شرعی نہیں ہوسکتی اور جب یہ شہادت ہی نامعتبر ہے تو پھر اس کی بنیاد پر جو اعلان ہوگا وہ بھی نامعتبر۔

اعلانِ ریڈیو کے معتبر شرعی ہونے کی دوسری بنیاد یہ ہے۔

والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او روية التضاويل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل۔(شامی)

توپ کی آواز یا روشنی دیکھنے سے گاؤں والوں پر روزہ رکھنا ضروری کیونکہ یہ ظاہری علامتیں غلبۂ ظن کا فائدہ دیتی ہیں اور غلبۂ ظن ایسی حجت ہے جس سے عمل کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

یعنی اگلے زمانے میں جب اس طرح کے آلات ایجاد نہ ہوئے تھے ڈھول بجا کر، روشنی جلا کر یا فائر کر کے اعلان کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور شہر کا یہ اعلان دیہات والوں کے لیے ذریعۂ علم ہوتا تھا۔ اور اس ذریعۂ اعلان کو فقہا واجب العمل فرماتے ہیں۔ اس جزئیہ کی بنیاد پر ریڈیو کی خبر کے قائل علمائے کرام رمضان کے لیے کم از کم ایک ریڈیو اسٹیشن اور عید کے لیے کم از کم تین ریڈیو اسٹیشن کے اعلان کو بعض حضرات نے قابلِ قبول تسلیم فرمایا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض حضرات اس اعلان کو اس ریڈیو اسٹیشن کے چھ سو میل کے حدود میں واجب العمل فرماتے ہیں اور بعض پورے ملک ہندوستان و پاکستان دونوں کے لیے اس طرح کے اعلان کو قابلِ عمل فرماتے ہیں۔

(۱) شامی کا یہ جزئیہ واضح طور پر صرف ہلالِ رمضان کے سلسلے میں ہے۔ علامہ شامی نے ابتدا ہی میں قید صوم لگا کر اس کی حیثیت متعین فرما دی۔ پھر اسی عبارت سے بالکل متصل وہ فرماتے ہیں: **واحتمال كون ذالك لغير رمضان بعيد**۔ مندرجہ بالا جزئیہ کے اس آخری حصے نے تو مکمل وضاحت کردی کہ اس طرح کا احتمال رمضان کے علاوہ بعید ہے۔ اسی لیے اعلان ریڈیو سے رویت ہلال کے ثبوت کو اس جزئیہ پر قیاس کرنا کچھ مناسب نہیں۔

رمضان کے ثبوت ہلال اورعیدین کے ثبوت ہلال میں فرق ہے۔روزہ چونکہ عبادت محض ہے لہٰذااس کے ثبوت کے لیے وہ شرطیں نہیں جو مالی معاملات کے لیے ہوا کرتی ہیں۔عید میں صاحب نصاب پر افطاروصوم کے علاوہ ایک مالی ٹیکس یعنی صدقۂ فطر بھی واجب ہو جایا کرتا ہے لہٰذااس کے ثبوت کے لیے وہی بیّنات معتبر ہوں گے جو مالی معاملات کے لیے معتبر ہوا کرتے ہیں چنانچہ جزئیات فقہ اسی کی شہادت دیتے ہیں۔لہٰذا فقہاء نے جو جزئیات ثبوتِ رمضان کے لیے تحریر فرمائے ہیں وہ ثبوت عیدین میں جاری نہیں کیے جائیں گے۔مثلاً اگر کوئی شخص رمضان کا چاند خود دیکھ لے اوراس کی گواہی قابلِ اعتبار نہ ہوتو اسے روزہ رکھنا واجب ہے لیکن اگر قاضی خود عید یا بقرعید کا چاند دیکھ لےتو باوجودیکہ اس کوظن غالب ہوجاتا ہے لیکن شہادت کی بنیاد پر وہ عیدوقربانی کا حکم نہیں دے سکتا۔لیکن اگر رمضان کا چاند دیکھ لےتو روزے کا حکم دے سکتا ہے۔

لو رآہ الحاکم وحدہٗ خیر فی الصوم بین نصب شاھدوبین امرھم بالصوم بخلاف العید۔

اگر حاکم نے تنہا چاند دیکھا تو رمضان میں اسے اختیار ہے کہ چاہے شاہد تلاش کرے چاہے روزے کا حکم دے لیکن عید کے لیے تنہا حاکم کی رویت کافی نہیں۔

معلوم ہوا کہ عباداتِ محضہ میں ظن غالب سے ثبوت عبادت ہو جایا کرتا ہے لیکن جن عبادات کے ساتھ مالی معاملات بھی شامل ہیں جب تک بیّنات شرعیہ سے نہ حاصل ہوں اس وقت تک ثبوت مکمل نہیں ہوتا۔لہٰذا توپوں کی آواز اورقندیلوں کے جلنے وغیرہ کی جزئیات کے تحت ان سے عیدین کے چاند کا ثبوت جائز نہیں اوران پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کہ یہ جزئیات صرف ہلالِ رمضان کے لیے ہیں۔

(۲) علامہ شامی کی وضاحت کے برخلاف ریڈیو کے اعلان کو ڈھول وقندیل وغیرہ پر قیاس کر کے ہلالِ عید کے لیے مان بھی لیا جائے تو بھی دشواریاں باقی رہتی ہیں۔اس لیے کہ ڈھول کی آواز اورقندیل کی روشنی جہاں تک پہنچے گی وہاں تک کے لوگوں کے لیے صوم رمضان لازم ہے اورعید کے معاملے میں یہ بات ممکن نہیں۔اس لیے کہ ریڈیو کی آواز جہاں جہاں مسموع ہوگی اس پر عمل واجب ہوگا اور یہ اس لیے ناممکن العمل ہے، کہ کہیں صبح ہوگی کہیں شام، کہیں دن ہوگا، کہیں رات۔اگرچہ اس زحمت سے بچانے کے لیے علمائے کرام نے ریڈیو کے اعلان کو علومِ ہیئت کی روشنی میں چھ سو میل کی حد میں قابلِ قبول تسلیم کیا ہے لیکن رویت ہلال کے بارے میں فقہائے کرام اورائمہ نے اختلافِ مطالع کا کوئی امتیاز نہیں فرمایا ہے۔

اختلاف المالطع غیر معتبر علی المذھب وعلیہ الفتوٰی فیلزم اھل المشرق برویۃ اھل المغرب اذا ثبت عندھم رویت اولئك بطریق موجب کما ھو۔ (درمختار)

مطلع کا اختلاف غیر معتبر ہے اوراسی پر فتویٰ ہے۔پس لازم ہے کہ اہلِ مغرب کی رویت اہلِ مشرق کے یہاں شرعی طور پہ معتبر طریقے سے ثابت ہو جائے تو اہلِ مشرق پر بھی اس رویت کا اعتبار لازم ہوگا جب یہ اعلان اپنے موجب اورتقاضے کے مطابق ہو۔

معلوم ہوا کہ احناف کے نزدیک رویت ہلال کے لیے اختلافِ مطالع کوئی چیز نہیں اور جب مطلع کا اختلاف کالعدم ہے اور ریڈیو کا اعلان مدافع کے حکم میں ہے تو پھر اس قیاس پر ایک اعلان ریڈیو سے پوری دنیا میں عید ہونی چاہیے۔اور یہ ممکن نہیں، لہٰذا ریڈیو کے اعلان کو مدافع پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

(۳) جو علمائے کرام ریڈیو سے اعلانِ رویت کو جائز فرماتے ہیں انہوں نے ریڈیو اسٹیشن سے ۶؍سو میل کی حدود میں اس اعلان کو قابلِ عمل مانا ہے۔اور علمائے ہیئت کی تحقیقات کی روشنی میں چھ سو (۶۰۰) میل کو متحد المطلع تسلیم فرمایا ہے۔حالانکہ معاملاتِ شرعیہ اور قوانین اسلامیہ میں علمائے ہیئت کی تحقیقات کا کوئی اعتبار نہیں۔

واتفق الائمۃ الاربعۃ علی انہ لا اعتبار بمعرفۃ الحساب والمنازل۔ (کتاب المیزان)

چاروں اماموں نے اتفاق کیا ہے کہ چاند کے ثبوت میں حساب

اور منازل کا اعتبار نہیں۔ (یعنی شرعی سند نہیں)

لا عبرة بقول الموقتين۔ (ردالمحتار)

چاند کا وقت بتانے والوں کے قول کا اعتبار نہیں۔

جب مطلع کا اختلاف کوئی چیز نہیں اور علمائے ہیئت کی تحقیق معاملات شرعی میں سند نہیں تو پھر اختلاف مطالع کا لحاظ اور چھ سو میل کی حد بندی بھی نامعتبر ہونی چاہیے اور جب یہ نامعتبر ہے تو پھر کسی بھی ریڈیو اسٹیشن کا اعلان پوری دنیا کے لیے واجب العمل ہونا چاہیے۔ چنانچہ سعودی عرب کا اعلان ہلالِ عید ہندوستان سے ایک دن اور بسا اوقات دو دن قبل ہوتا ہے، جس پر عمل کرنا محال، لہٰذا ثابت ہوا کہ ریڈیو سے اعلان ہلالِ عید کو ڈھول اور قندیل پر قیاس کرنا درست نہیں۔

(۴) پھر ریڈیو کے ذریعے اعلان ہلالِ عید کے قائل علماء اختلافِ مطالع کے سلسلہ میں بھی متفق نہیں۔ کچھ لوگوں نے چھ سو میل کی حدود میں ان اعلان کو قابلِ قبول مانا ہے۔ لیکن اس میں بھی بعض حضرات پاکستان کے اعلان ہلالِ عید کو تسلیم نہیں کرتے اور بعض اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ مشرقی ہندوستان کے بہت سے حصے مشرقی پاکستان سے چھ سو میل سے زیادہ کی مسافت نہیں رکھتے۔ اور متحد المطلع ہے اور بعض حضرات ایک دن سے کم فرق والے تمام ممالک کو متحد المطلع تسلیم کرتے ہوئے ان تمام ممالک کے لیے عید قابلِ قبول تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا تقی امین ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی تحقیق کے سلسلے میں واضح طور پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ایک دن سے کم فرق والے ممالک میں ایک دن عید کرنے کی گنجائش رویت کے لحاظ سے (ریڈیو کی خبر سے فیصلہ کی صورت میں) ان سب ممالک میں ایک دن عید کرنے کی گنجائش نکلتی ہے جن میں ایک دن کا فرق لازم نہیں آتا۔ پاکستان والے ہی اپنے عمل سے اسی قول کی تائید کرتے ہیں اور ایک ہی اعلان پر ملک کے دونوں حصوں میں عید ہوتی ہے جبکہ دونوں حصوں کا فاصلہ چھ سو میل سے بہت زیادہ ہے۔ مطلع کے اعتبار سے دونوں حصوں میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا فرق ہے۔ اس اختلاف کے تحت یہ سوال اپنی جگہ قائم رہا کہ ریڈیو کے اعلان کو کتنی مسافت کی حدود میں قابلِ قبول مانا جائے۔ چھ سو میل کی حد مانا جائے یا ایک دن کے فرق کا لحاظ رکھا جائے۔ اور دونوں حالتوں میں زحمتوں سے مفر نہیں۔

(۵) ریڈیو سے اعلان رویت کے قائل حضرات علمائے کرام کے درمیان کم از کم اس بات پر بالکلیہ اتفاق ہے کہ رمضان کے لیے کم از کم ایک ریڈیو اسٹیشن اور عید کے لیے کم از کم تین ریڈیو اسٹیشنوں سے اعلان ضروری ہے۔ ایک اسٹیشن کا اعلان ان حضرات کے نزدیک لائق التفات نہیں۔

(رمضان تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''المجیب'' پھلواری شریف، بابت ماہ نومبر دسمبر ۱۹۴۹ء)

یہ تفصیل اوپر گذر چکی کہ یہ علمائے کرام ریڈیو کے اعلان کو ڈھول اور روشنی یا اعلان حکمِ سلطانی کے قائم مقام تسلیم فرماتے ہوئے قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ لیکن فقہی جزئیات میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ اعلانِ سلطانی ایک سے زائد افراد کریں۔ یا ڈھول اور روشنی کا التزام چند مقامات سے ضرور کیا جائے۔ اگر ایک اعلان ایک مقام کی روشنی دوسری جگہ کے لیے کافی ہے تو ہلال عید کے لیے ایک ہی ریڈیو اسٹیشن کا اعلان کافی ہونا چاہیے۔ اور تین ریڈیو اسٹیشنوں کی قید غیر ضروری ہے۔ البتہ رویت ہلال کی شہادت کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ رمضان میں کم از کم دو مرد اور دو عورتیں ہوں۔ یعنی چاند کی گواہی کے لیے تین انسانوں کی بھی حاجت ہوتی ہے اور شہادتِ ہلال کی اس ضروری شرط کو ریڈیو کے اعلان کے لیے شرط قرار دینا اس بات کا غماز ہے کہ چاہے علمائے کرام ریڈیو کے اعلان کو اعلان ہی تحریر فرمائیں لیکن کسی نہ کسی حیثیت میں یہ اعلان تین کی شرطوں سے مقید ہو کر شاہد اور گواہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اگر اسے محض اعلان ہی سمجھا جاتا تو تین اور ایک کی قید کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اور جب التزامی طور پر اس کا تصور شامل ہو گیا تو اعلان ریڈیو کی حیثیت محض اعلان کی نہیں بلکہ شاہد کی حیثیت ہوئی اور اس اعلان کو کسی بھی حیثیت میں شرعی شہادت کا مرتبہ دینا بالکل غلط ہے۔

اس تفصیلی تحریر کی روشنی میں ریڈیو سے اعلان ہلالِ عید کی شرعی حیثیت متعین ہوگئی اور واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ ریڈیو سے اعلانِ رویت جائز نہیں اور اگر کسی طرح اسے جائز تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہزار دشواریاں اور قدم قدم پر مسئلۂ شہادت کے مجروح ہونے کا احتمال ہے۔لہٰذا صحیح اور محتاط ترین طریقہ وہی ہے جسے محتاط علماء نے بہت غور و فکر کرکے متعین فرمایا ہے کہ جب تک عینی شاہد حدودِ شرعی کے جملہ لوازمات کے ساتھ شہادت نہ دیں، رویت ہلال کا ثبوت قابلِ تسلیم نہ ہوگا۔هذا ما عندي والعلم عند الله

کامل سہسرامی غفرلہٗ

مقامی علمائے کرام کی تائید وتصدیق

عزیز گرامی مولانا کامل سہسرامی نے رویت ہلال کے سلسلے میں جو تحقیق کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے اور مجھے اس سے مکمل اتفاق ہے۔ (احقر الزمن محمد ضیاء الحسن)

(۱) محمد صدیق کان اللہ لہٗ مہتمم مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام

(۲) عزیز گرامی مولانا کامل سہسرامی نے رویت ہلال کے متعلق جو تحقیق تحریر کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ حقیر سیّد محمد اظہار حسین سینئر مدرس مدرسہ خانقاہِ کبیریہ سہسرام۔ ۱۷؍رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

(۳) احقر مسیح الزماں (۴) وجاہت حسین غفرلہٗ مدرس مدرسہ خیریہ نظامیہ۔

(۵) احمد حسین عفی عنہ، محلہ قاضی پورہ، سہسرام۔

(۶) والحقيقة ان هذا المقالة اصوب لكن ان ينبغي لاهل العلم والبصائر ان يتدبروا ويتفكروا في هذا المسئلة الضرورية والله ورسوله اعلم بالحقائق۔

فقیر محمد انوار الحق شہودی مدرس مدرسہ خانقاہِ کبیریہ سہسرام

۱۸؍رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

نوٹ

اس سلسلے میں ملک کے مختلف مکتبۂ فکر کے ذمہ دار اور نمائندہ اداروں سے استفتا کیا گیا تھا۔سوال چونکہ ایک ہی تھا اس لیے اس کے جوابات مسلسل درج ذیل ہیں۔

۹۲/۸۶ ے

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ٹیلیفون، ٹرنک کال اور ریڈیو کے ذریعہ رمضان وعیدین کی نماز کے لیے رویت ہلال کا اعلان قابلِ قبول ہے یا نہیں؟

(۱) کسی مقام پر معدودے چند آدمیوں نے چاند دیکھا اور دیکھنے والوں کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی ریڈیو وغیرہ سے اعلان کرے کہ فلاں جگہ رویت ہوئی ہے۔ فلاں فلاں آدمیوں نے چاند دیکھا ہے، اس طرح کا اعلان رویت شرعی کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) فقہا استفاضۂ خبر کی صورت یہ تحریر فرماتے ہیں کہ کسی جگہ سے متعدد جماعت آکر یہ کہے کہ فلاں جگہ چاند ہوا ہے اور وہاں کے لوگوں نے روزہ رکھا ہے یا عید کی ہے تو دوسرے مقام کے لوگوں کا روزہ رکھنا درست ہوگا۔ کیا متعدد جگہوں سے ایک ایک خط یا ٹیلیفون، ٹرنک کال یا ریڈیو کے ذریعہ خبر آجانا بھی استفاضۂ خبر کی صورت میں داخل ہے؟

(۳) اگر کسی مقام یا ادارے کا مستند اور ذمہ دار عالم رویت کی شرعی شہادت لے کر ٹرنک کال یا ریڈیو سے اعلان کرے کہ یہاں رویت کا ثبوت مل گیا ہے تو دوسرے مقامات کے ذمہ دار علماء یا ادارے کو اس خبر کی بنیاد پر اپنے یہاں عیدین کا اعلان کرنے کا حق ہے یا ریڈیو کی اس خبر کو بطور اعلانِ منادی یا مثل ڈھول وغیرہ کے مان کر عوام کو عید کرنے کا حق ہے؟

(۴) کسی ذمہ دار عالم یا ادارے کے متعلق اس بات کا یقین ہے کہ وہ رویت ہلال کی خبر ٹیلیفون، ٹرنک کال وغیرہ کے ذریعہ حاصل کرکے اعلانِ رویت کرتا ہے کیا ایسے ادارے یا شخصیت کی طرف سے کیے گئے اعلان ریڈیو کو شہادتِ شرعی کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟

جواب مفتئ اعظم ہند بریلی شریف

دربارۂ ہلال، ریڈیو، تار، ٹیلیفون، ٹرنک کال، خط اور افواہی خبروں کا اعتبار نہیں، محض ان کی خبر پر احکامِ شرع کی بنا درست نہیں۔ جب تک کہ شرعی شہادت نہ گذرے۔ شہادتِ شرعی یہ ہے کہ دو مرد عادل، متقی یا ایک مرد اور دو عورتیں ثقہ جن کے متعلق جھوٹ کا گمان نہ ہو وہ آکر شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آج ۲۹ / رمضان یا شوال کا چاند دیکھا ہے۔ ہدایہ میں ہے: **بشهادة رجلين او رجل وامرأتين**۔ ریڈیو، ٹرنک کال وغیرہ کی خبریں اگرچہ کسی معتبر شخص یا ادارے کی ہوں شہادتِ شرعی نہیں۔ کہ آڑ سے جو آواز مسموع ہو اس پر احکامِ شرع کی بنا نہیں ہوسکتی کہ آواز، آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔ تبیین الحقائق اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **لو سمع من وراء الحجاب لا يسعه ان يشهد لاحتمال ان يكون غيره اذ النغمة تشبه النغمة**۔ پھر یہ کہ ٹرنک کال وغیرہ پر ایک ہی شخص بولتا ہے۔ اگر وہ سامنے بھی ہو، ثقہ و عادل ہو اور خبر نہیں شہادت ادا کرے جب بھی وہ شہادتِ شرعی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح واللہ اعلم — رضوی دارالافتاء

فقیر مصطفیٰ رضا خاں — بریلی شریف

جواب دارالعلوم اشرفیہ مُبارکپور

آپ کے سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ جدید آلاتِ پیغام رسانی کی خبر نہ شہادتِ شرعی ہے، نہ ان سے چاند کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ نہ ان کی خبر کو استفاضہ کہا جاسکتا ہے، نہ ان پر کسی ذمہ دار عالم کا اعلان شرعی حکم رویت ہلال ہے۔ نہ ان پر کسی کو عمل کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے آپ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم مطالعہ کریں۔ ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عبدالمنان اعظمی خادم دارالافتاء الجواب صحیح دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور اعظم گڈھ، عبدالرؤف غفرلہٗ مدرس دارالعلوم ۲۸ / جمادی الاول ۹۰ھ اشرفیہ مبارک پور دارالافتاء اشرفیہ مبارکپور عبدالعزیز عفی عنہ

جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس

تار، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹرنک کال سے چاند دیکھنا ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اگر انہیں ہر طرح صحیح مان بھی لیا جائے جب بھی یہ محض ایک خبر ہے، شہادت نہیں۔ اور محض ایک خبر سے چاند کا ثبوت نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح بازاری افواہ سے اور جنتریوں اور اخباروں میں چھپنے سے بھی چاند ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ عالمگیری میں ہے: **ان كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة اذا كان عدلا مسلما عاقلا بالغا حرا كان او عبدا ذكرا كان او انثى**۔ یعنی اگر مطلع صاف نہ ہو تو ہلالِ رمضان کے لیے ایک عادل، عاقل، بالغ مسلمان کی شہادت مقبول ہے اور اسی بحث میں آگے عید کے چاند کے بارے میں ہے کہ مطلع صاف نہ ہو تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں تب چاند ہونا مانا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الفقیر شمس الدین امجدی رضوی جونپوری، جامعہ رضویہ بنارس

جواب دارالافتاء جامعہ عربیہ ناگپور

(۱) چاند دیکھنے والا یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا ریڈیو وغیرہ آلاتِ خبر سے اعلان کرے گا تو یہ ایک خبر ہوگی، جو شرعاً چاند کے ثبوت میں نا قابلِ اعتبار و عمل ہے۔

(۲) جبکہ فقہائے کرام نے خط کا اعتبار نہیں کیا اگرچہ کاتب کی دستخط اور تحریر پہچانتا ہو اس پر اس کی مہر بھی ہو کہ: **الخط يشبه الخط والخاتم يشبه الخاتم**۔ تو ٹیلیفون، ٹرنک کال، تار، ریڈیو وغیرہ آلاتِ خبر کا اعتبار کیونکر ہوسکتا ہے۔ اور جب یہ سب نا قابلِ اعتبار ہیں تو کیسے استفاضۂ شرعیہ میں داخل ہوسکتے ہیں۔

(۳) دوسرے مقامات والوں کو بذریعہ خبر اطلاع ہوگی اس لیے ان لوگوں کو عید کرنے کے لیے اعلان کرنے کا حق نہیں ہے اور اس خبر کو منادی اور مثل ڈھول کے اعلان کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ منادی وغیرہ میں اگر کسی کو شک وشبہ ہوگا تو وہ شہر کے مفتی کے پاس جاکر

جہاں شہادتِ شرعیہ سے چاند کا ثبوت ہوا ہے اپنے شک وشبہ کو دور کرسکتا ہے۔لیکن بذریعہ خبر جو اطلاع ہوگی اس میں شک اور شبہ کی گنجائش ہوگی اور اس کے ازالے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

(۴) شہادتِ شرعیہ نہیں دیا جاسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد زین العابدین غفرلہٗ،

خادم دارالافتاء جامعہ عربیہ ناگپور، دارالافتاء جامعہ عربیہ ناگپور

جواب دارالعلوم دیوبند

(۱) رمضان کے چاند میں ایک عادل یا مستور الحال شخص کی خبر بھی معتبر ہے جبکہ وہ خود اپنا دیکھنا بیان کرے۔

ٹیلیفون، ریڈیو پر بولنے والا سامنے نہیں ہوتا کہ سننے والے اس کے عادل یا مستور الحال (غیر ظاہر الفسق) ہونے کا فیصلہ کرسکیں اور **النغمة تشبه النغمة**۔مجمع الانہر کی بنا پر اشتباہ ہوسکتا ہے۔لیکن اگر ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبریں مختلف مقامات سے اتنی تعداد میں آجائیں کہ ان کے صدق کا ظن غالب ہوجائے تو ثبوتِ رمضان کے لیے یہ بھی کافی ہے۔ (شہادت ضروری نہیں) ہلالِ عید کے لیے شہادت ضروری ہے اور شاہد کا حاضر ہونا ضروری ہے، غائب کی شہادت معتبر نہیں۔پس اگر کوئی شخص ٹیلیفون پر کہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو یہ شہادت کافی نہیں۔ریڈیو پر شہادت دے تو وہ بھی کافی نہیں۔نیز اگر ریڈیو پر یہ اعلان ہو کہ فلاں جگہ چاند ہوا ہے یا فلاں جگہ عید ہے تو یہ بھی معتبر نہیں۔ہاں اگر اس طرح اعلان ہو کہ فلاں مسلم حاکم (وزیر وغیرہ) یا فلاں جگہ کے ذمہ دار عالم یا رویت ہلال کمیٹی نے بذریعہ شہادت (ثبوتِ رویت) شرعی ضابطہ کے تحت حاصل کرلیا ہے اور اب وہ کمیٹی اعلان کراتی ہے کہ کل بروز فلاں عید ادا کی جائے تو یہ اعلان صوتِ طبل اور مدافع کے درجہ میں آکر قابلِ قبول ہوگا۔جبکہ مطلع صاف نہ ہو اور اس کو تسلیم کرنے سے مہینہ ۲۸؍ کا نہ رہ جائے اور ۳۱؍ کا نہ ہوجائے۔

(۲) اگر مذکورہ نمبر ا طریقہ پر ریڈیو کا اعلان ہو (جو کہ شرعاً معتبر ہے) تو بغیر استفاضہ کے بھی کافی ہے۔لیکن بغیر ان قیود کے اعلان ہو اور خط، ٹیلیفون، ٹرنک کال سے استفاضہ ہوکر صدق حاصل ہو جائے تب بھی کافی ہے۔

(۳) اس کا جواب نمبر ایک میں آگیا۔

(۴) یہ شہادت نہیں بلکہ ذمہ دارانہ اعلان ہے جو کہ شرعاً معتبر ہوسکتا ہے، بشرطیکہ تفصیل مذکورہ نمبر ایک کے تحت ہو۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مقیم کراچی نے اپنے رسالہ میں اس پر تفصیلی وتحقیقی مدلل بحث فرمائی ہے۔ **من شاء فلیراجع**۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہٗ العبد: محمود غفرلہٗ، دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: بندہ نظام الدین غفرلہٗ

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۹۔۱۰۔۸۹ھ دارالعلوم دیوبند

جواب مظاہر العلوم سہارنپور

حامداً ومصلیاً ومسلماً امابعد۔ ہلالِ رمضان کے علاوہ عید، بقرعید یا کسی دوسرے مہینے کے لیے ثبوتِ ہلال باقاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔اور شہادت کے لیے حاضر ہونا لازمی ہے۔غائبانہ خبروں کے ذریعہ شہادت نہیں ہوسکتی، خواہ وہ آلاتِ خبر رسانی قدیم طرز کے خط وغیرہ ہوں یا جدید طرز کے ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ۔البتہ جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کرکے عید وغیرہ کا اعلان کردیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کردیا جائے تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے اس شہر اور اس کے دیہات و مضافات کے باشندوں کو اس ریڈیو کی خبر پر افطار وعید وغیرہ جائز ہے۔ شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے، صرف وہ فیصلہ نشر کرے جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کے نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے۔نیز جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے وہ الفاظ بعینہٖ نشر کیے جائیں۔ جس ریڈیو پر ایسی احتیاط نہ ہو اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لیے واجب العمل ہے اسی طرح اگر کوئی

قاضی یا مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لیے ہوتواس کا فیصلہ اپنے اپنے حدودِولایت میں واجب العمل ہوگا۔

استفاضۂ خبر میں بھی ان آلاتِ جدیدہ کی خبروں کا اعتبار کیا جائے گا۔اگرملک کے مختلف حصوں اورسمتوں سے دس بیس ریڈیواور ٹیلیفون،ٹیلیویژن یاخط وغیرہ کے ذریعہ خود چاند دیکھنے والوں کی طرف سے اطمینان بخش خبریں آجائیں توان پراطمینان کیا جاسکتا ہے مگراس کی شرط یہ ہے کہ خبر دینے والوں کی پوری شناخت ہوجائے اوروہ یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔یا یہ کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کے سامنے شہادت پیش ہوئی ہے۔اس نے شہادت کا اعتبار کرکے چاند ہونے کا فیصلہ کردیا۔محض ایسی مبہم خبر کہ فلاں جگہ چاند دیکھا گیا ہے استفاضۂ خبر کے لیے کافی نہیں۔رمضان کے چاند میں چونکہ شہادت یا استفاضۂ خبر دونوں شرط نہیں ہیں،ایک ثقہ مسلمان کی خبر بھی کافی ہے اس لیے خط اورآلاتِ جدیدہ کی خبروں پر اس شرط کے ساتھ عمل کرنا درست ہے کہ خبر دینے والے کا خط یا آواز پہچانی جائے اوروہ بچشمِ خود چاند دیکھنا بیان کرے۔اورجس کے سامنے یہ خبر بیان کی جارہی ہے وہ اس کو پہچانتا ہواوراس کی شہادت کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہو۔ٹیلیگرام اور وائرلیس سے آئی ہوئی خبروں میں چونکہ خبر دینے والے کی شناخت نہیں ہوسکتی اس لیے محض ایسی خبروں سے ہلال ثابت نہیں ہوگا۔البتہ ٹیلیفون،ٹیلیویژن،ریڈیو پرآواز کی شناخت ہو جاتی ہے،توجب یہ معلوم ہوکہ خبر دینے والا کوئی ثقہ مسلمان عاقل وبالغ وبینا ہے اورخود اپنے چاند دیکھنے کی خبر دے رہا ہے تواس صورت میں رمضان کا اعلان کرایا جاسکتا ہے۔اوراگرخبر دینے والے پرمکمل اعتماد نہ ہوتو رمضان کا اعلان کرانا بھی درست نہیں۔امید ہے کہ اس تحریر سے جناب کے جملہ سوالات کا جواب ہوگیا۔

فقط۔ حررہ احقر عبدالعزیز عفی عنہ

جواب صحیح ہے ۲۵؍شوال المکرم ۱۳۸۹ھ

یحییٰ غفرلہٗ   دارالافتاء

۲۷-۱۰-۸۹ھ   مظاہر العلوم سہارنپور

جواب ندوۃ العلماء لکھنؤ

ریڈیو کی محض یہ خبر کہ فلاں جگہ چاند ہوا یا عید ہوئی۔عید کرنے اور روزہ ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔اسی طرح یہ کہ میں نے چاند دیکھا ہے اس کی بھی ریڈیو پرشہادت دینا کافی نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی قاضی شہر یا ہلال کمیٹی جس کے افرادمسائل سے واقف ہوں،اور حسب قاعدہ شرعیہ رویت کی تحقیق کرتے ہوں۔تحقیق کے بعد ریڈیو سے اعلان کریں یا کرائیں تو یہ اعلان معتبر ہوگا۔اس اعلان کو ان مقامات پرتسلیم کیا جائے گا جہاں مطلع صاف نہ ہواوراگرمطلع صاف ہے تو پھر مقامی طورپرایک جم غفیر کا دیکھنا ضروری ہوگا۔نیز ریڈیو کے اعلان کے مطابق مہینہ ۲۸؍دن کا بھی نہ ہوتا ہواوراس اعلان پرمہینہ ۲۸؍دن کا ہوتا ہوتو پھر یہ اعلان تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

ٹیلیفون کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کچھ پہلے سوالات وغیرہ کرکے یہ یقین کرلیا جائے کہ ٹیلیفون کرنے والا شخص مطلوب ہی شخص ہے،اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔تواس کی خبر بحیثیت خبر کے معتبر ہوگی۔اب اگروہ خبر دیتا ہے کہ یہاں کے ذمہ دارلوگوں نے رویت ہلال کا فیصلہ کردیا ہے تو یہ خبر معتبر ہوگی۔اس پرعمل کرنا جائز ہوگا۔اوراگروہ رویت ہلال کی شہادت دے تو بحیثیت شہادت کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ضروری ہوگا کہ باقاعدہ حاضر ہوکر وہ شہادت ادا کرے۔

(نوٹ) قاضی یا ہلال کمیٹی کو جولوگ تسلیم کرتے ہوں گے انھیں کے لیے ان کی تحقیق واعلان لازم ہوگا۔

فقط

محمد ظہور ندوی عفا اللہ عنہ

دارالافتاء   دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ندوۃ العلماء لکھنؤ   ۲۸؍شوال ۸۹ھ

□□□□

مفتی شمشاد حسین رضوی، گھنٹہ گھر، بدایوں
mshusain45@gmail.com

وقار کی خموش کسوٹی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ”حضرت انسان“ کو بہت سی خوبیوں ،کمالات اور بے پناہ قوتوں سے نوازا ہے۔ جمالیات کا مرقع بنایا ہے اور اس بات کی توفیق مرحمت فرمائی ہے کہ جو قوتیں انہیں عطا ہوئی ہیں۔ان کا استعمال سرعت و تیز گامی کے ساتھ کریں۔ تحقیق و جستجو میں صرف کریں جو چیزیں انہیں معلوم ہیں۔ ان کا سہارا لے کر فکر و استدلال سے کام لیتے ہوئے عروج و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ جو کچھ معلوم نہیں ہے اسے معلوم کرنے کی کوشش کریں مگر شرط یہ ہے کہ حدود کے دائرے میں رہ کر اس راہ پر سفر کریں۔ معلومات کے توسط ہی سے غیر معلوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہی معلومات حدود اور دائرے ہیں۔ اس دائرے سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ جو دائرے سے باہر ہو جاتا ہے اوندھے منھ گر جاتا ہے۔ یہی وہ راہ مستقیم ہے جس پر چل کر اہل علم اپنی شخصیت کو روشن و تابناک بناتے ہیں۔ اپنی جمالیات میں اضافہ کرتے ہیں خود بھی سنورتے ہیں اور غیروں کو بھی سنوارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اسی سے فکر و نظر اور استدلالی قوت با کمال ہو جاتی ہے۔ یہی وہ سیدھی راہ ہے جس پر انسان چل کر راہ حق پا لیتا ہے وہ انسان کس قدر کامیاب انسان ہے جو منزل مقصود کو جا پہنچتا ہے۔ یہ کسی ایک انسان کی راہ نہیں ہے بلکہ ہر اس اہل علم کی راہ ہے جس کے قدم ناز کے نشانات سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات میں کیا شک؟ کہ جو بھی کامیاب ہوا ہے اسی راہ پر چل کر ہوا ہے جس نے یہ راہ چھوڑ دی وہ تو پھر چھوٹ گیا ہر طرف سے محروم ہو گیا۔اعتدال کی راہ سے منحرف ہو گیا اکابر اور اصاغر کی نگاہوں سے بھی گر گیا ایسے افراد کو کیا ملتا ہے؟ کچھ نہیں ملتا ہے! ہاں خودنمائی اور خود ستائش اس کا نصیب ہو جاتا ہے۔اندھے کنوے میں خود بھی گر جاتا ہے اور اپنے ساتھ والوں کو بھی گرا دیتا ہے۔ یہ وہ منحرف راہ ہے جو نہ ہموار ہوتی ہے اور نہ سپاٹ۔ اس راہ میں تو اندھے کنویں ہی ملتے ہیں اور مہلک نشیب وفراز۔ کوئی اس پر چلے تو کیسے چلے؟ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جو رہنما ہوتا ہے اسے سوچ سمجھ کر اس پر قدم رکھنا چاہیے۔ وہ نوع انسانی کا ایک فرد ہو یا قائد و رہنما ہو۔ اپنی قوم کا سردار ہو یا پھر اس قوم کا کوئی فرد ہو یہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہتا ہے چاہے وہ عالم ہو یا مفتی ہو شیخ ہو یا پیر ہو۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہی پابندی ہے کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے وہ راہ حدود کے دائرے میں ہے یا نہیں ہے؟ اگر دائرے میں ہے فبہا اگر دائرے سے باہر ہے تو یہ انحراف ہے کیونکہ انحراف سے نہ کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ مستقبل میں اس سے روشنی ملتی ہے۔ اس بات میں کیا شک؟ کہ جو انحراف کی راہ پر چلتا ہے وہ موجودہ عظیم الشان شخصیات اور اکابر و مشائخ کی راہ سے منحرف ہو جاتا ہے تو خود بھی زخم خوردہ ہو جاتا ہے اور غیروں کو بھی زخم خوردہ بنا دیتا ہے نہ اسے چین ملتا ہے اور نہ سکون میسر ہوتا ہے۔ اسی آسمان کے نیچے اس کی جو درگت بنتی ہے یہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں روز روشن کی طرح نمایاں ہے اور اسے سب جانتے ہیں۔ اس بات کو وہ بھی جانتا ہے جو کچھ نہیں جانتا ہے اور وہ بھی جانتا ہے جو بہت کچھ جانتا ہے مگر اس کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ وہ اس سانحے تک نہیں پہنچ

پاتا ہے اس کی آنکھوں میں ایسا مرض لاحق ہوجاتا ہے کہ اسے سیدھی راہ بھی الٹی دکھائی دیتی ہے۔ ایسوں کو اچھا انسان بھی برا دکھائی دیتا ہے۔ اور میٹھا بھی اسے کڑوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس قدر بہرا ہوجاتا ہے کہ حق کی آواز بھی اس کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی ہے۔ ایسی تاریک اور پر پیچ راہ میں چلنے سے دامن تار تار ہوجاتا ہے اور خاردار وادیوں میں چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس قسم کے راستوں سے پرہیز کیا جائے اور ان راہوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی راہ ہے۔ ان کے نقوش قدم کی پیری کرنے میں ہماری اور آپ کی بھلائی ہے۔ اسی بے راہ روی کی وجہ سے قوم کے اندر بے اعتمادی کی لہر پیدا ہوتی ہے اور عوام وخواص کے مابین بے چینی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس طرح کی بے راہ روی صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں اکابر کی خاموشی سے ہزاروں کی قسمتیں سنور جاتی تھیں اور ان کی مبارک زبان سے جو تقدس آمیز کلمات نکلتے تھے۔ یقین جانیے وہ صرف کلمات طیبات نہ ہوتے تھے بلکہ ان کلمات کے ایک ایک حرف سے رشد وہدایت کے آب زلال کی چھینٹیں جھڑتی تھیں۔ انہی چھینٹوں سے دماغ تروتازہ ہوتا تھا اور دل کی دنیا بھی صاف ستھری دکھائی پڑتی تھی۔ جلسوں کا کیا حال ہے؟ یہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہاں سے نہ رشد وہدایت کے چشمے جاری ہوتے ہیں اور نہ کسی کے دل پر اس کا اثر ہوتا ہے شاعروں کا بھی برا حال ہے وہ خلوص وللّٰہیت کے سائے میں نہ نعت پڑھتے ہیں اور نہ ان کے بولوں سے کسی کے دل میں کوئی انقلاب آتا ہے یہ تو گویئے ہیں جو گاتے ہیں اور موٹی رقمیں لے کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے عوام بھی پر جوش دکھائی دیتے ہیں پھر اس کے بعد ان کے دل کی بھٹی بھی سرد ہوجاتی ہے۔ یہ دنیا عجیب وغریب ہے رویا جائے تو کس پر رویا جائے آنسو بہایا جائے تو کہاں آنسو بہایا جائے زخموں کا علاج کیا جائے تو کہاں کہاں کیا جائے یہاں تو پورا جسم ہی زخموں سے بھرا پڑا ہے۔ اور یہ سارے زخم رستے ہوئے زخم ہیں اس پر تو کوئی دوا بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ یہ مرض لا دوا مرض ہے اس کے باوجود اس کا دامن بہت زیادہ وسیع ہے علاج تو کرنا ہے اور کیا بھی جارہا ہے یہ علاج کس کے حق میں مؤثر ثابت ہوتا ہے؟ اور کون اس سے شفایاب ہوتا ہے؟ اور کون اس سے محروم رہتا ہے یہ اس کی قوت استعداد کی بات ہے علاج کرنے والا تو علاج کرتا ہے تن سے بھی کرتا ہے اور من سے بھی۔ جس کا دل اور عقل سپاٹ ہوتی ہے وہ کب کسی کے علاج سے متأثر ہوتا ہے اور جس کا دل معالج کے سامنے جھک جاتا ہے وہی شفایاب ہے اس میں قصور معالج کا نہیں بلکہ اس کا قصور ہوتا ہے جو معالج کے روبرو ہوتا ہے۔ یہ انسان کیسا انسان ہے کہ وہ جس کا کھاتا ہے اسی پر غراتا ہے۔ جو کسی کو بڑا سمجھتا ہی نہیں ہے بلکہ وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے اور خود کو کبر وغرور کے خول میں اپنے آپ کو سجا کر دیکھتا ہے اور دکھاتا بھی ہے۔ تواضع انکساری کیا ہے اس تعلق سے کچھ بھی نہیں جانتا ہے جب وہ اپنے نشے میں دھت ہوجاتا ہے جو سامنے والے کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور خود کو ارسطو اور ابن سینا تصور کرنے لگتا ہے خود کو بڑا سمجھنے کی روایت کہاں سے نکلتی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو اسے اکساتی ہے اس بارے میں وہ خود جانتا ہے اور جو اسے نشتر لگاتا ہے اسے دشمن تصور کرلیتا ہے۔ یہ بات کس قدر بری ہے اسے ہر ایک جانتا ہے اور سمجھتا ہے مگر جناب والا یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں--- یہ ساری باتیں کس کے تعلق سے کہی جارہی ہیں۔ یہ ابھی صیغۂ راز میں ہیں۔ میں بات کررہا ہوں اس شخص کے بارے میں جو منصب قضا پر تو فائز ہوتا ہے مگر اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے۔ نہ وہ اس منصب کو دیکھتا ہے اور نہ اس کہ اسرار ورموز سے واقفیت رکھتا ہے۔ اس کے تقاضے بہت اہم ہوتے ہیں۔ یہ منصب خالصاً لوجہ اللہ ہوتا ہے اور اسے سونپا جاتا ہے جو دینی جذبوں سے سرشار ہوتا ہے۔ یہاں خودنمائی کو کوئی راہ نہیں ملتی ہے اور نہ اس بات کی اجازت دی جاتی ہے کہ دل میں کسی کے تعلق سے بغض وعناد رکھے اور کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور نہ کسی کے خلاف جائے اور نہ کسی کے حق میں اس لیے فیصلہ کرے کہ میں فلاں کی نظر میں محتشم ہوجاؤں۔ یہ کوئی جذبہ نہیں بلکہ سم قاتل ہے جو اچھے بھلے انسان کو مسخرۂ شیطان بنا دیتا

ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاضی کون ہوسکتا ہے اور قاضی کا انتخاب کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے؟؟

قاضی کون ہوسکتا ہے؟

قاضی وہی ہوسکتا ہے جو منصب قضا کی نزاکتوں اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت رکھتا ہو۔ ہرکس و ناکس کو قاضی کا منصب نہیں مل سکتا۔قاضی وہی ہوسکتا ہے جسے بادشاہ اسلام یا ان کے نائب نے انتخاب کیا ہو یا پھر ان کی اجازت سے ان کے کسی حاکم نے انتخاب کیا ہو مگر چونکہ ہمارے ہندوستان میں نہ اسلامی حکومت ہے اور نہ کوئی سلطان ہے اور نہ کوئی ان کا مقرر کردہ حاکم ہے۔ اس لیے ان کی طرف سے کسی قاضی کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اسی لیے ہندوستان کے ارباب علم وفن اور اصحاب فکر وشعور نے یا یہ کہا جائے ہندوستان کے دل اور دماغ نے ’’قاضی القضاۃ فی الہند‘‘ اور ’’نائب قاضی القضاۃ فی الہند‘‘ کا انتخاب پیش کیا۔جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اب ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں وہی قاضی ہوسکتا ہے جو ’’قاضی القضاۃ فی الہند‘‘ کے ذریعے منتخب ہوا ہو۔اور جس کا انتخاب نہیں، وہ قاضی نہیں ہوسکتا ہے۔ہاں جو مرجع عوام وخواص فی الفتاوی ہے وہ بھی قاضی ہوسکتا ہے مگر اس وقت جب ’’قاضی القضاۃ فی الہند‘‘ نہ ہو۔اور یہاں تو ہے پھر ان کے ذریعے انتخاب کیے بغیر کوئی کیسے قاضی ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی قاضی بن ہی گیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے رویوں اور قوت پرواز کو دائرے میں رکھے۔بے پر کی اڑان نہ بھرے اور نہ کسی کو نیچا دیکھے اور نہ اپنے آپ کو سب سے اوپر تصور کرے جو ایسا کرتا ہے وہ انصاف و دیانت اور انسانیت کو شرم سار کرتا ہے اس کی کج کلاہی اپنی جگہ مگر سامنے والے کو حقیر تصور کرنے کی روایت وہ زہر ہلاہل ہے جو اسے اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کی بنیادی صلاحیتوں کو بھی برباد کر دیتا ہے ایسا کرنا نہ کل پسندیدہ تھا اور نہ آج۔اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھاری بھرکم بنا کر پیش نہ کرے اور نہ ہی سامنے والوں کو حقیر تصور کرے جو ایسا کرتا ہے وہ سر عام رسوا ہوجاتا ہے۔ بھاری بھرکم شخصیت بھی پیازی ہوجاتی ہے۔

کسی اور قاضی کے علاقے میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ضلع اور علاقے کے اعتبار سے قاضی کا انتخاب ہوتا ہے اور ہر قاضی اپنے علاقے اور ضلع کا مالک ہوتا ہے۔کسی دوسرے قاضی کے علاقے میں مداخلت کی اسے ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔یہی اصول اور یہی ضابطہ ہے مگر نہایت ہی افسوس ہوتا ہے کہ ایک قاضی دوسرے قاضی کے علاقے میں مداخلت کرتا ہے۔یہ ضابطے اور اصول کے اعتبار سے نہ صرف غلط ہے بلکہ انسانیت کے خلاف بھی ہے۔میری جانکاری میں یہ بھی آیا ہے کہ کسی سال عید کے معاملے میں اختلاف ہوگیا مؤناتھ بھنجن کے قاضی نے رویت ہلال عید کا اعلان کر دیا اور اس علاقے کے مسلمانوں نے عید منانے کی تیاری کر لی جیسے ہی ضلع اعظم گڈھ کے قاضی کو معلوم ہوا انہوں نے مؤناتھ بھنجن کے مختلف علاقوں میں بذریعہ فون یہ خبر دینا شروع کر دیا کہ ابھی چاند نہیں ہوا ہے لہٰذا آپ لوگ عید کی تیاری نہ کریں۔مقام غور ہے کہ اس طرح کی خبر دینے کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ مؤناتھ بھنجن کے قاضی نے جو اعلان کیا وہ غلط ہے اور خطا پر مبنی ہے۔ان کا علم ہلکا ہے اور میرا علم بھاری بھرکم ہے۔وہ غلطی پر ہیں اور میں سچا ہوں۔اس طرح ضلع اعظم گڈھ کے قاضی نے سامنے والے قاضی کو حقیر جانا اور اسے کم تر تصور کیا۔کسی غیر کو ہلکا سمجھنے کی جو روایت ہے یہ بہت ہی مضر اور جان لیوا ہے اس سے نہ کسی کے رتبے میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی نگاہ میں اس کی عظمت بڑھتی ہے۔سامنے والے کو کم تر جاننے کی اجازت کس نے دی ہے؟ اور کہاں سے یہ اجازت ملی ہے؟ یہ ایک ایسا ناسور ہے جو شخصیت کو پائمال کر دیتا ہے اور بھاری بھرکم انسان کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کون بھاری ہے اور کون ہلکا ہے؟ اور کسی کو ہلکا جاننے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے جو بھاری ہوتا ہے وہ بھاری ہی ہوتا ہے ان کے اس بھاری پن کو کوئی ختم نہیں کرسکتا ہے کیونکہ اسے کسی انسان نے بھاری نہیں بنایا ہے بلکہ اس ذات گرامی نے بھاری بنایا ہے جو ارض وسما کا خالق ہے۔وہی علم کی دولت عطا کرتا ہے۔وہی فکر وشعور کو تازگی سے نوازتا ہے اور علم وعمل میں برکتوں کی شادابی عطا

کرتا ہے میں کیسے کہہ دوں کہ وہ ہلکا ہے۔ ہاں جو اسے ہلکا تصور کرتا ہے صحیح معنیٰ میں وہی ہلکا ہے اگر وہ ہلکا نہ ہوتا تو کسی کو ہلکا جاننے کی خطا کبھی نہ کرتا۔ یہ بہت ہی بری عادت ہے اللہ تعالیٰ اس سے ہر ایک انسان کو بچائے۔

قاضی بننا کوئی آسان نہیں ہے۔ اگر یہ تاج ہے تو کانٹوں بھرا تاج ہے۔ قاضی کے لئے قدم قدم پر خطرے پائے جاتے ہیں۔ کہ ان کی لغزش سے نہ جانے کتنے لوگوں کی نماز عید رائگاں ہو جاتی ہے۔ اور اس لغزش کے نتیجے میں عوام وخواص کے مابین جو رسوائیاں ہوتی ہیں کہ شخصیت اور دستار علم وفن کرب وابتلا میں مبتلا ہو جاتی ہے اور برسوں کی محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ اس لیے قاضی کے لیے ضروری ہے کہ بہت ہی سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے اور بیدار مغزی کے ساتھ آگے بڑھے اور اس بات سے ہمیشہ ڈرتا رہے کہ کہیں ان کا قدم کسی ناگہانی آفت میں نہ پڑ جائے اور ان کے اس اقدام سے عوام وخواص کے اعتماد کا آئینہ چکنا چور نہ ہو جائے۔ رویت ہلال کا فیصلہ کیا جائے اور ضرور کیا جائے مگر عجلت میں ہرگز نہ فیصلہ کیا جائے اور نہ اس جذبے کے ساتھ فیصلہ کیا جائے کہ ہم سب سے آگے بڑھ جائیں۔ یہ جذبہ یقیناً کسی کا ہو سکتا ہے اور اس کا تو ضرور ہو سکتا ہے جو خود کو بھاری بھرکم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے بلاد کے قاضی حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دائمی قاضی ہیں میرے ہوتے ہوئے دوسرا کون قاضی ہو سکتا ہے؟ شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قاضی جب تک اپنے حدود قضا میں رہتا ہے اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے اور جب وہ اپنے حدود قضا سے باہر چلا جاتا ہے تو اسے فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں اور اگر وہ فیصلہ کر دیتا ہے تو وہ نافذ العمل نہیں۔ مگر آج کل کے قاضیوں کا برا حال ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے اپنے آپ کو قاضی تصور کرتا ہے چاہے ہندوستان کے کسی علاقے میں جائے یا ہندوستان سے باہر کسی اور ملک میں جائے وہ سمجھتا ہے وہ اب بھی قاضی ہے اور وہ فیصلہ کر کے وہاٹس ایپ کے ذریعہ بھیج دیتا ہے یہ فیصلے نافذ العمل نہیں اور نہ ہی اس فیصلے پر رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے۔ جو ایسا کرتا ہے ایک بلائے ناگہانی ہے کو دعوت دیتا ہے۔ یہ کیسی بے سمتی ہے کہ جو نافذ نہیں اسے نافذ تصور کر لیتا ہے۔ میں کیسے کہہ دوں کہ وہ باہر رہ کر بھی قاضی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے نام کے ساتھ قاضی لکھتا ہے تو یہ صرف نام کا قاضی ہے کام کا نہیں۔ یہ یقیناً ایک بلائے ناگہانی ہے جو سرایت کر رہی ہے اور انصاف و دیانت کو شرمسار کر رہی ہے۔ یہ عادت بد کسی کی بھی ہو اور کہیں بھی پائی جائے بہر صورت اس سے بچنا چاہیے تاکہ قاضی بھی خوش رہے اور ان کے علاقے کے مسلمانوں کا اعتماد بھی بحال رہے۔ مسلمان جیئیں تو یقین کے اجالے میں جیئیں اور جو فیصلہ قاضی کرے ان کے فیصلے اس قدر روشن وتابناک ہوں کہ ان فیصلوں سے ان کے دلوں میں اجالوں کی کرنیں اور ذہن وفکر میں بالیدگی کی فضا ہموار ہو اور جب کوئی غلط فیصلہ کرتا ہے تو عوام وخواص کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے اور اور کرب وابتلا میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر ان کے دل سے یہ آواز آتی ہے یہ فیصلہ کوئی فیصلہ ہے ایسا فیصلہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس لیے فیصلہ کرتے وقت قاضی پر لازم ہے انہی کے نقوش قدم پر چلے جو ہمارے اکابر نے صبح قیامت تک کے لیے ثبت فرما دیئے ہیں۔ میں نے جن باتوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے وہ کوئی غلط نہیں ہے بلکہ وہی بات میں نے پیش کی ہے جو عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مصیبتوں سے نجات دے اور مسلمانوں کو صحیح سمتوں میں چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قاضی صرف اپنے علاقے کا قاضی ہوتا ہے اور وہ جو فیصلہ کرتا ہے اسی علاقے تک محدود رہتا ہے جس علاقے کا قاضی ہوتا ہے۔ چاہے وہ بڑا قاضی ہو یا چھوٹا قاضی ہو حتیٰ کہ ''قاضی القضاۃ'' بھی اپنے علاقے کا قاضی ہوتا ہے کوئی قاضی نہ مختلف اضلاع کا ہوتا ہے اور نہ پورے صوبے کا ہوتا ہے نہ پورے ملک کا۔ قاضی کو چاہیے کہ اپنے فیصلے میں اپنے علاقے کا ذکر ضرور کر دے چاہے صراحتاً ذکر کرے یا کنایۃً۔ مگر بہتر یہ ہے کہ فیصلے نامے میں صراحۃً ذکر کر دیا جائے، کنائی انداز میں ذکر کرنے سے بہت سارے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ قاضی یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ فیصلہ کسی خاص علاقے کے لیے ہے اور عوام سمجھ رہی ہے کہ اس میں علاقے کا ذکر نہیں

اس لیے اس پر عمل کرتے ہوئے دوسرے علاقے میں بھی عید کی نماز پڑھی جاتی ہے۔اس رویت کا تعلق کسی بھی ماہ سے ہو۔بہر صورت ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو کسی کو شک وشبہ میں ڈال دے اور لوگ پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔قاضی کا کام پریشانیوں میں مبتلا کرنا نہیں بلکہ ان کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے اور انہیں سکون پہنچانا ہے۔بہت سارے علاقے کے قاضی اپنے اعلان میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ فلاں علاقے کے لیے ہے اور کچھ قاضی نہیں لکھتے ہیں جس کی وجہ سے پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں۔میں اپنی تحریر کے ذریعے کسی کی ذات اور شخصیت کو نشانہ نہیں بنا رہا ہوں اور نہ ایسا کرنا میرے مزاج میں شامل ہے بلکہ میں صرف اور صرف آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا نہ کیا جائے تو بہتر ہے اور یہی سلامتی کی راہ ہے،اسی میں نجات ہے۔

قاضی بننا تو آسان ہے مگر قضا کی ذمہ داری نبھانا بہت ہی مشکل۔بہت سارے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں قاضی تو ہیں مگر صرف نام کے قاضی ہیں۔قضا کے مسائل سے انہیں کوئی واقفیت نہیں۔ہاں ان کے نام کے ساتھ قاضی کا لاحقہ یا سابقہ ضرور ہوتا ہے، مگر قضا کیا ہے اس کے کیا مسائل ہیں اور کس طرح فیصلے کیے جاتے ہیں اس تعلق سے انہیں کوئی جانکاری نہیں۔کیا قاضی ایسا ہی ہوتا ہے؟ نہیں! یہ تو قاضی کے نام پر ایک سیاہ دھبہ ہے۔میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں یہ سچائی اور حقیقت ہے۔اس سے میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں اور نہ ہی کسی کی شخصیت پر نشانہ سادھنا ہے۔بلکہ یہ ایک سچائی ہے جسے بیان کرنا میرا مقصد ہے۔اس تعلق سے سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اس کے لیے کوئی لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہیے اور الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانا چاہیے۔بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی قاضی کے انتخاب میں عجلت سے کام لیا جاتا ہے اور قاضی اسے بنا دیا جاتا ہے جو قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔جس نے خوشامد کر لی انہیں قاضی بنا دیا گیا۔یہ افسوسناک پہلو ہے جس پر ارباب حل وعقد کو بیٹھ کر سوچنا چاہیے اور یہ طے کرنا چاہیے کہ کام وہ کریں جو کارگر اور کامیاب ہو،جس کے انتخاب کے بعد پچھتاوا نہ ہو،جب شریعت کے تناظر میں کسی قاضی کا انتخاب کیا جائے تو پھر وہ قاضی صرف نام کا قاضی نہیں ہو بلکہ کام کا قاضی ہو۔وہ قاضی آزاد نہیں ہو،وہ سمجھدار ہو اور جو فیصلہ لے سوچ سمجھ کر لے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ایسے قاضیوں کی بھی کمی نہیں جنہیں قاضی کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے اور ان کے فیصلوں سے دل کے غنچے کھل اٹھتے ہیں اور تبسم کی لکیریں ابھر آتی ہیں۔قوم کو ایسے ہی قاضیوں کی ضرورت بھی ہے۔

قاضی کا مطلب مجتہد نہیں ہوتا اور نہ انہیں منمانی طور پر فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ان کا تاج کانٹوں کا تاج ہوتا ہے۔قدم قدم پر ان کے لیے خطرات ہوتے ہیں۔وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔اس کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔اور اس کے دل اور دماغ پر پہرے ہوتے ہیں۔اس کے فکر وفن پر ہزاروں من کا وزن رکھا ہوتا ہے۔اس کے سامنے خاردار وادیاں ہوتی ہیں۔جس راستے سے وہ گزرتا ہے وہ راستے پر خار وادیوں سے ہو کر گزرتے ہیں،اس لیے ضروری ہے کہ انہیں ان راستوں پر چلنا چاہیے جو راستے ہمارے اکابر نے ہموار کیے ہیں۔ان راستوں کے سوا کسی اور راستے پر چلنا خطرات کو دعوت دینا ہے اور کسی دلدل میں گر جانے کے مترادف ہے۔فقہ حنفی ایک روشن ترین اور ہموار راستہ ہے۔جسے خون پسینے سے سینچا گیا ہے اور دماغ سوزی کر کے ہموار کیا گیا ہے۔اس راستے کی نمائندگی سرکار اعلیٰ حضرت سیدی امام احمد رضا فاضل بریلوی نے فرمائی ہے اس راستے کی چمک دمک برقرار رکھنے کے لیے اس دور کے اکابر نے جاں توڑ کوشش کی ہے،یہی وہ راستہ ہے جو سرکار حجۃ الاسلام کا راستہ ہے،سرکار مفتی اعظم کا راستہ ہے،حضرت ملک العلماء اور صدر الشریعہ کا راستہ ہے۔اسی راستہ پر چل کر کوئی حضور حافظ ملت ہوا،کوئی شمس العلماء کے لقب باوقار سے ملقب ہوا۔یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کوئی صدر العلماء اور امام النحو کے لقب سے مشہور ہوا۔نہ جانے اس طرح کے کتنے درخشاں ستارے ہیں جن کی کرنوں سے سرزمین ہندوستاں بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔یہ ستارے بھی اپنے دور کے قاضی تھے اور فیصلے کرتے تھے مگر ان کے فیصلوں سے دل کی دنیا روشن وتابناک ہو جاتی ہے اور فکر و

شعور کے لباسوں میں مسرت وشادمانی کے لعل وگہر ٹکے تھے۔ جہاں شریعت کا احترام تھا اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تابانی پائی جاتی تھی۔ جو ان کے روبرو ہوتا ان کے چہروں پر نور کی کرنیں بکھر جاتی تھیں۔ یہ وہ اکابر تھے جو مسلک اعلیٰ حضرت سے روگردانی کرنے کی بات تو الگ ان کے ذہن وادراک میں اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ افراد ذی وقار تھے جو مسلک اعلیٰ حضرت سے الگ کسی نظریے کی تشکیل کو اپنی موت تصور کیا کرتے تھے۔ جو ان کا قول ہوتا وہی ان کا عمل بھی ہوتا۔ جو سوچتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی سوچتے تھے ان کے کرنے اور سوچنے میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ اب ایسی ہستیاں کہاں؟ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے آشیانوں میں کرگس و کاخ کا بسیرا ہو چکا ہے۔ ان کے نظریات سے نور وضیا کی پھوار برستی تھی اور دور حاضر کے کرگس وکاخ کی سوچ سے تہ بتہ ظلمتیں پھیل رہی ہیں۔ وہ کل تھا اور آج یہ ہے۔ یہ دوریاں قیامت کی دوریاں ہیں۔ وہاں اجالے بسیرا کرتے تھے اور یہاں شدید ظلمتوں کی پرتیں پڑی ہوئی ہیں۔ مقام غور ہے کل اور آج میں کس قدر دوریاں ہیں۔ کل روشنیوں سے بھرا ہوا تھا اور آج اندھیروں اور ظلمتوں کی آماج گاہ ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ماضی کے سہارے ہی حال و مستقبل کی تعمیر نو کی جائے تاکہ نور کی کرنوں سے لباس کے تانے بانے تیار ہو سکیں۔ آج اور کل کے درمیان کے فاصلے دور ہو سکیں۔ جب آج کا رشتہ کل سے منقطع ہو جاتا ہے تو آج اندھیروں اور ظلمتوں کی تعبیر بن کر رہ جاتا ہے۔ ہماری قوم اور ملت کو کل چاہیے یا پھر سیاہ نما آج۔ کل کے سوا کچھ اور نہیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کل کے خطوط پر آج کی تعمیر کی جائے۔ کل کو نظر انداز کر کے آج کو پیش کر دینا بکواس اور نری حماقت ہے۔ جو افراد اپنے آپ کو آج کا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں اور خود کو ارباب حل وعقد تصور کرتے ہیں انہیں ہوش کا ناخن لینا چاہیے۔ تاکہ وہ بھی سلامت رہیں اور ان کی شخصیت بھی مثالی قرار دی جائے اور ان کے نظریات بھی اوروں کے لیے مثالی ہو جائیں۔ حالانکہ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ آج ہم جس راہ پر چل رہے ہیں وہ کل کی راہ سے الگ ہے اور اکابر کے نظریات سے ماورا ہے۔ اس کے باوجود وہ کس نشے میں دھت ہیں کہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں۔ جب کسی قاضی کا مزاج ایسا ہو جائے تو ارباب فکر ودانش اسے قاضی تصور کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اسے اپنے ذہن وفکر پر بوجھ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ سانحہ ہے جو قوم و ملت کو اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ ایسا دور تو کبھی نہیں آیا تھا جو آج آکر سر پر کھڑا ہے۔ یہ کیسی بوجھل زندگی ہے جو رونے نہیں دیتی اور اندر ہی اندر گھلاتی رہتی ہے۔ خدائے برتر وبالا خیر فرمائے اور قوم وملت کو اس بوجھل زندگی سے محفوظ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

قاضی کا فرمان ''بقدر کفایت'' کیسا ہے؟

قاضی شریعت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ مسائل شریعت کی وضاحت کرے اور عوام کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلائے اور اس بات کی تلقین کرے کہ شریعت کے دائرے میں رہ کر اپنی زندگی کے صبح وشام گذارے۔ شریعت کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھے اور نہ اس بارے میں سوچے۔ مگر کچھ قاضی ایسے ہیں جو شریعت کی تشریح نہیں کرتے بلکہ اپنے من کی بات کرتے ہیں اور قوم و ملت کو اسی پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایسا قاضی شرعی قاضی نہیں ہوتا ہے بلکہ من موٹے جذبات اور خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ اس کی مثال ''بقدر کفایت'' ہے۔ یہ ایک محاورہ ہے۔ جب کسی جملے میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ''کم سے کم'' کا معنیٰ لیا جاتا ہے۔ نہ یہ یقین کے معنیٰ میں آتا ہے اور نہ ''اس سے مراد ''ظن غالب'' ہے۔ اس کا تعلق شرعی اصطلاح سے ہرگز نہیں ہے۔ اگر کوئی قاضی ''بقدر کفایت'' کو شرعی اصطلاحات میں شمار کرتا ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے یا صرف اس کی ذہنی اختراع ہے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے شریعت نے یہ کب کسی کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی ذہنی اختراع کو شرعی مصطلحات میں داخل کرے۔ قاضی کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی شریعت نے اور ہمارے اکابر نے جو اصطلاحات مقرر کر دیئے ہیں انہیں کے دائرے میں رہ کر نو پید مسائل کی تشریح وتوضیح کرے۔ خود مجتہد بننے کی کوشش نہ کرے اور نہ اعلیٰ حضرت بننے کی کوشش کرے اور

جب کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی شخصیت داغدار ہوجاتی ہے اور قاضی موصوف رسوائے زمانہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ایسے قاضی اوران کی ذہنی اختراع سے پناہ مانگنی چاہیے۔ میں نے جو بات کہی ہے وہ ناقابل انکار حقیقت اور اصول پر مبنی ہے۔ ثبوت رویت ہلال کے طریقوں میں سے کسی بھی طریقے میں ''بقدر کفایت'' کی پیوندکاری مناسب نہیں نہ اصولی اعتبار سے نہ استدلالی قانون سے۔ اس بات کا اعتراف نہ صرف مجھے ہے بلکہ ان افراد ذی وقار کو بھی ہے جو علم فقہ سے واقف ہیں اور اس کی نزاکتوں کو سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ''بقدر کفایت'' کی پیوندکاری کسی قیامت سے کم نہیں ہے اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو قاضی ایسا کرتا ہے اسے قاضی بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس پر لازم ہے کہ فوری طور پر اس سے سبک دوش ہوجائے اور کسی اور کو قاضی بنایا جائے۔ یہ صرف ایک مطالبہ نہیں بلکہ ایک امر ضروری ہے جس کا احساس اہل علم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ وہ افراد احساس ذمہ داری سے عاری ہیں جو ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہیں۔ ایسے لوگوں کی ٹولی بھی کوئی ٹولی ہے جو نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کبھی کبھی ایسا کھیل کھیل جاتے ہیں جو انسانیت انصاف اور دیانت کے خلاف ہوتا ہے۔ میری ان باتوں سے کسی کو ناراض ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ سارے افراد ذی وقار کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وقت رہتے ہی کوئی فیصلہ لیا جاسکے۔

استفاضہ اور بقدر کفایت

ثبوت رویت ہلال کے طریقوں میں ایک طریقہ ''استفاضہ'' بھی ہے۔ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے کوئی عام بولی نہیں اور نہ کوئی لسانی یا ادبی بولی ہے۔ جب اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو فوری طوری پر ذہن شریعت کی طرف مبذول ہوجاتا ہے اور اس کے معنیٰ شرعی کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ اس کا معنی اس قدر مشکل نہیں کہ اسے جاننے کے لیے دور دراز کا سفر کیا جائے اور کسی سے اس کا معنی پوچھا جائے۔ اس کی وضاحت علم فقہ کی مختلف کتابوں میں دستیاب ہے۔ بہار شریعت اور فتاویٰ رضویہ میں بھی ہے۔ میں فتاویٰ رضویہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں:

''**طریق پنجم:** استفاضہ یعنی جس اسلامی شہر میں حاکم شرع قاضی اسلام ہو کہ احکام ہلال اسی کے یہاں سے صادر ہوتے ہیں اور خود عالم اور ان احکام میں علم پر عامل وقائم یا کسی عالم دین محقق و معتمد پر اعتماد کا ملتزم و ملازم ہے یا جہاں قاضی شرع نہیں تو مفتی اسلام مرجع عوام و متبع الاحکام ہو کہ احکام روزہ وعیدین اسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہیں عوام کالانعام بطور خود عید و رمضان نہیں ٹھہرا لیتے وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب یک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بر بنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی مجرد بازاری افواہ خبر اڑ گئی اور قائل کا پتہ نہیں پوچھیے تو یہی جواب ملتا ہے کہ سنا ہے یا لوگ کہتے ہیں یا بہت پتہ چلا تو کسی مجہول کا انتہا درجہ ومنتہائے سند دو ایک شخصوں کے محض حکایت کہ انہوں نے بیان کیا اور شدہ شدہ شائع ہوگئی۔ ایسی خبر ہرگز استفاضہ نہیں بلکہ خود وہاں کی آئی ہوئی متعدد جماعتیں درکار ہیں جو بالاتفاق وہ خبر دیں یہ خبر اگرچہ نہ خود اپنی رویت کی شہادت ہے نہ کسی شہادت پر شہادت نہ بالتصریح قضائے قاضی پر شہادت، نہ کتاب قاضی پر شہادت مگر اس مستفیض خبر سے بالیقن یا بہ غلبۂ ظن ملتحق بالیقین وہاں رویت صوم وعید کا ہونا ثابت ہوگا اور جب کہ وہ شہر اسلامی احکام و حکام کی پابندی دائمی ہے تو ضرور مظنون ہوگا۔ کہ امر بحکم واقع ہوا۔ تو اس طریق سے قضائے قاضی کہ حجت شرعیہ ہے ثابت ہوجائیگی اور یہیں سے واضح ہوا کہ تاریک شہر جہاں نہ کوئی قاضی شرع نہ مفتی اسلام یا مفتی ہے مگر نااہل۔ جسے خود احکام شرع کی تمیز نہیں جیسے آج کل کے مدعیان خامکار خصوصاً وہابیہ، خصوصاً غیر مقلدین وغیرہم فجار۔ یا بعض سلیم الطبع سنی ناقص العلم ناتجربہ کار یا مفتی محقق معتمد عالم مستند ہے مگر عوام خود سر اس کے منتظر احکام نہیں پیش خویش اپنے قیاسات فاسدہ پر جب چاہیں عید و رمضان قرار دے لیتے ہیں۔ ایسے شہروں کی شہرت بلکہ تواتر بھی اصلاً قابل قبول نہیں کہ اس سے کسی حجت شرعیہ کا ثبوت نہ ہوا (فتاویٰ رضویہ جلد دہم ص ۴۱۸۔ ۴۱۹)

یہ استفاضہ کی پوری بحث ہے جسے سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ بحث کامل اور مکمل ہے۔اس میں سے نہ کچھ حذف کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی لفظ شامل کیا جاسکتا ہے۔سیدی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے فتاوی اور تحقیق انیق کے تعلق سے ہمارے اکابر کا یہی نظریہ رہا ہے۔بسا اوقات حضور شمس العلماء مصنف قانون شریعت فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت نے جو تحریر فرمادی ہے وہی کامل مکمل اور اٹل ہے نہ کوئی لفظ ہٹایا جاسکتا ہے اور نہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔استفاضہ کی اس پوری بحث میں ـ''بقدر کفایت'' کا نہ کوئی ذکر ہے نہ اس کا کوئی سراغ ملتا ہے۔جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ''بقدر کفایت'' کی بحث کا استفاضہ سے کوئی لینا دینا نہیں۔باوجود اس کے قاضی خامکار نے استفاضہ کے بحث و مباحثہ میں ''بقدر کفایت'' کو داخل کرکے علم وفن اور فکروشعور کے خاموش سمندر میں ہل چل مچادی ہے اور سنجیدہ دل ودماغ رکھنے والے افراد ذی وقار کو بے چین کردیا ہے۔یہی سبب ہے کہ اہل علم کے مابین ''بقدر کفایت'' کا انطباق کیا جائے تو کیسے کیا جائے۔کیا اس کا انطباق ہوسکتا ہے یا نہیں۔اسی سوال کو جاننے کے لیے ذیل کی بحث کا مطالعہ کیا جائے اور متانت وسنجیدگی بروئے کار لاتے ہوئے اس کا فیصلہ کیا جائے۔

استفاضہ اور ''بقدر کفایت'' کے مابین'' انطباق ہے یا نہیں؟

اولاً۔استفاضہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسلامی شہر سے خبر مستفیض آتی ہے اسی خبر مستفیض کو'' استفاضہ کہا جاتا ہے۔قاضی موصوف جو ''بقدر کفایت'' کی نمائندگی کرتے ہیں ان پر لازم ہے کہ اسے ثابت کرے کہ ''بقدر کفایت'' اسلامی شہر کے مترادف ہے یا متبائن۔اگر مترادف ہے تو اس کی دلیل پیش کی جائے اور اگر متبائن ہے تو انطباق صورت کہاں؟

ثانیاً۔اسلامی شہر سے مراد وہ شہر ہے جس میں'' حاکم شرع قاضی اسلام ہو کہ احکام ہلال اسی کے یہاں سے صادر ہوتے ہیں اور خود عالم اور ان احکام میں علم پر عامل وقائم'' بتایا جائے'' بقدر کفایت'' میں وہ کون سا حرف ہے جس سے'' حاکم شرع قاضی اسلام مترشح ہوتا ہے اور اس میں کون سا ایسا حرف ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ'' احکام ہلال اسی کے یہاں سے صدور ہوتے ہیں۔اگر'' بقدر کفایت میں ایسا کوئی حرف ہے تو اس کی نشاندہی کی جائے اور اگر ایسا کوئی حرف نہیں ہے تو پھر استفاضہ اور'' بقدر کفایت'' کے مابین انطباق کا دعوی کیسا؟ قاضی یا تو اپنا دعویٰ پیش کرے ورنہ'' بقدر کفایت'' سے اپنا دامن بچائے۔اور ہرگز اپنے لئے یہ تصور نہ کرے کہ میرا ہی کہا ہوا مستند ہے۔اس طرح کا دعوی کرنا محض ہفوات وبکواس ہے۔اور اس سے عصمت و پارسائی کا دامن تار تار ہوجاتا ہے۔عالم وہی ہوتا ہے جو اپنے من کو بچالیتا ہے اور کسی خطا کے اعتراف میں لیت ولعل سے کام نہیں لیتا ہے۔عالم باکمال وہ نہیں جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر ڈٹا رہتا ہے۔۔۔دعوی تو یہ کہ ہم بھاری بھرکم ہیں اور حقیقت حال کچھ اور ہی ہے

ثالثاً۔استفاضہ کی بحث میں اس بات کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ'' علم دین محقق ومعتمد پر اعتماد کا ملتزم وملازم ہے'' اگر'' بقدر کفایت'' ہی استفاضہ ہے کیا اس کے اطلاق سے یا اس کے لکھ دینے سے استفاضہ کی مذکورہ وضاحت وتشریح کی طرف تبادر ذہنی ہوتا ہے؟ اگر ہاں! تو اس کی وضاحت کی جائے اور اگر نہیں تو آپ کا دعوی'' بقدر کفایت'' بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کو اصل سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔اس طرح کا دعوی کرنا کم از کم کسی قاضی کے لیے نہ صرف نامناسب ہے بلکہ اس کی شخصیت کو بھی داغدار کردیتا ہے۔

رابعاً۔استفاضہ کی بحث میں یہ جملہ بھی آتا ہے کہ'' جہاں قاضی شرع نہیں تو مفتی اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ احکام روزہ وعیدین اسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہیں'' میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ'' بقدر کفایت'' کے مفہوم میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے دامن میں مذکور بالا عبارت سما جائے اگر ہاں تو جناب والا اس کی وضاحت کریں اور بتائیں کہ وہ کیسے ہوسکتا ہے اور اگر نہیں تو اس کی ترجمانی'' بقدر کفایت'' سے کیونکر ممکن ہوسکتی ہے۔آپ کو تو علم کا دعوی ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے تو

اس کو ثابت کرنا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہ ذمہ داری برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو اس بات کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے کہ استفاضہ کی بحث میں اس ''بقدر کفایت'' لانا میری خطا ہے۔ جو اپنی خطا کا اعتراف کر لیتا ہے وہ مہان ہو جاتا ہے اور جو اپنی خطا پر ڈٹا رہتا ہے وہ بے مہان ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ مہان بن کر رہنا چاہتے ہیں یا پھر بے مہان؟

خامساً۔ اہل علم کے درمیان یہ بات پوشیدہ نہیں کہ استفاضے کی بحث میں یہ امر ضروری پایا جاتا ہے کہ ''اسلامی شہر سے متعدد جماعتیں آتی ہیں اور اپنے علم سے رویت ہلال کی خبر دیتی ہیں۔ ان سب کا یہ خبر دینا ہی ''خبر مستفیض'' کہلاتا ہے اور ''خبر مستفیض'' ظن غالب کو مستلزم ہوتی ہے اور ''ظن غالب'' علم فقہ میں ملحق بالیقین ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''بقدر کفایت'' میں یہ صورت نمایاں ہوتی ہے یا نہیں ؟اگر ہوتی ہے تو اس کی وضاحت کی جائے۔ اور اس کے مالہ وما علیہ کی نوعیت بھی بیان کی جائے اور نہیں ہوتی ہے تو اس شاخ کو پکڑنے سے کیا فائدہ جو اچھے خاصے بھلے انسان کو زمین پر اوندھے منھ گرا دے

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی لعظیم۔

سادساً۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ''بقدر کفایت'' سے تاریک شہروں کی ترجمانی کی گئی ہو اور ایسا بھی ہو سکتا ہے اس میں افواہ کو جگہ دی گئی ہو یا پھر یہ کہا جائے اس کے ذریعے خبر احاد کا تصور پیش کیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''بقدر کفایت کو'' ثبوت رویت ہلال کا ایک نیا طریقہ گڑھ لیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسے کون تسلیم کرے گا اور ''بقدر کفایت'' کی صورت میں کوئی کیوں روزہ رکھے گا اور کیوں عید منائے گا؟

یہ فیصلہ ہمیں نہیں بلکہ اہل اسلام کو کرنا ہے اور ارباب فکر و دانش کو کرنا ہے۔ جب کوئی بگڑتا ہے تو صرف وہی نہیں بگڑتا ہے بلکہ بہت سارے لوگوں کو لے کر بگڑتا ہے ادارہ بھی بدنام ہوتا ہے اور افتاء و قضاء کے لیے بھی ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہتی بلکہ قوم وملت بھی لے کر ڈوب جاتا ہے اور عوام میں بھونچال پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جو اپنوں کو کرب و آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے اور غیروں کو جگ ہنسائی کا موقع دیتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ''بقدر کفایت'' کوئی اصول نہیں۔ کوئی ضابطہ نہیں اور نہ کوئی نظریہ ہے یہ تو ایک پگھلا ہوا شیشہ ہے جو چاہے اور جس آکار میں چاہے اسے ڈھال سکتا ہے۔ اس میں نہ ضرورت کا معنیٰ ہے اور نہ ظن غالب کا۔ اس میں نہ ظن کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور نہ وہم کا۔ تو پھر مذکورہ معانی میں سے کسی معنی کا یہ باعث کیسے ہو سکتا ہے۔ واہ کیا عقلمندی ہے کہ ''نا'' کو ''ہاں'' کر دیا جائے اور ''ہاں'' کو ''نا'' یہ ہنر کہاں سے آیا اور کیسے آیا۔ قاضی کو ضرور بتانا چاہیے۔ وہ کیا بتائیں گے اور اس کے پاس ہے ہی کیا۔ اپنے منھ میاں مٹھو بننے سے کوئی مٹھو نہیں ہو جاتا ہے اس کے لیے عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس مسئلہ میں اکابر کے نظریات اور اصول وضوابط کی پاسداری کریں کہ یہی سیدھی راہ ہے اور اسی پر چلنے میں فائدہ ہے دین کا بھی اور دنیا کا بھی۔ بس میں اپنی بات اسی پر ختم کرتا ہوں۔ یہ دل لگتی باتیں ہیں کوئی اسے نظر انداز نہ کرے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ قاضیان کو صحیح سمتوں پر چلنے کی توفیق مرحمت ہو۔



مذہبی رسائل محض اوراق کا مجموعہ نہیں، یہ عہد کی فکری ضرورتوں کا جواب اور ملت کی دینی آواز ہوتے ہیں۔ یہ ایمان کو تازگی، فکر کو سمت اور معاشرے کو شعور عطا کرتے ہیں۔ انہی کے ذریعے علمی مباحث، اصلاحی پیغامات اور روحانی تربیت گھروں تک پہنچتی ہے۔

جب رسائل دیانت اور اخلاص سے مرتب ہوں تو وہ خاموش معلم بن کر نسلوں کی رہنمائی کرتے اور فتنوں کے دور میں حق کی شمع روشن رکھتے ہیں۔

مفتی محمد راحت رضا خاں قادری
بانی وسربراہ دارُالعلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

إِزَاحَةُ الْإِشْكَالِ عَنِ الْاِسْتِفَاضَةِ الْمُخْتَرَعَةِ فِي الْهِلَالِ

رویت ہلال اور استفاضے کا خودساختہ تصور

اصول، استدلال اور انحراف کا تنقیدی جائزہ

ادارتی نوٹ: اہلِ سنّت و جماعت کی علمی روایت کا امتیاز یہ رہا ہے کہ یہاں نئی بات پیش کرنے سے پہلے پرانی کتاب کھولی جاتی ہے اور نئی تعبیر تراشنے سے پہلے اکابر کے حاشیے پڑھے جاتے ہیں۔ اس روایت میں حالات کے تحت سہولت کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے مگر جدّت پسندی کی نہیں، فہمِ نو کی قدر کی گئی ہے مگر بے دلیل اختراع کو کبھی سندِ قبول نہیں ملی۔

ان دنوں استفاضۂ خبر کے عنوان سے ایک ایسا "نیا باب" کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کی کنڈیاں بظاہر ''فتاویٰ رضویہ'' سے ملائی جاتی ہیں مگر تالا کہیں اور کا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی تحریرات اس درجہ واضح، منضبط اور محتاط ہیں کہ ان پہ نئی توضیح کم اور نئی تاویل زیادہ حیرت میں ڈالتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے متن کچھ اور کہہ رہا ہو اور شرح اسے کسی اور سمت لے جانا چاہتی ہو۔

حضرت مولانا مفتی راحت رضا خان قادری کا یہ تحقیقی فتویٰ رویتِ ہلال کے باب میں محض ایک علمی اختلاف کا بیان نہیں بلکہ اہلِ سنّت و جماعت کے فکری ضمیر پہ ایک گہری اور بامعنیٰ دستک ہے۔ یہ فتویٰ اس خموش مگر نہایت خطرناک روش پہ سوالیہ نشان ہے جس کے تحت اصول کو سہولت کے تابع اور روایات کو حالات کے رحم وکرم پہ چھوڑ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مولانا موصوف نے نہ صرف مسئلے کی تہہ تک رسائی حاصل کی ہے بلکہ اس فکری لغزش کو اس کے تاریخی پس منظر سمیت پوری صراحت کے ساتھ بے نقاب کر دیا ہے۔

اس تحقیق کا سب سے زیادہ چونکانے والا پہلو یہ ہے کہ جدید آلاتِ مواصلات کو استفاضۂ خبر کا قائم مقام بنانے کی جو تعبیر آج اہلِ سنّت کے بعض حلقوں کی جانب سے پیش کی جا رہی ہے، وہ نہ نئی ہے اور نہ بے مثال۔ یہ بعینہٖ وہی فکر ہے جو آج سے تقریباً پچھتر برس قبل دیوبندی مکتبِ فکر کے بعض علماء کی جانب سے سامنے آئی تھی اور جسے اس وقت اہلِ سنّت و جماعت کے اکابر مفتیانِ کرام نے متفقہ طور پہ اصولِ فقہ کے منافی قرار دے کر واضح طور پہ مسترد فرما دیا تھا۔ آج اسی مردود فکر کو نئے ناموں، نئے اسالیب اور جدید اصطلاحات کے پردے میں پیش کرنا علمی ارتقا نہیں بلکہ فکری تکرار ہے---اور وہ بھی بغیر کسی علمی احتساب کے۔

یہ معاملہ اس وقت مزید سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے جب یہ تعبیر ایسے ادارے کے منصبِ صدارت سے سامنے آئے جس کی اپنی فقہی تاریخ اس کی نفی کرتی ہے۔ مولانا مفتی راحت رضا خان قادری نے محض تنقید پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی ادارے کی سابقہ فقہی دستاویزات کو بطورِ شہادت پیش کر کے یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ اس ذمہ دار، باوقار ادارے سے وابستہ مفتیانِ کرام--- جیسے حافظ ملت حضرت علامہ مفتی شاہ عبدالعزیز محدث مبارک پوری، استاذ العلماء حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف بلیاوی، شیخ العلماء حضرت علامہ مفتی غلام جیلانی اعظمی، حضرت علامہ قاری محمد یحییٰ، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی اور شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین--- نے ٹیلی فون کے ذریعے موصول ہونے والی خبروں کو استفاضۂ خبر کے دائرے میں شامل کرنے سے صاف انکار فرمایا تھا۔ یہ حوالے محض تاریخی

یادداشت نہیں بلکہ ادارہ جاتی موقف کی صریح شہادت ہیں، جن سے صرفِ نظر علمی دیانت کے خلاف ہے۔

ایسے نازک موڑ پہ آ کر معاملہ محض ایک فقہی اختلاف کا نہیں رہتا بلکہ فکری دیانت اور علمی امانت کا سوال بن جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں: یا تو تحقیقِ جدید کے خوش نما عنوان کے تحت جو فکری قلابازیاں برسوں سے جاری ہیں ان سے صاف اور باوقار رجوع کر لیا جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر نئی صورت، ہر نئی آواز اور ہر نئی سہولت شرعی حجت نہیں بن جاتی، یا پھر علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ فتاویٰ اشرفیہ سے وہ تمام فتاوے یک قلم خارج کر کے ان سے برأت کا اظہار کر دیا جائے جو ٹیلی فونک خبروں کو استفاضۂ خبر کے دائرے میں لانے کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔

ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں: ایک طرف روایت کی امانت ہے، جو اصول کی کسوٹی پہ پرکھی گئی ہے اور دوسری طرف وہ تاویل ہے جو سہولت کے نام پہ اصول کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اگر اصول باقی رکھنا ہے تو نتائج کو قبول کرنا ہوگا اور اگر نتائج پہلے طے کر لیے گئے ہیں تو پھر اصول کے احترام کا دعویٰ محض ایک خوش فہمی رہ جائے گا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ وقت بدل گیا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا اصول بھی بدل گئے ہیں؟ اور اگر اصول اپنی جگہ قائم ہیں تو پھر یہ فکری قلابازیاں کس جواز کے تحت کی جا رہی ہیں؟ یہی وہ نکتہ ہے جہاں مولانا کا یہ فتویٰ محض ایک تحقیقی تحریر نہیں رہتا بلکہ ایک اصولی تنبیہ میں ڈھل جاتا ہے۔

فقہ اہلِ سنّت نہ سہولت پسند تجربات کی محتاج ہے اور نہ بدلتے ذرائع کے ساتھ اپنی بنیادیں تبدیل کرتی ہے۔ ذرائع کی تبدیلی، اصول کی تبدیلی کا جواز نہیں بن سکتی۔ استفاضۂ خبر ایک منضبط فقہی اصطلاح ہے، محض خبر کے تیز تر پھیلاؤ کا نام نہیں۔ اس کی اپنی شرائط ہیں، اپنی حدود اور اپنی تاریخی تعبیر ہے۔ اسے جدید آلات کے سانچے میں ڈھال دینا فقہ کے ساتھ محض اجتہادی توسع نہیں بلکہ فکری تصرف اور اصولی تحریف کے مترادف ہے۔

یہاں خاموش رہنا بد دیانتی ہے: فقہ اہلِ سنّت کوئی قابلِ تشکیل مادّہ نہیں کہ منصب، حالات یا دباؤ کے مطابق اس کی ہیئت بدل دی جائے۔ جو چیز کل تک نا قابلِ قبول تھی، وہ آج منصب کے سائبان میں قابلِ استدلال کیسے بن گئی؟ یہ سوال کسی ایک فتوے تک محدود نہیں بلکہ پوری فقہی روایت کی سمت اور مسلکی شناخت سے متعلق ہے۔

مولانا مفتی محمد راحت رضا خان قادری کا یہ فتویٰ دراصل اس ذہنیت کے خلاف ایک باوقار احتجاج ہے جو سہولت کو حکمت اور تغیر کو تجدید کے نام سے پیش کرتی ہے۔ انہوں نے نہ شخصیات کو نشانہ بنایا اور نہ اداروں کے نام لے کر جذباتی حملے کیے مگر دلائل کی مضبوط ترتیب، حوالوں کی صراحت اور تاریخی تسلسل کے ذریعے یہ واضح فرما دیا کہ اصل مسئلہ رویتِ ہلال کا نہیں بلکہ فقہی امانت کے تحفظ کا ہے۔ یہ فتویٰ ہمیں اس بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ رویتِ ہلال محض چاند دیکھنے یا خبر پہنچنے کا مسئلہ نہیں بلکہ امت کے اجتماعی نظم، فقہی وقار اور مسلکی تشخص سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی یہ تحقیق وقتی شور سے بلند ہو کر آنے والے وقتوں کے لیے ایک معیاری اور حوالہ جاتی فقہی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

یہ ادارتی نوٹ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت کی فقہ کو مصلحت کی تجربہ گاہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ جدید آلات کے تابع کر کے اس کی روح مسخ کی جا سکتی ہے۔ جو فکر کل رد تھی، وہ آج محض زمانے کے حوالے سے قابلِ قبول نہیں بن سکتی---مگر یہ کہ اس کے رد کی علمی بنیادیں منہدم کر کے دکھائی جائیں۔

یہ فتویٰ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ بعض مواقع پہ خاموشی جرم بن جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بولنا عبادت اور لکھنا فرضِ کفایہ بن جاتا ہے۔ مولانا مفتی راحت رضا خان قادری نے یہ فریضہ ادا کر دیا ہے، اب اہلِ علم کی ذمہداری ہے کہ وہ منصب کی ہیبت سے بلند ہو کر اصول کی حفاظت کا اعلان کریں، تا کہ فقہ محفوظ رہے، روایت سلامت رہے اور اہلِ سنّت کی شناخت کسی فکری لغزش کی نذر نہ ہو۔ یہ فتویٰ ایک واضح اعلان ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت کی فقہ سہولت کی نہیں، صداقت کی تابع ہے اور جس روایت نے ہمیں شناخت دی ہے، اس روایت کی حفاظت یقیناً ہمارا اصل فریضہ ہے۔

مسئولہ: (قاری) محمد مراد عالم خان رضوی، صدر المدرسین مدرسہ جمالیہ رضویہ، کرپا، سہسرام روہتاس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال برائے فتویٰ وتحقیق

(۱) شرعاً چاند کا ثبوت کن طریقوں سے ہوتا ہے؟

(۲) ٹیلی فون، موبائل، وہاٹس ایپ اور میل وغیرہ برقی آلات و پیغامات کے ذریعہ آج کے زمانے میں اربوں، کھربوں کے کاروبار ہوتے ہیں، آن لائن لوگ میٹنگیں وغیرہ کر کے اپنی بزنس ڈیل فائنل کر لیتے ہیں تو ان بدلتے ہوئے حالات میں چاند کے ثبوت کے لیے بھی ان جدید آلات کا اعتبار کرنا چاہیے کیوں کہ گذرے ہوئے زمانے میں ان آلات سے ویسا یقین و اعتماد اور غلبۂ ظن حاصل نہیں ہوتا تھا جیسا آج کے دور میں ہے کہ آج ان کا درجہ اعتبار و اعتماد اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ کاروبار و معاملات اکثر انہی جدید آلات پر ٹکے ہوئے ہیں۔

(۳) کیا ہر شہر کے لیے علاحدہ علاحدہ شہادت کی ضرورت ہے یا ایک جگہ کی شہادت سے چند جگہ عید منا سکتے ہیں؟

(۴) قاضی کے اعلان کا دائرہ کیا ہے؟ اس کے حدود قضا یا پورا دیار اسلام؟

(۵) کسی شہر میں چاند کی عام رویت ہو جائے اور وہاں کے کثیر تعداد میں معتمد و معتبر افراد دوسرے شہر کے قاضی کو موبائل فون کے ذریعہ خبر دیں، یہ خبر خوب عام ہو جائے اور وہاں کے قاضی کو یقین بھی حاصل ہو جائے تو اس سے استفاضہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ حالاں کہ میں نے آپ کو چند تحریریں بھیجی ہیں کہ جن میں فقہائے کرام اور خصوصیت سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موبائل کے ذریعہ استفاضہ ہو جائے گا۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اعلیٰ حضرت اور دیگر اکابرین علمائے اہل سنت کی عبارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موبائل فون کے ذریعہ استفاضہ ہو جائے گا اگر جواب نفی میں ہو تو قدیم وجدید فقہائے کرام کی تصریحات و آرا کی روشنی میں اعلیٰ حضرت اور دیگر اکابرین علمائے اہلسنت کے موقف و مذہب کو خبر مستفیض کے متعلق تفصیل سے تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی ان تحریروں میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کا بھی تسلی بخش جواب عطا فرمائیں۔

ان تمام سوالات کے جوابات مدلل ومفصل عنایت فرما کر ہمارے اذہان کو اطمینان وسکون عطا فرمائیں۔ اور عند اللہ ماجور ومثاب ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ الْقَمَرَ قَدَراً مَقْدُوراً، وَصَیَّرَ الْهِلَالَ لِشُهُورِنَا دُسْتُوراً، وَجَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوجاً وَّسِرَاجاً وَّقَمَراً مُّنِیراً، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَی مَنْ أَوْمَأَ إِلَی الْقَمَرِ فَانْفَلَقَ بِبَیَانِهِ، وَاسْتَعَادَ غَارِبَ الشَّمْسِ بِبَرَکَةِ بَنَانِهِ، سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ، شَمْسِ الْمَعَارِفِ، وَبَدْرِ اللَّطَائِفِ، وَعَلَی آلِهِ وَصَحْبِهِ الَّذِیْنَ هُمْ نُجُومُ الْهُدَی وَأَقْمَارُ التُّقَی، وَعَلَی التَّابِعِینَ وَالْفُقَهَاءِ الْأَمَاجِدِ، کَاشِفِی الْغَوَامِضِ فِی النَّوَازِلِ وَالْمَقَاصِدِ۔ أَمَّا بَعْدُ:

(۱) الجواب: ثبوت رویت ہلال کے بارے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے فتاویٰ رضویہ جلد چہارم میں سات شرعی طریقے تحریر فرمائے ہیں ان کا خلاصہ فتاویٰ رضویہ اور دیگر کتب فقہ وفتاویٰ کی روشنی میں درج کیا جاتا ہے:

شہادۃ علی الرویۃ:

چاند دیکھنے والے یا دیکھنے والوں کی گواہی، بعض صورتوں میں رمضان المبارک کے چاند کے ثبوت کے لیے صرف ایک مسلمان عاقل، بالغ اور غیر فاسق کی گواہی کافی ہے اور باقی گیارہ مہینوں کے چاند کے ثبوت کے لیے ہر حال میں دو مسلمان عادل مرد یا ایک مرد دو عورتیں مسلمان عادلہ غیر فاسقہ کی قاضی شرع کے حضور شرعی گواہی ضروری ہے۔

شہادۃ علی الشہادۃ:

گواہوں نے چاند خود نہ دیکھا بلکہ دیکھنے والوں نے ان کے سامنے گواہی دی اور اپنی گواہی پر انہیں گواہ کیا، اُنہوں نے اُس گواہی کی گواہی دی۔ یہ وہاں ہے کہ گواہان اصل حاضری سے معذور ہوں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ گواہ اصل گواہ سے کہے میری اس گواہی پر گواہ ہوجا کہ میں گواہی دیتا ہوں میں نے ماہ فلاں سنہ فلاں کا ہلال فلاں دن کی شام کو دیکھا۔ گواہانِ فرع یہاں آکر یُوں شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں نے مجھے اپنی اس گواہی پر گواہ کیا کہ فلاں بن فلاں مذکور نے ماہ فلاں سنہ فلاں کا ہلال فلاں دن کی شام کو دیکھا اور فلاں بن فلاں مذکور نے مجھ سے کہا کہ میری اس گواہی پر گواہ ہوجا۔

شہادۃ علی القضاء:

دوسرے کسی اسلامی شہر میں قاضیِ شرع کے حضور رؤیت ہلال پر شہادتیں گذریں اور اُس نے ثبوتِ ہلال کا حکم دیا، دو شاہدانِ عادل اس گواہی وحکم کے وقت حاضر دارالقضا تھے، انہوں نے یہاں قاضیِ شرع یا وہ نہ ہو تو مفتی کے حضور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں ہمارے سامنے فلاں شہر کے فلاں حاکم یا قاضی شرع کے حضور فلاں ہلال کی نسبت، فلاں دن کی شام کو ہونے کی گواہیاں گزریں اور حاکم موصوف نے اُن گواہیوں پر ثبوت ہلال مذکور شام فلاں روز کا حکم دیا۔

کتاب القاضی الی القاضی:

قاضیِ شرع کے سامنے شرعی گواہی گذری اُس نے دوسرے شہر کے قاضیِ شرع کے نام خط لکھا کہ میرے سامنے اس مضمون پر شہادتِ شرعیہ قائم ہوئی اور اُس خط میں اپنا اور مکتوب الیہ کا نام ونشان پُورا لکھا جس سے امتیاز کافی واقع ہو اور وہ خط دو گواہانِ عادل کے سپرد کیا کہ یہ میرا خط قاضیِ فلاں شہر کے نام ہے وہ باحتیاط اس قاضی کے پاس لائے اور شہادت ادا کرے کہ آپ کے نام یہ خط فلاں قاضی فلاں شہر نے ہم کو دیا اور ہمیں گواہ کیا کہ یہ خط اس کا ہے اب یہ قاضی اگر اُس شہادت کو اپنے مذہب کے مطابق ثبوت کے لیے کافی سمجھے تو اس پر عمل کرسکتا ہے۔

اِستفاضہ:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کے اقوال وتصریحات کی روشنی میں استفاضہ کی توضیح وتشریح تفصیل کے ساتھ یوں فرماتے ہیں:

’’استفاضہ یعنی جس اسلامی شہر میں حاکم شرع قاضیِ اسلام ہو کہ احکامِ ہلال اُسی کے یہاں سے صادر ہوتے ہیں اور خود عالم اور ان احکام میں علم پر عامل وقائم یا کسی عالمِ دین محقق معتمد پر اعتماد کا ملتزم و ملازم ہے یا جہاں قاضیِ شرع نہیں تو مفتیِ اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ احکامِ روزہ وعیدین اُسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہیں عوام کالانعام بطور خود عید و رمضان نہیں ٹھہرا لیتے وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب یک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بربنائے رؤیت روزہ ہُوا یا عید کی گئی مجرد بازاری افواہ کہ خبر اُڑ گئی اور قائل کا پتا نہیں۔ پُوچھے تو یہی جواب ملتا ہے کہ سُنا ہے یا لوگ کہتے ہیں، یا بہت پتا چلا تو کسی مجہول کا انتہا درجہ، منتہائے سند دو ایک شخصوں کے محض حکایت کہ اُنہوں نے بیان کیا اور شدہ شدہ شائع ہوگئی، ایسی خبر ہرگز استفاضہ نہیں بلکہ خود وہاں کی آئی ہُوئی متعدد جماعتیں درکار ہیں جو بالاتفاق وُہ خبر دیں، یہ خبر اگرچہ نہ خود اپنی رؤیت کی شہادت ہے نہ کسی شہادت پر شہادت، نہ بالتصریح قضائے قاضی پر شہادت نہ کتاب قاضی پر شہادت، مگر اس مستفیض خبر سے بالیقین یا بہ غلبہ ظن ملتحق بالیقین وہاں رؤیت صوم وعید کا ہونا ثابت ہوگا اور جبکہ وُہ شہر اسلامی اور احکام وحکام کی وہاں پابندی دوامی ہے تو ضرور مظنون ہوگا کہ امر بحکم واقع ہُوا تو اس طریق سے قضائے قاضی کہ حجتِ شرعیہ ہے ثابت ہوجائیگی اور یہیں سے واضح ہُوا کہ تاریک شہر جہاں نہ کوئی قاضیِ شرع نہ مفتیِ اسلام، یا مفتی ہے مگر نااہل جسے خود احکامِ شرع کی تمیز نہیں، جیسے آج کل کے بہت مدعیان خامکار، خصوصاً وہابیہ، خصوصاً غیر مقلدین وغیرہم فجّار، یا بعض سلیم الطبع سنّی ناقص العلم ناتجربہ کار، یا

مفتی محقق معتمد عالم مستند ہے مگر عوام خودسر، اس کے منتظر احکام نہیں، پیش خویش اپنے قیاساتِ فاسدہ پر جب چاہیں عید ورمضان قرار دے لیتے ہیں، ایسے شہروں کی شہرت بلکہ تواتر بھی اصلاً قابلِ قبول نہیں کہ اس سے کسی حجتِ شرعیہ کا ثبوت نہ ہُوا" الخ۔(فتاوی رضویہ مترجم، ج:۱۰،ص:۴۱۴،۴۱۵، رضافاؤنڈیشن،لاہور)

اکمالِ عدت:

کسی وجہ سے انتیس کی رویت ثابت نہ ہوسکی تو جب ایک مہینے کے تیس دن کامل ہوجائیں تو ماہِ متصل کا ہلال خود ہی ثابت ہوجائے گا اگر چہ اس کے لیے رویتِ شہادت حکمِ استفاضہ وغیرہ کچھ نہ ہو کہ مہینہ تیس سے زائد کا نہ ہونا یقینی ہے۔

اعلان یا علامات وامارات:

قاضی کے پاس شرعی شہادت گذری، اس نے اس شہادت پر ثبوت ہلال کا حکم دے دیا اور اپنے اس حکم کو اپنے شہر اور اس کے گرد و پیش، قرب وجوار کے قریات اور آبادیوں کے لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے اعلان عام کروادیا تو اس قاضی کی حدود قضا جن حلقوں کو محیط ہے صرف انہی حلقوں میں اس کے اعلان سے چاند کی رویت کا ثبوت مانا جائے گا خواہ یہ اعلان بذریعہ روشنی یا نقارہ یا توپ یا پھر لکھے ہوئے پرچوں کے ذریعہ ہو جیسا کہ آج کل لیٹر ہیڈ کے ذریعہ اعلان کا رواج عام ہے۔ جو لوگ اعلان کرنے والے کی حدود قضا سے خارج ہیں ان کے لیے اس اعلان سے رویت ہلال کا ثبوت ہرگز نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ ۷ رطریقے مطلقاً ثبوت ہلال کے تھے لیکن دوسرے شہر کی خبر ثبوت ہلال کے لیے اسی صورت میں معتبر ہوگی جب کہ بطریق موجب آئے اور طریقہ موجب ۵ رہیں:

(۱) شہادت رویت (۲) شہادۃ علی الشہادۃ (۳) شہادۃ علی القضا (۴) کتاب القاضی الی القاضی (۵) استفاضہ

آخر کے دونوں طریقوں میں سے "اعلان یا علامات وامارات" از قبیل ولایت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے لوگوں پر جن کی ولایت تسلیم کی ہے ان کے اعلان سے لوگوں پر حکم کا نفاذ بھی تسلیم کیا ہے لیکن در بارِ ثبوت ہلال اس کو فقہائے کرام نے شہر اور حوالیِ شہر تک ہی محدود ومقید رکھا ہے یعنی دوسرے شہر میں اس کا اعلان کسی طریق موجب کو اختیار کیے بغیر معتبر نہیں ہوگا۔

"اکمال عدت"، کسی وجہ سے انتیس کی رویت ثابت نہ ہوسکے تو جب ایک مہینے کے تیس دن کامل ہوجائیں تو ماہِ متصل کا ہلال خود ہی ثابت ہوجاتا ہے بخاری ومسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فأن غم عليكم فا كملو ا العدّة ثلثين"(صحیح البخاری، کتاب الصوم، رقم الحدیث:۱۹۰۷،ص:۵۶۵، مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، بیروت/ صحیح المسلم، کتاب الصیام، رقم الحدیث: ۲۵۱۴،ص:۴۴۲،موسۃ الرسالۃ ناشرون، بیروت)

ترجمہ: اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس کی تعداد مکمل کرو۔

بیان کردہ صرف ان ہی سات طریقوں سے شرعا چاند کا ثبوت ہوگا اس کے علاوہ افواہوں، بازاری خبروں اور سوشل میڈیا کی نشریات، موبائل فون وغیرہ جدید آلاتِ مواصلات کے ذریعہ چاند کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) الجواب: روزمرہ کے معاملات میں خبر کا معتبر ہونا اور بات ہے اور دینی معاملات میں کسی خبر کا معتبر ہونا یا نہ ہونا اور بات ہے، اگر چہ آج کے زمانے میں ٹیلی فون، موبائل، وہاٹس ایپ اور میل وغیرہ برقی آلات و پیغامات کے ذریعہ اربوں، کھربوں کے کاروبار ہوتے ہیں اور لوگ آن لائن میٹنگیں وغیرہ کر کے اپنی بزنس ڈیل فائنل بھی کر لیتے ہیں لیکن لوگوں کے اعمال ثبوت رویت ہلال کی دلیل شرعی تو نہیں ہیں، لوگوں کے ان افعال کے سبب جو رویت ہلال کے طرق شریعت مطہرہ سے ثابت ہیں انہیں منسوخ تو نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شریعت نے جس دینی معاملے کو جس طرح ثابت مانا ہے اسی طرح ہم ثابت ماننے کے پابند ہیں اور جس طریقے کو شریعت نے غیر معتبر مانا

ہے اسے غیر معتبر ماننا واجب ہے۔اب رہی یہ بات کہ ان آلات جدیدہ کے ذریعہ یقین واعتماد اور غلبۂ ظن حاصل ہوجاتا ہے تو اس سے رویت ہلال کا بھی ثبوت ہو جانا چاہیے تو اسے سمجھیں کہ جسے ہم لوگ یقین واعتماد اور غلبۂ ظن کہیں اس سے ہر جگہ حکم شرعی کا ثبوت نہیں ہوسکتا ہے مثال کے طور پر ایک عادل کی خبر مفید غلبۂ ظن اور قابل یقین واعتماد ہے، اور دیانات میں مقبول ومعتبر بھی ہوتی ہے، جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ اپنے رسالہ مبارکہ "الأحلی من السکر لطلبة سکر روسر "[۱۳۰۳ھ] میں تحریر فرماتے ہیں:

"کل کی برف میں شراب ملنے کی خبر... اگر منتہائے سند مسلمان عادل اگرچہ ایک ہی ہو جب بھی احتراز واجب اور برف حرام ونجس۔فإن فی الدیانات لایشترط العدد ویقبل خبر الواحد العدل بلاتردد"۔

ترجمہ: کیونکہ دیانتوں میں گنتی شرط نہیں اور ایک عادل آدمی کی خبر کسی تردّد کے بغیر قبول کی جاتی ہے"۔ (فتاوی رضویہ مترجم، ج: ۴، ص: ۵۳۷،۵۳۸، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس ایک عادل کی خبر دیانات میں اسی لیے تو معتبر ہے کہ اس سے غلبۂ ظن اور یقین واعتماد کا حصول ہو گیا مگر چاند کے معاملے میں ایک عادل کی خبر سوا رمضان کے مقبول ومعتبر نہیں ہے اور رمضان میں بھی بحالِ صفائے مطلع بغیر کسی خصوصیت خاصہ کے معتبر ومقبول نہیں۔ اگر مطلقاً یقین واعتماد اور غلبۂ ظن کا اعتبار ہوتا تو فقہائے کرام اس کی خبر کو غیر معتبر کیوں قرار دیتے۔

فتح القدیر اور فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

''إنما یلزم الصوم علی متأخری الرؤیة إذا ثبت عندھم رؤیة أولئك بطریق موجب حتی لو شھد جماعة أن أھل بلدة قد رأوا ھلال رمضان قبلکم بیوم فصاموا وھذا الیوم ثلثون بحسابھم ولم یرھٰؤلاء الھلال لایباح فطر غد ولا یترك التراویح فی ھذہ اللیلة لأنھم لم یشھدوا بالرؤیة ولا علی شھادة غیرھم وإنما حکوا رؤیة غیرھم'' (فتح القدیر، ج: ۲، ص: ۳۱۴، دار الفکر، بیروت/ الفتاوی الہندیة، ج: ۱، ص: ۲۱۹، دار الفکر، بیروت)

تاخیر سے چاند دیکھنے والوں پر روزہ تب لازم ہوگا جب ان کے ہاں چاند کا ثبوت بطریق موجب شرعی ہو حتیٰ کہ اگر کسی جماعت نے گواہی دی کہ فلاں اہل شہر نے تم سے پہلے ایک دن چاند دیکھا اور انہوں نے روزہ رکھا ہے اور یہ دن ان کے حساب سے تیسواں بنتا ہے، لیکن انہوں نے چاند نہیں دیکھا تو ان کے لیے آئندہ کل عید جائز نہیں اور نہ ہی اس رات کی وُہ تراویح ترک کرسکتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے چاند دیکھنے پر گواہی نہیں دی اور نہ غیر کے چاند دیکھنے کی گواہی پر گواہی دی ہے اُنہوں نے دُوسروں کی رؤیت کو حکایت کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

''ایک جماعت ثقات عدول یُوں گواہی دے کہ فلاں جگہ چاند ہُوا یا فلاں دن اُس شہر والوں نے روزہ رکھا یا آج اُن کے حساب سے فلاں تاریخ ہے ہرگز نہ مانیں گے یہاں تک کہ جو اس پر عمل کرے گا گناہگار ہوگا کہ یہ نہ شہادت رویت ہے، نہ شہادت علی الشہادت، نہ شہادت علی القضا، بلکہ مجرد حکایت ہے جو کسی طرح حجت نہیں''
(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج: ۱۰، ص: ۴۳۲، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ عدول وثقات کی جماعت کی خبر کا بھی اعتبار ثبوت رویت ہلال کے لیے اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ ان کی خبر رویت ہلال کے ان طرق کے موافق نہ ہو جو ثبوت رویت ہلال کے لیے معتبر ہیں اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاند کی رویت کے ثبوت کے معاملے میں صرف وہی غلبۂ ظن مفید ہوگا جو مظان شرعیہ سے حاصل ہو اور اگر غلبۂ ظن غیر مظان شرعیہ سے حاصل ہوا ہے تو خواہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو معتبر نہیں۔

ٹیلی فون، موبائل، وہاٹس ایپ اور میل وغیرہ برقی آلات و پیغامات کے ذریعہ جو یقین یا غلبۂ ظن حاصل ہوتا ہے وہ عرفی ہے اور

چاند کے ثبوت کے لیے وہ دلیل شرعی درکار ہے جسے شریعت نے چاند کے ثبوت کے لیے دلیل بتایا ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"اقول یہ ایک نفیس مسئلہ ہے جس پر فقیر غفر اللہ تعالیٰ لہٗ نے تنبیہ کی، یقین دو طرح کا ہوتا ہے: ایک شرعی کہ طریقۂ شرع سے حاصل ہو۔ دوسرا عرفی کہ باوجود عدم طریقۂ شرعی صرف اپنے مقبولات ومسلّمات یا تجربیات، مشہورات اور قرائن خارجیہ کے لحاظ سے اطمینان حاصل ہوجائے۔ ناواقف لوگ مدرک عرفی وشرعی میں تفرقہ نہ جان کر اسے کافی ووافی ودلیل شرعی گمان کرتے ہیں حالانکہ یہ صریح خطا ہے، مثلاً جہاں شرع مطہر نے شہادت میں عدد شرط کیا دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں ہوں، وہاں ہمارے اعظم کسی معتمد اجل مستند نے جسے افضل اولیا عالم جانیں، اور وُہ واقع میں بھی غوثِ زمانہ ہی ہو۔ شہادت دی کہ میرے سامنے ایسا ہُوا اور میں نے بچشمِ خود دیکھا، ہمیں جو اعتبار اس کے فرمانے پر آئے گا ہرگز دو چار دس بیس کی بات پر بھی اس سے زیادہ نہ ہوگا مگر شرع دوسرا گواہ اور مانگے گی، اور معاملہ زنا میں تین۔ تو اگر ایسے ہی تین گواہی دیں جب بھی نامسموع کہ قرآن کریم نے "بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ" فرمایا، اگر چہ اس میں شک نہیں کہ سامع مطلع کو ان کے ارشاد میں اصلاً محلِ شک نہ ہوگا۔ اسی طرح ہزاروں نظیریں اس مسئلہ کی ہوں گی اور پھر قرائن بے چارے کس گنتی شمار میں ہیں۔ ذی علم کو بارہا واقع ہوتا ہے کہ بہت امور خارجہ کے لحاظ سے چاند ہونے میں اطمینان کامل رکھتا ہے مگر جب تک ثبوت شرعی نہ ہو ہرگز حکمِ رؤیت نہیں کرتا۔ یُوں ہی جب ثبوت میزانِ شرع پر ٹھیک اُترے گا مجبوراً حکمِ رؤیت کرے گا، اگر چہ بنظر امور دیگر کسی طرح ہلال کا ہونا دل پر نہ جمے۔ ایسی ہی جگہ عالم و جاہل کا فرق کھلتا ہے، جب قرائن اس کے خلاف ظاہر ہوتے ہیں جہال حکم عالم پر اعتراض کرنے لگتے ہیں، حالانکہ وُہ جانتا ہے کہ جو میں نے کیا وہی رائے صائب تھی اور مجھ پر بہر حال مدرک شرعی کی پابندی واجب اس امر کی طرف اشارہ زیر یاز دہم بھی گزرا اور ان یقینوں کی زیادہ توضیح رسالہ "أزکی الإھلال" میں مذکور ہُوئی، وباللہ التوفیق وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمدٍ وآلہٖ وصحبہ اجمعین"۔ (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۴۷۷، ۴۷۸، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

لہٰذا صورت مسئولہ میں ٹیلی فون، موبائل، وہاٹس ایپ اور میل وغیرہ برقی آلات و پیغامات کے ذریعے ایک شہر سے دوسرے شہر میں رویت ہلال کا ثبوت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۳، ۴) الجواب: امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، سلطان اسلام، قاضی القضاۃ یا ایک شہر کے قاضی کا اعلان صرف اسی شہر اور حوالی شہر تک معتبر ہے جہاں اس نے اعلان کیا ہے، دوسرے شہر اگر چہ اس کی حدود قضا میں ہی کیوں نہ ہوں ان میں اس کے اعلان کا کوئی اعتبار نہیں ہے جب تک کہ دوسرے شہر میں ان طرق موجبہ میں سے کسی طریقے سے رویت ہلال ثابت نہ ہوجائے جنہیں جواب نمبر ایک میں تفصیلا ذکر کیا گیا ہے۔ فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

"ذکر فی کتاب الأقضیة إن کتب الخلیفة إلی قضاته إذا کان الکتاب فی الحکم بشهادة شاهدین شهدا عنده بمنزلة کتاب القاضی إلی القاضی لایقبل إلا بالشرائط التی ذکرناها" (الفتاویٰ الہندیۃ، ج:۳، ص:۳۹۶، دار الفکر، بیروت)

خلیفہ نے اپنے قاضیوں کو خط لکھا، تو اگر یہ خط کسی ایسے فیصلے سے متعلق ہے جو دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر اس نے کیا ہے، تو وہ خط کتاب القاضی الی القاضی کے درجے میں ہوگا اور وہ خط شرائط کتاب القاضی کے بغیر قبول نہیں کیا جائے گا۔

فتاویٰ عالم گیری کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ خلیفۃ المسلمین جو پورے ملک کا حاکم وقاضی ہوتا ہے اس کا خط اگر کسی ایسے فیصلے سے متعلق ہے جو دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر اس نے کیا ہے تو دوسرے شہروں میں اپنے قضاۃ کو اگر دربارہ حکم ہو تو اس کی حیثیت کتاب القاضی الی القاضی کی ہوگی اور شرائط کتاب القاضی کے بغیر اس کا خط مقبول نہیں ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ عہد قدیم سے سلاطین

اسلام میں یہ دستور رہا کہ ان کا حکم نامہ دوسرے شہروں کے قاضیوں کو شرائط کتاب القاضی کی رعایت کے ساتھ جاتا تھا۔

فتاوی بزازیہ میں ہے:

"بلدة فيها قاضيان حضر أحدهما مجلس الآخر و أخبر بحادثة لا يجوز له ان يعمل بخبره وحده ولو كتب إليه بشرطه له العمل به"۔ (الفتاویٰ البزازیۃ مع فتاویٰ الہندیۃ، ج:۵،ص:۱۸۳، المطبعۃ الکبری الأمیریۃ، بولاق،مصر)

ترجمہ: جس شہر میں دو قاضی ہوں ان میں سے ایک قاضی دوسرے کے اجلاس میں حاضر ہوکر کسی قضیے کی خبر دے تو اس دوسرے قاضی کو اس خبر پر عمل جائز نہیں اور اگر شرائط کے مطابق کتاب القاضی بھیجے تو دوسرا قاضی اس پر عمل کرے۔

تبیین الحقائق میں ہے:

"ذكر الكرخي في اختلاف الفقهاء أن كتاب القاضي إلى القاضي مقبول و إن كانا في مصر واحد"۔ (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ج:۴،ص:۱۸۶، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، بولاق،مصر)

ترجمہ: امام کرخی نے اختلاف الفقہا میں ذکر فرمایا ہے کہ کتاب القاضی الی القاضی مقبول ہے اگرچہ دونوں قاضی ایک ہی شہر میں ہوں۔

اسی عبارت پر حاشیۂ شلبیہ میں ہے:

"في الخصاف و روى عن محمد انه قال: في مصر فيه قاضيان في كل جانب قاض يكتب أحدهما إلى الآخر كتابا يقبل كتابه ولو أتى أحدهما إلى صاحبه فأخبره بالحادثة بنفسه لم يقبل قوله لأن في الوجه الأول كأن الأول خاطبه في موضع القضاء وفي الثاني خاطبه في غير موضع القضاء"۔ (حاشیۃ شلبی مع تبیین الحقائق، کتاب القضاء، ج:۴،ص:۱۸۶، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، بولاق،مصر)

ترجمہ: خصاف میں ہے امام محمد سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس شہر میں دو قاضی ایک ایک جانب میں ہیں تو ان میں سے ایک قاضی دوسرے کو کتاب القاضی بھیجے تو مقبول ہے، اگر ان میں سے ایک آکر دوسرے قاضی کو کسی حادثے کی خود خبر دے تو اس کا قول نا مقبول ہے کہ پہلی صورت میں گویا اس نے دوسرے قاضی کو اپنے موضع قضا سے مخاطب کیا ہے اور دوسری صورت میں اس نے اپنے محل قضا کے باہر سے خطاب کیا ہے۔

بزازیہ کی ایک دوسری عبارت یوں ہے:

"وعن الامام الثاني قضاة أمير المؤمنين إذا خرجوا مع أمير المؤمنين لهم أن يحكموا في اي بلدة نزل فيها الخليفة لأنهم ليسوا قضاة أرض إنما هم قضاة الخليفة و إن خرجوا بدون الخليفة ليس لهم القضاء"۔ (الفتاویٰ البزازیۃ مع فتاویٰ الہندیۃ، ج:۵،ص:۱۳۹، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، بولاق،مصر)

ترجمہ: امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ امیر المومنین کے قاضی اگر امیر المومنین کے ساتھ سفر کریں تو جس شہر میں امیر المومنین ٹھہرے وہاں یہ قضاۃ فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ کسی خاص جگہ کے قاضی نہیں بلکہ وہ خلیفہ کے قاضی ہیں اور اگر بغیر خلیفہ کے سفر پر ہوں تو امور قضا انجام نہیں دے سکتے۔

یعنی خلیفہ اگرچہ پورے ملک کا قاضی ہے لیکن وہ جہاں جہاں رہے بالفعل وہیں فصل مقدمات کر سکتا ہے، دوسری جگہ کے لیے مسئلۂ قضا میں وہ اجنبی ہے، اس لیے اس کا مخصوص قاضی خلیفہ کے جائے نزول پر ہی حق قضا رکھتا ہے۔

مذکورہ فقہی عبارات سے معلوم ہوا کہ خلیفۃ المسلمین یا قاضی القضاۃ اپنے پورے حدود قضا کے مختلف شہروں میں صرف کتاب القاضی الی القاضی کے ذریعے ہی اپنا فیصلہ نافذ کرسکتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ غیر منقسم ہندوستان کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے بلند شہر کے ایک صاحب نے آپ سے سوال کیا سوال وجواب ملاحظہ ہوں:

"حضرت مولانا....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معروض خدمت شریف ہے کہ جناب والا کا ایک مختصر سا پرچہ جس پر جناب کی مہر لگی ہوتی ہے اور ایک سطر میں یہ عبارت مرقوم ہے (میرے سامنے شہادتیں گزر گئیں کل جمعہ کو عید ہے) خاکسار کو موصول ہُوا اس کے متعلق فتویٰ شرعی دریافت طلب ہے کہ جس جگہ یہ پرچے پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو جمعہ کو عید کرنا تھی یا نہیں اور روزے توڑ دینا ضرور تھے یا نہیں اور اس کی عام تشہیر اور دیگر بلاد میں اشاعت سے کیا مفاد تھا؟ بینوا توجروا

الجواب: وہ پرچے دیگر بلاد میں نہ بھیجے گئے، تقسیم کرنے والوں نے اسٹیشن پر بھی دیئے، ان میں سے کوئی لے گیا ہوگا۔ بعض لوگوں نے پیلی بھیت کے واسطے چاہا اور ان کو جواب دے دیا گیا کہ جب تک دو شاہد عادل لے کر نہ جائیں پرچہ کافی نہ ہوگا اور بلاد بعیدہ کو کیونکر بھیجے جاتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۳۷۵،۳۷۶، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مذکورہ فتوے پر غور کیجیے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے پیلی بھیت کے مقابلے میں بلند شہر کو بلاد بعیدہ سے شمار فرمایا جس سے ظاہر ہے کہ پیلی بھیت بلاد قریبہ سے ہے جس کے لیے اعلیٰ حضرت قدس سرہ یعنی غیر منقسم ہندوستان کے قاضی القضاۃ فرماتے ہیں:

"بعض لوگوں نے پیلی بھیت کے واسطے چاہا اور ان کو جواب دے دیا گیا کہ جب تک دو شاہد عادل لے کر نہ جائیں"۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت قدس سرہ کی اس صریح عبارت سے ظاہر ہے کہ قاضی کا فیصلہ صرف اسی شہر میں معتبر ہے جہاں اس نے فیصلہ صادر کیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اعلیٰ حضرت نے جو اعلان فرمایا تھا وہ پیلی بھیت تو کیا بلند شہر میں بھی اس سے چاند کا ثبوت ہو جاتا کیوں کہ یہ دونوں شہر بھی اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے حدود قضا میں شامل تھے لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے پیلی بھیت میں ثبوت ہلال کے لیے کتاب القاضی کے طریق ہی کو لازم قرار دیا۔

۵۰ سے زائد مشہور و مستند علمائے کرام کی تصدیقات سے مزین فتویٰ

جہاں رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت ہوا، صرف وہاں والوں پر روزہ افطار اضحیہ واجب ہے، ہدایہ وغیرہ میں ہے: "الأصل بقاء الشهر فلا ينتقل عنه الا بدليل ولم يوجد" فلہٰذا جہاں رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت نہ ہوا وہاں والوں کو یہ حکم دینا کہ روزہ رکھو، یا افطار کرو، یا قربانی کرو، نماز عید ادا کرو خلاف شرع ہے اور قاضی کا حکم خلاف شرع قابل عمل نہیں ہوتا ہے، الہٰذا اگر کوئی قاضی اپنے شہر اور دیگر بلاد جہاں رؤیت ہلال کا ثبوت نہیں ہوا ہے، ان تمام مقامات کے لیے روزہ و افطار وغیرہ کا حکم دے تو اس کے حکم و اعلان پر جہاں رؤیت ہلال کا ثبوت نہیں ہوا ہے، عمل نہ ہوگا، خواہ وہ قاضی ریڈیو سے حکم دے یا خود دوسرے بلاد میں جا کر خود حکم کرے، دوسری جگہ جب حکم دے گا تو اس سے ثبوت شرعی کا مطالبہ ہوگا، بے ثبوت نہ اسے حکم کرنا جائز نہ اس حکم پر عمل کرنا جائز، فتح القدیر، ہدایہ میں امام علامہ محقق علی الاطلاق فرماتے ہیں:

" الفرق بين رسول القاضى و بين كتابه حيث يقبل كتابه ولايقبل رسوله فلأن غاية رسوله أن يكون كنفسه و قدمنا أنه لو ذكر ما فى كتابه لذلك القاضى بنفسه لا يقبله و كان القياس فى كتابه كذلك إلا أنه أجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فأقتصر عليه"۔ واللہ اعلم

کتبہ الفقیر ابوالفضل السید محمد افضل حسین، مفتی دار العلوم مظہر اسلام، بریلی
صح الجواب، فقیر محمد مصطفیٰ رضا البریلوی، زیب سجادہ، قادریہ، رضویہ، بریلی
نعم الجواب واللہ ورسولہ اعلم والصواب فقیر ابوالمحامد سید محمد غفرلہ اشرفی جیلانی کچھوچھہ
الجواب صحیح، محمد سعید عفی عنہ، صدر المدرسین سابق مدرسہ حنفیہ غوث العلوم کان پور
وافق الجواب الکتاب فقیر رفاقت حسین، احسن المدارس کان پور
الجواب صحیح، محمد سلیمان غفرلہ بھاگلپوری
الجواب صحیح، محمد احمد شاہدی، غازی پوری، مدرس مدرسہ فاروقیہ، بنارس
الجواب صحیح، محمد سعید احمد سنبھلی، عفی عنہ، محلہ دیپا سرائے
صح الجواب، فقیر محمد محبوب اشرفی، غفرلہ، مدرس مدرسہ احسن المدارس، جدید کانپور
الجواب صحیح، قاضی احسان الحق نعیمی، بہرائچ
صح الجواب واللہ اعلم بالصواب، عبد المصطفیٰ اعظمی، خادم الطلبہ، مدرسہ اشرفیہ، مبارکپور

جواب صحیح ہے، محمد ذکراللہ فاروقی بستوی
الجواب ھوالحق، سید محمد جسیم بن مولوی سید مسعود صاحب قادری غفرلہ
صحیح الجواب، احقر محمد رجب علی قادری غفرلہ
الجواب صحیح محمد حسن خاں اشرفی، بسلسلہ کچھوچھہ شریف، ناگ پور
الجواب صحیح محمد عبدالرب عفی عنہ، الہ آباد، مدرسہ حبیبیہ
الجواب صحیح، قاری غلام محی الدین خاں، پیلی بھیت
الجواب صحیح والمجیب النجیح والمخالف فتیح محمد یونس نظامی غفرلہ، الہ آباد
نعم المجیب مظہر ربانی، عفی عنہ، قادری، جبلپوری
الجواب صحیح محمد اجمل، غفرلہ، مفتی اعظم، سنبھل
الجواب صحیح محمد عثمان الاعظمی، مدرس مدرسہ زینت الاسلام، مدنپورہ، ممبئی
نعم الجواب، سید محمد غضنفر حسین، قادری، دہلوی، ثم لکھنوی
الجواب صحیح محمد آل حسن نعیمی، سنبھلی، شیخ الحدیث، جامعہ عربیہ، ناگ پور
الجواب صحیح، فقیر محمد عنایت رسول محمد عمر قادری، خلف حضرت مولانا ہدایت رسول صاحب
الجواب صحیح، مشتاق احمد نظامی، مدرسہ حبیبیہ الہ آباد
الجواب صحیح محمد عبدالمتین، قادری، غفرلہ، فتح پور ہسوہ
الجواب صحیح، فقیر ربانی، سید محمد عبدالمسجو دوجود قادری، جبلپوری
صح الجواب واللہ ورسولہ اعلم بالصواب، فقیر ابوطاہر محمد طیب صدیقی، قادری، غفرلہ
الجواب صحیح واللہ ورسولہ اعلم، فقیر محمد سلیم، غفرلہ، خطیب مسجد، دھوبی تالاب، ممبئی
الجواب صحیح، احقر محمد الیاس، دھوبی تالاب، ممبئی
الجواب صحیح، فقیر مداح مصطفیٰ، حمیدالرحمن رضوی غفرلہ، خطیب جامع مسجد، بریلی
الجواب ھوالصواب، محمد حامد حسن قادری اشرفی، سنبھلی
الجواب صحیح، ناچیز سید محمد مقصود غازی ربانی، جبلپوری
الجواب صحیح محمد اسماعیل قادری، سنبھلی، ماڑ داڑ
الجواب صحیح والمجیب النجیح محمد عبدالرشید، مفتی جامعہ عربیہ، ناگپور
لاریب فی صحت جواب واللہ اعلم بالصواب، محمد عبدالخالق، پیش امام، جونی مسجد، ممبئی
الجواب صحیح، فقیر وارثی غلام مصطفیٰ قادری، عفی عنہ، جائسی، کانپور، ٹپکا پور
الجواب صحیح محمد سلیم اللہ، عفی عنہ، بنارسی
الجواب صحیح، فقیر محمد شفیع احمد، قادری، مبارکپور، اعظم گڑھ
صح الجواب، مطابق بالسنۃ والکتاب، غلام رشید ارشد القادری، ایم ایس بی
الجواب صحیح، سید محمد اختر حسین، بریلوی، غفرلہ
الجواب صحیح، الفقیر غلام آسی قادری، مدرس مدرسہ غوثیہ تاج العلوم، ناگپور
الجواب صحیح، خادم القوم، سید محمد عزیز الحسین، لکھنؤ محمود نگر
الجواب صحیح، سید احسن ربانی قادری، جبلپوری، عفی عنہ
الجواب ھوالصواب، فقیر محب الرضا محبوب علی خاں قادری، خطیب جامع مسجد مدنپورہ
اللہ رب محمد صلی علیہ وسلما صح الجواب، ابراہیم رضا قادری غفرلہ
الجواب صحیح، سید محمد نذیر حسن قادری لکھنوی
الجواب صحیح، نور محمد قادری عفی عنہ، چتوڑ گڑھ
الجواب صواب، عبدالعزیز قادری ٹانڈا فیض آباد
الجواب صحیح محمد رضوان الرحمن غفرلہ، مفتی ریاست اجین
انہ لقول فصل وما ھو بالھزل، ابوبکر بن حاجی احمد قادری غفرلہ
قد صح الجواب، قیصر علی احمد عفی عنہ، مدرس مدرسہ مصباح العلوم، مبارک پور اعظم گڑھ"
(عید کا چاند ص: ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

دیکھیے اس فتوے کی تائید وتصدیق فرمانے والے ایسے ایسے ذی علم علما وفقہائے کرام جن کے فضل وکمال کا زمانہ معترف ہے جن کی علمی وفقہی ضیا پاشیوں سے ایک عالم مستفیض ومستنیر ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پورے ملک کے قاضی یا چند اضلاع کے قاضی کے اعلان کا اعتبار صرف اسی شہر اور حوالی شہر تک محدود رہے گا کہ جہاں اس نے فیصلہ صادر کیا ہے اس کے علاوہ دوسرے شہروں میں طرق موجبہ کے بغیر ہرگز معتبر نہیں ہوگا بلکہ دوسرے شہروں میں بھی چاند کا ثبوت طرق موجبہ میں سے ہی کسی طریق سے ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۵) الجواب: استفاضہ کے متعلق آپ نے جو تحریریں بھیجی ہیں ان پر کلام سے پہلے استفاضہ کو علمائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں تفصیلاً بیان کیا جاتا ہے۔

شرعی استفاضہ

استفاضہ بمعنی مطلق شیوع موبائل سے حاصل ہوجاتا ہے لیکن یہ ثبوتِ رویتِ ہلال کے لیے کافی نہیں ہے ثبوت رویت ہلال کے لیے استفاضۂ شرعی درکار ہے اور استفاضۂ شرعی کے متعلق حجۃ المتاخرین علامہ ابن عابدین شامی امام رحمتی کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

"قال الرحمتی معنی الإستفاضة أن تأتی من تلك البلدة جماعات متعددون کل منهم یخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن رؤیة لامجرد الشیوع من غیر علم بمن اشاعه کما قد تشیع اخبار یتحدث بها سائر اهل البلدة ولایعلم من اشاعها کما ورد. ان فی اٰخر الزمان یجلس الشیطان بین الجماعة فیتکلم بالکلمة فیتحدثون بها ویقولون لاندری من قالها

فمثل هذا لا ينبغي ان يسمع فضلا من عن أن يثبت به حكم "(ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصوم، ج:۳،ص:۳۹۰،دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: امام رحمتی نے فرمایا: شہرت کا معنیٰ یہ ہے کہ اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وُہ تمام یہ اطلاع دیں کہ اس شہر میں لوگوں نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا ہے محض ایسی افواہ سے نہیں جسے پھیلانے والا معلوم نہ ہو، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ بہت سی خبریں شہر میں پھیل جاتی ہیں اور انہیں پھیلانے والا معلوم نہیں ہوتا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آخری زمانے میں شیطان لوگوں کے درمیان آکر بیٹھے گا اور بات کرے گا لوگ اسے بیان کریں گے اور کہیں گے ہم نہیں جانتے یہ بات کس نے کہی، تو ایسی باتیں تو سُننا ہی مناسب نہیں چہ جائے کہ ان سے حکم ثابت کیا جائے۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"بلکہ وہ استفاضہ جو شرعاً معتبر ہے اُس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس شہر سے گروہ کے گروہ متعدد جماعتیں آئیں اور سب بالاتفاق یک زبان بیان کریں کہ وہاں فلاں شب چاند دیکھ کر لوگوں نے روزہ رکھا یہاں تک کہ اُن کی خبر پر یقین شرعی حاصل ہو"۔(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰،ص:۴۳۵،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پھر صرف استفاضہ واشتہار ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خبر کا تحقق بھی لازم وضروری ہے ردالمحتار میں ہے:

"في الذخيرة قال شمس الائمة الحلواني الصحيح من مذهب أصحابنا أن الخبر إذا استفاض وتحقق فيما بين أهل البلدة الأخرى يلزمهم حكم هذه البلدة"
(ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصوم، ج:۳،ص:۳۹۰،دارالفکر، بیروت)

علامہ رحمتی کی عبارت کے تحت اعلیٰ حضرت قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"قلت و هو كلام حسن و يشير إليه قول الذخيرة، إذا استفاض و تحقق فإن التحقق لا يوجد بمجرد الشيوع "(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰،ص:۴۱۶،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ یہ کلام بہت اچھا ہے اور اسی کی طرف قولِ ذخیرہ کا اشارہ ہے کہ جب خبر مشہور اور ثابت ہو، کیوں کہ ثبوت محض افواہ کی بنا پر نہیں ہوتا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ السامی تحریر فرماتے ہیں:

"ہاں اگر رؤیت شہر دیگر کی خبر اُس حدِ شہرت واستفاضہ کو پہنچے جو باعثِ ثبوت رؤیت یقینی ومحقق ہوجائے تو صحیح یہ ہے کہ اعتبار کریں گے"۔(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰،ص:۴۳۳،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی میں ہے:

"ولہٰذا امام شمس الائمہ وذخیرہ ومغنی و امداد کا ارشاد سُن چکے کہ ہمارے ائمہ نے صرف استفاضہ واشتہار کافی نہ جانا بلکہ اُس کے ساتھ تحقیق ہوجانے کی قید زیادہ فرمائی۔"(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۴۳۴،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری اور دیگر فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کی تصریحات پر غور کیجیے تو سمجھ میں آجائے گا کہ استفاضہ شرعی کے تحقق کے لیے مندرجہ ذیل امور کا پایا جانا لازم وضروری ہے:

(۱) جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں۔

موبائل اور ٹیلیفون کی خبر استفاضہ کیسے ہوجائے گی؟ جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا ہے متعدد جماعتیں تو بہت دور کی بات ایک جماعت بھی نہیں بلکہ جماعت بھی بہت دور فرد واحد بھی نہیں آیا۔

(۲) متعدد جماعتیں آکر سب یک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بر بنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی۔

موبائل اور ٹیلیفون کی خبر میں جو خبر دینے والا ہے وہ فرد واحد ہے جماعت نہیں۔

(۳) موبائل اور ٹیلیفون پر خبر دینے والا جہاں سے بول رہا وہاں قاضیِ شرع تو ہے نہیں کوئی مفتیِ اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو

کہ احکامِ روزہ وعیدین اُسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہوں عوام کالانعام بطور خود عید و رمضان نہیں ٹھہرا لیتے ہوں، ہے بھی یا نہیں یہ بھی محل نظر ہے۔ یا اگر حاکم شرع نہیں بھی ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہاں سے جماعات کثیرہ آکر یہ بیان بالاتفاق دیں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ چاند دیکھنا بیان کرتے تھے، جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ السامی تحریر فرماتے ہیں:

"اور ایک صُورت یہ بھی متصوّر کہ دوسرے شہر سے جماعاتِ کثیرہ آئیں اور سب بالاتفاق بیان کریں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ اپنی آنکھ سے چاند دیکھنا بیان کرتے تھے جن کا بیان مورث یقین شرعی تھا ظاہر اس تقدیر پر وہاں کسی ایسے حاکم شرع کا ہونا ضرور نہیں کہ رؤیت فی نفسہا حجتِ شرعیہ ہے۔ لقولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صوموا لرؤیتہٖ وافطروا لرؤیتہٖ۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ چاند دیکھنے پر روزہ رکھو اور چاند دیکھنے پر عید کرو۔

جب جماعت تواتر، جماعت تواتر سے اُن کی رؤیت کی ناقل ہے تو رؤیت بالیقین ثابت ہوگئی اور شہادت کی حاجت نہ رہی کہ اثباتِ احکام میں تواتر بھی قائم مقام شہادت بلکہ اُس سے اقویٰ ہے کہ شہادت برخلاف تواتر آئے تو رَد کر دی جائے اور نفی پر تواتر مقبول ہے اور شہادت نامسموع"۔ (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۴۱۷، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

(۵) اگر فرضی طور پر یہ مان بھی لیا جائے کہ موبائل یا ٹیلیفون کے ذریعے جس شہر سے چاند کی خبر آئی ہے وہاں واقعی کوئی مفتی، معتمد، مستند، متبع اور مستقیم علی الحق ہے تو بھی یہ خبر استفاضہ نہیں بن سکتی، کیوں کہ یہ تو دور دراز کسی کی آواز سنی گئی ہے اس میں جس شخص نے یہ بتایا کہ میں فلاں بول رہا ہوں، یا اس کا نمبر موبائل میں پہلے سے محفوظ تھا بغیر بتائے سمجھ لیا کہ یہ فلاں بن فلاں بول رہا ہے لیکن اس کا بتا دینا یا نمبر محفوظ ہونے کی وجہ سے سمجھ لینا یہ شرعاً حجت نہیں ہے اول اس لیے کہ اس کا یہ کہنا کہ "میں فلاں بول رہا ہوں" یہ تو کوئی دوسرا بھی کہہ سکتا ہے اور یہ کہنا کہ آواز پہچانی ہوئی ہے یہ بھی شرعاً حجت نہیں ہے کیوں کہ علما تصریح فرماتے ہیں کہ آڑ سے جو آواز مسموع ہو اُس پر احکامِ شرعیہ کی بنا نہیں ہو سکتی کہ آواز آواز سے مشابہ ہوتی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"و لو سمع من وراء الحجاب لایسعه أن یشهد لاحتمال ان یکون غیره إذ النغمة تشبه النغمة"۔ (الفتاویٰ الہندیہ، ج:۳، ص:۴۵۲، دار الفکر، بیروت)

چاند کی خبر دینے کے لیے جسے فون کیا ہے اس کا موبائل نمبر محفوظ ہونا بھی اس خبر کو معتبر نہیں بنا سکتا کیوں کہ ایک دوسرے کا موبائل استعمال کر لینا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ لہٰذا اس صورت میں بھی استفاضۂ شرعی کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

جدید استفاضہ کے ایجاد و اختراع کا تفصیلی جائزہ

جدید استفاضہ سے وہ استفاضہ مراد ہے جو دیوبندیوں اور وہابیوں نے تقریباً ۷۵ رسال پہلے ۱۳۵۰ھ میں ایجاد و اختراع کیا تھا جس کا حاصل یہ ہے:

"موجود آلات مواصلات تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے مختلف جگہوں سے مختلف لوگوں کے یہ بیانات موصول ہوں کہ ہم نے خود چاند دیکھا ہے یا ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی نے شہادت سن کر چاند ہونے کا فیصلہ کیا ہے جب یہ بیان دینے والے کثیر ہو جائیں اگرچہ بیان جدید آلات مواصلات سے ہو تو خبر مستفیض ہو جاتی ہے۔"

یہ ایسا استفاضہ ہے کہ جس کا کتب فقہ و فتاویٰ میں کہیں بھی نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ یہ فقہائے اسلام کی تصریحات کے خلاف اور آلات مواصلات وغیرہ اسباب کو امورِ شرع میں دخیل بنانا ہے لیکن دیوبندیوں کی طرف سے ایسی حرکت کوئی نئی بات نہیں کیوں کہ دیوبندیت کی تو بنیاد ہی ضروریات دین کی مخالفت پر رکھی ہوئی ہے۔

گذرے ہوئے زمانے میں خط کا عام رواج تھا لیکن ہمارے علمائے کرام نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ امور شرعیہ میں ان خطوط و مراسلات کا کچھ اعتبار نہیں کہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے اور خط خط کی طرح بن بھی سکتا ہے لہٰذا خط سے یقین شرعی نہیں حاصل ہو سکتا کہ یہ اُسی شخص کا لکھا ہوا ہے، چنانچہ علامہ ابوالحسن برہان الدین فرغانی مرغینانی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۵۹۳ھ] تحریر فرماتے ہیں:

"الخط یشبه الخط فلم یحصل العلم"۔(الہدایۃ فی شرح البدایۃ، کتاب الشہادۃ، فصل فیما یتحملہ الشاہد، ج:۳، ص:۱۱۹، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: خط دوسرے خط کے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا اس سے علم حاصل نہ ہوگا۔

علامہ ابن نجیم مصری [م ۹۷۰ھ] تحریر فرماتے ہیں:

"لایعتمد علی الخط ولا یعمل به"۔(الاشباہ والنظائر، کتاب القضاء والشہادات والدعاوی، ص:۱۸۳، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: خط پر اعتماد وعمل نہیں کیا جائے گا۔

علمائے حق اہل سنت و جماعت شریعت مطہرہ کے اسی حکم پر عامل رہے، اسی پر عمل کرنے کا حکم عوام مسلمین کو بھی دیتے رہے لیکن اس کے برخلاف دیوبندی مولوی رشید احمد گنگوہی [م ۱۳۲۳ھ] نے شریعت مطہرہ سے انحراف کرتے ہوئے ایک جدید تحقیق پیش کی اور لوگوں کے لیے شریعت کے مقابلے میں طبیعت سے گڑھ کر یہ آسانی لے کر آگئے کہ خط کے ذریعے بھی چاند کا ثبوت ہو جائے گا چنانچہ رشید احمد گنگوہی نے لکھا:

"چاند کی خبر تحریر خط سے دریافت ہوسکتی ہے مکتوب الیہ کو غالب گمان یہ ہے کہ فلاں کاتب عدل کا خط ہے اس میں کوئی انحراف نہیں ہوا تو اس پر عمل درست ہے کتاب القاضی جیسی تو کید وتوثیق ضروری نہیں۔" (فتاوی رشیدیہ کامل، کتاب الصوم، ص:۴۵۳، دار الاشاعت، کراچی)

ٹیلی گراف یا تار برقی کی ایجاد ۱۸۳۰ء میں ہوئی، اس کے متعلق بھی علمائے حق نے یہ حکم صادر فرمایا کہ تار کی خبر سے چاند کا ثبوت نہیں ہوسکتا، اس کا استعمال مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری کے زمانے میں خوب عام تھا لہٰذا برقی تار سے ثبوت رویت ہلال کے متعلق بھی آپ سے کثرت سے سوالات قائم کر کے مختلف دیار و امصار سے لوگوں نے حکم شرعی معلوم کیا آپ نے ان کے جوابات میں فرمایا کہ تار کی خبر سے رویت ہلال کا ثبوت نہیں ہوسکتا بلکہ آپ نے برقی تار کے متعلق ایک مستقل تحقیقی رسالہ "أز کی الاہلال بابطال ما أحدث الناس فی أمر الھلال" [۱۳۰۵ھ] تحریر فرمایا (جسے تحقیق وتفصیل مطلوب ہو وہ اس کا مطالعہ کرے) اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

"جو یہاں تار کی خبر پر عمل چاہے اس پر لازم کہ شرعاً اس کا موجب وملزم ہونا ثابت کرے مگر حاشا نہ ثابت ہوگا جب تک ہلال مشرق اور بدر مغرب سے نہ چمکے، پھر شرع مطہر پر بے اصل زیادت اور منصب رفیع فتویٰ پر جرأت کس لیے؟ والعیاذ باللہ سبحانہ وتعالیٰ اور یہ خیال کہ تار میں خبر تو شہادت کافیہ کی آئی، محض نادانی کہ ہم تک تو نامعتبر طریقے سے پہنچی نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ معتبر کس کی خبر، پھر جو حدیث نامعتبر راویوں کے ذریعہ سے آتی ہے کیوں پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے!" (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۳۶۰، ۳۶۱، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ٹیلی گراف/تار برقی کے متعلق بھی کچھ دیوبندی مولویوں نے یہی حکم دیا کہ اس سے چاند کا ثبوت نہیں ہوگا لیکن مولوی اشرف علی تھانوی نے تحقیق جدید پیش کی اور لوگوں کے لیے طبیعت وخواہش سے مزین آسانی لے کر آئے اور اس بات کے قائل ہوئے کہ ٹیلی گراف/تار برقی سے چاند کا ثبوت ہو جائے گا البتہ کچھ وقت گذرنے کے بعد جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو اشرف علی تھانوی نے اپنے اس موقف سے رجوع کر لیا، مولوی اشرف علی تھانوی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا:

"اس کے قبل بندہ نے تار کو خط یا طبل و مدفع یعنی توپ پر قیاس کر کے اس باب میں ایک تقریر لکھی تھی جس میں قبول خبر تار میں کچھ تفصیل اور بعض شرائط کے ساتھ تقیید تھی مگر اس سال یعنی ۱۳۲۷ھ کی رؤیت شوال کے متعلق تاروں پر عمل کرنے میں بے علموں اور کم علموں نے بے احتیاطیاں کیں اور ان سے جو فتن وشرور پیدا ہوئے ان کو دیکھ کر تجربہ ہوا کہ عوام ان قیود وشرائط کو ملحوظ نہیں کر سکتے، ونیز اخبار متواترہ سے تحقیق ہوا کہ تار میں مختلف اقسام کی غلطی اور دھوکہ بھی زیادہ محتمل ہے؛ لہٰذا وہ خط سے بھی ادون ہے کہ خط میں اس کے طرز سے کچھ تو

معرفت کاتب کی ہوتی ہے، پھر بھی "الخط یشبہ الخط" بعض احکام میں کہا گیا ہے اور تار میں تو اس کی بھی کوئی علامت نہیں۔ اور نیز طبل سحر و مدفع افطار سے بھی اضعف ہے کیونکہ ان کی ضرب ایک جماعت حاضرین کی مشارکت سے ہوتی ہے جس میں جرأت تعمد خدع کی ابعد ہے۔ تار میں یہ بھی نہیں ان امور پر نظر کر کے "سداً للذرائع وحسماً للمادۃ" اس تفصیل سے رجوع کر کے اب یہ حکم متعین سمجھتا ہوں کہ اس باب میں تار کی خبر اصلاً قابل اعتبار و لائق عمل نہیں" (امداد الفتاویٰ، ج: ۴، ص ۱۴۶، ۱۴۷، زکریا بک ڈپو دیوبند)

مولوی رشید احمد گنگوہی نے تار کو خط پر قیاس کرتے ہوئے چاند کے ثبوت کے لیے کافی بتایا اور تار سے ثبوت ہلال کے متعلق اپنے ایک فتوے میں یوں لکھا:

"تحریر خط جو مثل دستور کے لکھا آیا از طرف فلاں بنام فلاں مثلاً اور مکتوب الیہ اس کو پہچانتا ہے اور اس کا ہی خط ہے تو اس کا لکھنا خبر رویت ہلال کے بارے میں معتبر ہوگا۔ اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔ اور تار کی خبر بھی مثل تحریر کے ہے مگر وساطت کفار کی موجب عدم قبول ہو جاتی ہے ورنہ تحریر خط اور خبر تار کا ایک حکم ہے" (فتاویٰ رشیدیہ کامل، کتاب الصوم، ص: ۴۴، دار الاشاعت، کراچی)

تار کے متعلق دیوبندی مولوی رشید احمد گنگوہی کا تعاقب کرتے ہوئے مجدد اعظم امام اہل سنت اعلیٰ حضرت شاہ امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ کے قلم کا تیور ملاحظہ کریں آپ یوں تحریر فرماتے ہیں:

"گنگوہی مُلّا نے اپنے ایک فتوے میں تار کی خبر اسباب میں معتبر ٹھہرائی اور اُسے تحریر خط پر قیاس کیا تھا کہ تار کی خبر مثل تحریر خط کے ہے کیونکہ تحریر میں حروف اصطلاحی ہیں جس سے مطلب معلوم ہو جاتا ہے خواہ بحرکتِ قلم پیدا ہوں خواہ کسی لاٹھی یا بانس طویل کی حرکت سے (الیٰ قولہ) بہر حال خبر تار کی مثل خط ہے اور معتبر ہے، یعنی خط میں قلم سے لکھتے ہیں تار دینا ایسا ہے کہ کسی بڑے بانس سے جو ہزاروں کوس تک لمبا ہے لکھ دیا تو جیسے وہ معتبر ہے ویسے ہی یہ، بلکہ یہ تو زیادہ معتبر ہونا چاہئے کہ وہاں چھوٹا سا قلم ہے اور یہاں اتنا بڑا بانس، تو اعتبار بھی اسی نسبت پر بڑھنا چاہئے، شملہ بہ مقدار قلم، قیاس تو اچھا دوڑا تھا مگر افسوس کہ شرعاً محض مردود ونا کام رہا۔ اوّلاً: خط و تار میں جو فرق ہیں ہم نے اپنے فتویٰ مفصلہ میں ذکر کئے جو اس قیاس کو از بیخ بر کندہ کرتے اور ان سے قطع نظر بھی کیجئے تو بحکم شرع خط ہی پر عمل حرام، پھر اس بانس کے قیاس کا کیا کام، حکم مقیس علیہ میں باطل ہے تو مقیس آپ ہی عاری و عاطل ہے" (فتاویٰ رضویہ، قدیم، ج: ۴، ص: ، رضا اکیڈمی، ممبئی)

ٹیلی فون کی ایجاد ۱۸۷۶ء کو ہو چکی تھی، وقت گذرنے کے ساتھ ہی اس کا استعمال اور چلن بھی عام ہوتا رہا ۱۹۰۰ء تک صرف امریکہ میں لاکھوں کی تعداد میں ٹیلیفون تھے، ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ٹیلیفون نے خوب ترقی کی قیمتیں کم ہوگئیں اور فون گھروں میں عام ہونے لگا، پہلے روٹری ڈائل اور پھر پش بٹن فون وجود میں آگئے۔

دیوبندیوں نے پہلے یہ حکم دیا کہ ثبوت ہلال کے لیے ٹیلیفون کی خبر کا اعتبار نہیں اس کے چند حوالے ان کی کتب فتاویٰ سے نقل کیے جاتے ہیں، اشرف علی تھانوی کی زیر نگرانی و رہنمائی میں شائع ہونے والی کتاب "امداد الاحکام" مولفہ ظفر احمد عثمانی میں یوں لکھا ہے:

"تار اور ٹیلیفون کی خبر معتبر نہیں"۔ (امداد الاحکام، کتاب الصوم، ج: ۳، ص: ۲۱، زکریا بک ڈپو دیوبند)

کفایۃ اللہ دہلوی نے لکھا ہے:

"ٹیلی فون کی خبر پر رویت کے ثبوت کا حکم دینا ناجائز ہے، کیوں کہ ٹیلی فون پر بات کرنا شہادت شرعیہ کی حدود میں داخل نہیں، اگر چہ آواز پہچانی جائے تاہم اشتباہ سے خالی نہیں اور مشتبہ چیز پر رؤیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا، ٹیلی فون پر تجارت، بلکہ حکومت کا کاروبار چلتا ہو، پھر بھی ٹیلی فون پر کوئی جج گواہی نہیں لے سکتا اور قانون شہادت کی رو سے ٹیلی فون پر شہادت مقبول نہیں ہو سکتی، پس قانون شریعت میں بھی حکم کے لیے ٹیلی فون پر شہادت مقبول نہیں۔ جب ٹیلی فون کا ذریعہ اور واسطہ معتبر نہیں تو حلف لینا نہ لینا برابر ہے اور وہ حلف بھی معتبر نہیں، یعنی یہ ثابت نہ ہوگا کہ حلف کون کر رہا ہے، یا حلفی شہادت کون دے رہا ہے اس لیے اس خبر پر عید کرنے کا حکم کرنا درست نہ ہوگا۔ (کفایۃ المفتی،

ج:۴،ص:۲۱۵،۲۱۶،دارالاشاعت کراچی)

دیوبندیوں کے فقیہ العصر اور مفتی اعظم رشید احمد لدھیانوی نے یوں لکھاہے:

”شہادت کی شرائط سے معلوم ہوا کہ ٹیلیگراف،ٹیلیفون، ریڈیو، وائرلیس وغیرہ آلات جدیدہ کے ذریعے شہادت ادانہیں ہوسکتی، اس لیے کہ شہادت میں روبرو حاکم کے پاس مجلس حکم میں حاضر ہوناضروری ہے“۔(احسن الفتاویٰ، کتاب الصوم، ج:۲،ص:۴۱۷،ایچ،ایم،سعید کمپنی،کراچی)

ٹیلیفون سے چاند کے ثبوت کے معاملے میں دیوبندی مولوی اسی طرح پہلے سخت حکم دیتے رہے پھر دھیرے دھیرے ان میں اپنے اکابرین کی طرح لچک اور نرمی آنے لگی چنانچہ دیوبندی مولوی کفایت اللہ دہلوی سے ٹیلی فون کی رویت کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں لکھا:

”ٹیلی فون کی خبر شرعی شہادت کے قائم مقام نہیں ہوسکتی، البتہ جس شخص کو یقین ہو کہ ٹیلی فون پر بولنے والا فلاں شخص ہے اور وہ رؤیت کی خبر دے کہ میں نے چاند دیکھا اور یا اتنے ٹیلی فون آجائیں کہ ان سے چاند ہونے کا غلبۂ ظن حاصل ہو جائے تو جس کو یہ یقین حاصل ہو جائے وہ خود عمل کرسکتا ہے، لیکن اس ذریعے کو شہادت قرار دے کر عام حکم نہیں دیا جاسکتا“(کفایۃ المفتی، کتاب الصوم، ج:۸، ص:۲۱۹،دارالاشاعۃ،کراچی)

دوسرے سوال کے جواب میں یوں لکھا:

”ہاں جب کہ کثرت تار، یا ٹیلی فون کی وجہ سے کسی کو خبر کا یقین ہو جائے تو وہ شخصی طور پر عمل کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے، لیکن حکم کے لئے کافی نہیں کیونکہ اس پر رؤیت ہلال، یا افطار، یا عید کا عام حکم نہیں دیا جاسکتا“(کفایۃ المفتی، کتاب الصوم، ج:۸،ص:۳۱۰،دارالاشاعۃ،کراچی)

پھر مزید نرمی پیدا کرنے کے لیے شریعت کے مقابلے میں طبیعت کو داخل کر کے”استفاضہ“ کو اس میں شامل کر دیا اس کا واقعہ یہ ہوا کہ مولوی کفایت اللہ دہلوی نے”الجمعیۃ“ اخبار میں ایک اعلان شائع کرایا:

”رویت ہلال کا شرعی ثبوت مل چکا ہے اب جلسے جلوس کی ضرورت نہیں اور بقرہ عید کی نماز سنیچر کو ہوگی“۔

اس اعلان پر ایک شخص نے دربارۂ استفاضہ علامہ رحمتی کی عبارت نقل کر کے ایک سوال کیا جس کا ماحصل درج ذیل ہے:

آپ کا یہ اعلان جو صرف”الجمعیۃ“ کے ذریعے سے ہم لوگوں تک پہنچا ہے کیا اس سے استفاضہ ہو گیا یا نہیں اور کیا”الجمعیۃ“ کا اعلان حد تواتر کو پہنچ گیا یعنی یہ اعلان کٹک والے یا دہلی کے علاوہ دوسرے شہر والوں کے لیے ہیں؟”الجمعیۃ“ کے اعلان پر روزہ رکھ سکتے ہیں یا عید منا سکتے ہیں کیا ہمارے لیے یہ اعلان طریق موجب ہے؟

اس کے جواب میں مولوی کفایت اللہ دہلوی نے یوں لکھا:

”استفاضہ کی جو تعریف آپ نے نقل کی وہ صحیح ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت استفاضہ کی نہیں، اگر متعدد اخبار یعنی کم از کم دس اخبار اپنے اندر رؤیت ہلال کی خبر معتبر آدمیوں کے ذریعے سے دیں تو وہ خبر مستفیض ہوئی“۔(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد دوم یعنی امداد المفتیین کامل، کتاب الصوم، ص:۴۰۹، دارالاشاعت، کراچی)

اس جواب پر سائل نے پھر سوال کیا تو اس سوال کا جواب مولوی شفیع نے یوں دیا:

”جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا، یہ صحیح ہے کہ علامہ شامی نے استفاضہ کی ایک خاص صورت بیان فرمائی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلق استفاضہ اس میں منحصر ہو بلکہ یہ صورت بھی استفاضہ میں داخل ہے کہ مختلف شہروں سے مختلف لوگوں کے ذریعہ رویت ہلال ، یا حکم بالرؤیہ کی خبر بعد تواتر موصول ہو جائیں، اس میں مختلف شہروں کے اخبار، یا ٹیلی فون، یا مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کی خبریں شامل ہیں، جب وہ حد تواتر کو پہنچ جائیں تو استفاضہ کی تعریف میں داخل ہیں“(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد دوم یعنی امداد المفتیین کامل، کتاب الصوم، ص:۴۱۰، دارالاشاعت، کراچی)

مذکورہ فتویٰ ۱۳۰۷ھ کا ہے یہیں سب سے پہلے استفاضہ کی توضیح وتشریح اور تعبیر اپنی طبیعت سے من چاہے طریقے سے اپنی بات کو درست کرنے کے لیے گڑھی گئی اس سے پہلے کسی عالم دین نے ایسی

توضیح کی ہو یہ تو دور کی بات ہے کسی دیوبندی نے بھی اس طرز پر صراحت کے ساتھ ایسی توضیح وتشریح نہیں کی تھی۔

دیوبند میں اس مسئلہ کو لے کر کافی خلفشار ہوا، پھر مولوی شفیع دیوبندی نے ہی ایک کتاب ۱۳۸۰ھ میں"**احکام الادلة فی احکام الاھلة**"رویت ہلال کے نام سے لکھی جو"ادارۃ المعارف" کراچی سے شائع ہوئی، اس میں آلات مواصلات تار، ٹیلیفون اور ریڈیو وغیرہ کی خبروں کو مستفیض قرار دیتے ہوئے لکھا:

"خبر کی ایک صورت ایسی بھی ہے جس میں کسی چاند کے لئے باقاعدہ شہادت شرط نہیں رہتی خواہ رمضان کا چاند ہو یا عید وغیرہ کا۔ وہ صورت یہ ہے کہ کوئی خبر اتنی عام اور مشہور و متواتر ہو جائے کہ اس کے بیان کرنے والے کے مجموعہ پر یہ گمان نہ ہو سکے کہ انہوں نے کوئی سازش کی ہے یا سب کے سب جھوٹ بول رہے ہیں، ایسی خبر کو اصطلاح میں خبر مستفیض یعنی مشہور کہا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مختلف اطراف سے مختلف آدمی یہ بیان کریں کہ ہم نے خود چاند دیکھا ہے۔ یا یہ کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی نے چاند دیکھنے کی شہادت قبول کر کے چاند ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یا موجود آلات مواصلات تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ مختلف جگہوں سے مختلف لوگوں کے یہ بیانات موصول ہوں کہ ہم نے خود چاند دیکھا ہے۔ یا ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی نے شہادت سن کر چاند ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب ایسا بیان دینے والوں کی تعداد اتنی کثیر ہو جائے کہ عقلاً ان کے جھوٹ ہونے کا کوئی احتمال نہ رہے تو ایسی خبر مستفیض پر روزہ اور عید دونوں میں عمل جائز ہے۔ اس میں ریڈیو، تار، ٹیلیفون وغیرہ ہر قسم کی خبروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ صرف کثرت تعداد اتنی ہونی چاہئے کہ جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً باور نہ کیا جا سکے۔ اس میں بھی بعض فقہاء نے پچاس اور بعض نے کم وبیش کا عدد متعین کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ تعداد کوئی متعین نہیں، قاضی یا ہلال کمیٹی کے اعتماد پر مدار ہے۔ بعض اوقات سو آدمیوں کی خبر بھی مشتبہ ہو سکتی ہے۔ ایک فقیہ نے فرمایا کہ بلخ میں تو پانچ سو آدمیوں کی خبر بھی کم ہے۔ اور بعض اوقات دس کی خبر سے ایسا یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے"۔ (رویت ہلال، ص:۲۱، ادارۃ المعارف، کراچی)

اس کے بعد سے اب تک دیوبندی طویل عرصے سے ایسا ہی فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں دیوبندیوں کے فقیہ الامت محمود حسن گنگوہی نے یوں لکھا ہے:

"رمضان المبارک کے چاند کی شہادت ضروری نہیں صرف خبر کافی ہے، پس اگر ریڈیو، ٹیلیفون، تار سے خبریں آجائیں اور ان پر وثوق ہو یعنی خبر دینے والے رویت کی خبریں دیں اور یہ پورا امن ہو کہ کوئی دوسرا شخص نہیں بول رہا ہے، نہ دوسرے شخص نے تار دیا ہے بلکہ بولنے والے اور تار دینے والے کو خوب اچھی طرح پہچانا جاتا ہے اور وہ ثقہ ہے مجروح نہیں ہے (تار میں تو یہ چیز ممکن ہی نہیں) تو اگر ایسی خبروں سے صدق کا ظن غالب ہو جائے تو ان کو معتبر مان لیا جائے گا۔" (فتاویٰ محمودیہ، چاند دیکھنے کا بیان، ج:۱۵، ص:۹۵، مکتبہ محمودیہ، میرٹھ)

ایک کتاب مولوی برہان الدین سنبھلی استاد دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، نے بنام"رویت ہلال کا مسئلہ عصر حاضر کے وسائل اور ترقیات کی روشنی میں" لکھی جو ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء کو"مجلس تحقیقات شرعیہ"، ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

دیوبندیوں کے اختراعی استفاضہ کا ردو ابطال

دیوبندیوں اور وہابیوں کے اختراعی استفاضہ یعنی"جمعیۃ علمائے ہند" کے فیصلے کا رد بلیغ اور ان کی مزعومہ دلیلوں کی بخیہ دری ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں ہی مستحکم دلائل و براہین اور اقوال فقہا کی روشنی میں اجمل العلماء سلطان المناظرین مفتی اعظم سنبھل شاہ مفتی محمد اجمل قادری نعیمی علیہ الرحمہ [م ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء] نے ۲۵ رمحرم الحرام ۱۳۷۰ھ میں ایک ضخیم رسالہ بنام"اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال" تحریر فرمایا جو فتاویٰ اجملیہ جلد دوم میں شامل ہے اور ۴۸ رصفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

شیخ الاسلام مفتی مظہر اللہ دہلوی فتح پور سیکری قدس سرہ [م ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء] نے ۳۲ رصفحات پر مشتمل ایک ضخیم تحقیقی رسالہ بنام"انتفاء الحال فی رویۃ الہلال" کے نام سے تصنیف کر کے اسی جدید

اختراعی وغیر شرعی استفاضہ کا طلسم توڑ دیا تھا، یہ علمی وفقہی اور تحقیقی رسالہ اسی وقت جید برقی پریس، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ مذکورہ رسالہ ”فتاویٰ مظہریہ“ مطبوعہ ادارۂ مسعودیہ، ناظم آباد، کراچی میں شامل ہے۔ یہ فتویٰ ۶/ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ کو تحریر فرمایا۔

آپ نے ایک اور رسالہ بنام ”فتویٰ رویت ہلال“ تصنیف فرمایا جو ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء میں جید برقی پریس، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ بھی ”فتاویٰ مظہریہ“ مطبوعہ ادارۂ مسعودیہ، ناظم آباد، کراچی میں شامل ہے۔

۱۳۷۰ھ میں ہی علامہ مفتی محمد محبوب علی خاں قادری رضوی پیلی بھیتی علیہ الرحمہ [م ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء] نے دلائل وبراہین سے مزین ایک رسالہ ”ثبوت ہلال کے چند طرق“ [۱۳۷۰ھ] اسی جدید اختراعی و غیر شرعی استفاضہ کے رد پر تحریر فرمایا، یہ علمی وفقہی اور تحقیقی دستاویز ۳۲/صفحات پر مشتمل ہے اس کی اشاعت اسی وقت ”انتظامی پریس“ کان پور سے ہوئی تھی۔

ایک رسالہ ”جامع الاقوال فی رویۃ الهلال“ نام سے حضرت سید شاہ محمد حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خانقاہ ارزاں شاہی نے اسی جدید اختراعی استفاضہ کے رد پر تحریر فرمایا۔

ایک رسالہ ”نادر تحفہ جامعہ حبیبیہ“ کے نام سے شائع کیا گیا۔

ٹیلیفون وغیرہ سے استفاضہ کی تردید پر فتاوے کا مجموعہ بنام ”جوابات استفتا“ حضرت مولانا مفتی سید شاہ محمد فرید الحق عمادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خانقاہ عمادیہ، پٹنہ نے مرتب کر کے شائع فرمایا۔ ان تینوں رسائل کا تذکرہ ملک العلما حضرت علامہ ظفر الدین رضوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مجموعۂ فتاویٰ میں بھی ہے۔

مجاہد اہل سنت علامہ مفتی قیس محمد خاں قادری رزاقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک رسالہ ۱۱۱/صفحات پر مشتمل ”جید برقی پریس بلی ماران“ دہلی سے چھپوا کر شائع کیا اس کتاب کے سرورق پر اس کا تعارف یوں مرقوم ہے:

”عید کا چاند ایک جگہ دیکھے جانے سے دوسری جگہ والوں کو روزہ رکھنے، روزہ کھولنے، عید کی نماز پڑھنے، قربانی کرنے کا حکم کب ہوگا؟ ٹیلیفون، تار، ریڈیو، ٹرنک کال، وائرلیس، اخبار، یہ سب خبر رسانی کے لیے ہیں نہ شہادت کے واسطے۔

▪ اس کے متعلق یوپی، سی پی، بمبئی، بہار، بنگال، حیدرآباد، کاٹھیاواڑ، پنجاب وغیرہ کے مختلف اضلاع، مختلف مقامات، مختلف خیال اور مختلف اعتقادات، اپنے وقت کے مشہور علمائے سابقین و معاصرین کی ۱۹۵/تحریرات، فتاویٰ وتصدیقات۔ مسائلِ شرعیہ کو فتنہ، امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کو امارتِ شر سمجھنے والے، امارتِ شر لکھنے والے، امارتِ شر چھپوانے والے، امارتِ شر شائع کرنے والے، مسائلِ دینیہ کو مطابق ہوائے نفس حق کو ناحق اور ناحق کو حق کرنے والے کا مفصل رد وجواب“۔ (سرورق عید کا چاند، مطبوعہ جید برقی پریس بلی ماران دہلی)

۱۳۹۰ھ میں علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۳۰/صفحات پر مشتمل ایک رسالہ بنام ”آلات جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال“ انجمن تعمیر ملت، سہسرام سے شائع فرمایا۔ اس میں ایک تحقیقی فتویٰ علامہ کامل سہسرامی علیہ الرحمہ کا ہے اور بہت سے علما و مفتیان کرام کی تصدیقات بھی شامل ہیں اس میں ایک سوال اس طرح ہے:

”فقہا استفاضہ خبر کی صورت یہ تحریر فرماتے ہیں کہ کئی جگہ سے متعدد جماعتیں یہ آکر کہیں کہ فلاں جگہ چاند ہوا ہے اور وہاں کے لوگوں نے روزہ رکھا ہے یا عید کی ہے تو دوسرے مقام کے لوگوں کا روزہ رکھنا درست ہوگا؟ کیا متعدد جگہوں سے ایک ایک خط یا ٹیلی فون، ٹرنک کال یا ریڈیو کے ذریعے خبر آجانا بھی استفاضہ خبر کی صورت میں داخل ہے؟“

اس کا جواب رضوی دار الافتا بریلی شریف سے حضور مفتی اعظم ہند کی تائید وتصدیق اور جامعہ اشرفیہ سے بحر العلوم کے جواب پر حضور حافظ ملت اور حضرت علامہ عبد الرؤف بلیاوی اور مصنف قانون شریعت علامہ مفتی قاضی شمس الدین جعفری رضوی وغیرہ علمائے کرام رحمہم اللہ نے تحریر فرمایا ہے جو آگے مذکور ہوں گے۔

سالہا سال کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود بھی اب تک

دیوبندیوں اور وہابیوں میں سے کوئی بھی ان رسائل میں پیش کردہ علمی و فقہی ناقابل تردید دلائل و براہین کے رد کی جرأت نہیں کرسکا۔ اس کے بعد بھی اس اختراعی استفاضہ کے رد و ابطال علمائے اہل سنت اپنے زبان و قلم سے فرماتے رہے ہیں جن کی مزید تفصیلات اگلے صفحات میں درج کی جائیں گی۔

جو استفاضہ دیوبندیوں اور وہابیوں نے تقریباً ۷۵؍سال پہلے ۱۳۵۰ھ میں ایجاد و اختراع کیا تھا اس کا رد تسلسل کے ساتھ علمائے اہل سنت فرماتے رہے ہیں اور اس معاملے میں ہمارے معتمد و مستند علما و مشائخ اور مفتیان کرام میں کوئی اختلاف نہیں رہا لیکن اب چند سال پہلے کچھ سنی کہنے والے افراد نے اسی جدید غیر شرعی اور اختراعی استفاضہ کا احیا کیا اور دلیل وہی دی جو اس سے قبل سالوں سے دیوبندی دیتے چلے آرہے تھے اس کے علاوہ جو ان کی دلیلیں ہیں ان دلیلوں کو دیکھ کر ”مارے گھٹنا پھوٹے سر“ کی کہاوت ان پر صادق آتی ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری اور دیگر علمائے اہل سنت اور تمام قدیم وجدید فقہائے اعلام کثر اللہ تعالیٰ سوادہم نے صاف وصریح اور کھلے الفاظ میں ٹیلیفون وغیرہ کی خبر کو دربارۂ ہلال غیر معتبر بتایا یہ لوگ زبردستی دیوبندیوں، وہابیوں کے ایجاد کردہ اختراعی وغیر شرعی استفاضۂ مردودہ کو استفاضۂ شرعی بنانے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کر کے مسلمانوں کے روزہ وعید کے فساد و بطلان کا سبب بننے کے درپے ہیں حالانکہ ٹیلیفون کی ایجاد کے بعد جب سے ٹیلیفون کا رواج عام ہوا ہے تب سے لے کر آج تک ہمارے علمائے اہل سنت اپنی تحریر وفتاویٰ اور عمل سے مسلسل یہ ثابت کرتے آئے ہیں کہ ٹیلیفون اور جدید آلاتِ ترسیل کے ذریعے نہ تو چاند کا ثبوت ہوگا اور نہ ہی اس سے استفاضۂ شرعی کا تحقق ہوگا اب ذیل میں اکابرین واسلاف اہل سنت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کے اقوال وتحریرات اور فتاویٰ سلسلہ وار نقل کیے جاتے ہیں:

ٹیلیفونی استفاضہ اعلیٰ حضرت کی تشریحات کی روشنی میں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ [م ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء] کا موقف ”استفاضہ“ کے متعلق تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے انہوں نے جو استفاضہ کی توضیح وتشریح فرمائی ہے کہ (۱) جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں، (۲) متعدد جماعتیں آکر سب یک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بر بنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی، (۳) موبائل اور ٹیلیفون پر خبر دینے والا جہاں سے بول رہا وہاں قاضیِ شرع تو ہے نہیں کوئی مفتیِ اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ احکام روزہ وعیدین اُسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہوں عوام کالانعام بطور خود عید ورمضان نہیں ٹھہرا لیتے ہوں، ہے بھی یا نہیں یہ بھی محل نظر ہے۔ یا اگر حاکم شرع نہیں بھی ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہاں سے جماعات کثیرہ آکر یہ بیان بالاتفاق دیں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ چاند دیکھنا بیان کرتے تھے، وغیرہ شروط وقیود کو ذکر فرمایا ہے جس سے کسی بھی صورت موبائل فون اور دیگر جدید ذرائع ابلاغ سے استفاضہ کا ثبوت نہیں ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے مجموعہ فتاویٰ ”العطایا النبویۃ فی فتاویٰ الرّضویۃ“ میں ٹیلیفون سے چاند کے ثبوت کے متعلق تین فتوے ملے ہیں سب سے پہلے انہیں یہاں پر بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے تاکہ جو شخص بھی یہ تحریر پڑھے تو پہلے ہی سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے دونوں فتاوے کا مضمون ذہن میں رہے اور ان لوگوں کو آسانی سے پہچان بھی لے جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے نام محض فرضی طور پر ایسی بات ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جو بات نہ تو اعلیٰ حضرت نے کبھی کہی اور نہ لکھی بلکہ انہوں نے تو اپنا موقف در بارِ ثبوت ہلال صاف اور صریح الفاظ وعبارات کے ساتھ فقہی دلیل سے ثابت فرما کر تحریر فرمایا ہے:

(۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ۲۹؍تاریخ کو کسی شہر میں چاند نظر نہ آئے اور دُوسرے شہر میں وہی چاند ۳۰؍کا نظر آیا اور وہاں کے لوگ ٹیلی فون یا ٹیلی گراف میں اطلاع دیں تو وہ خبر معتبر ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ہرگز معتبر نہیں ہوسکتی، اصلاً قابلِ لحاظ نہیں ہوسکتی، تار کی سخت بے اعتباری میں فقیر کا فتوی مفصلہ طبع ہو چکا ہے، اُس کی

حالت ٹیلی فون در کنار، خط سے بھی بہت گری ہُوئی ہے کہ اس میں مرسل کے ہاتھ کی علامت تک نہیں ہوتی اور اکثر بنگالی بابُوؤں وغیرہم کفّار کو توسط ہوتا ہے ورنہ مجاہیل ہونا تو ضروری ہے، اور علما تصریح فرماتے ہیں کہ خط بھی معتبر نہیں، ہدایہ میں ہے:

"الخط یشبه الخط"(الہدایۃ فی شرح البدایۃ، ج:۱، ص ۱۰۴، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

تو شرعاً تار پر عمل کیونکر ممکن ! یُونہی ٹیلیفون کہ اس میں شاہد و مشہود نہیں ہوتا صرف آواز سنائی دیتی ہے اور علما تصریح فرماتے ہیں کہ آڑ سے جو آواز مسموع ہو اُس پر احکامِ شرعیہ کی بنا نہیں ہوسکتی کہ آواز آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔تبیین الحقائق امام زیلعی پھر فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

"لو سمع من وراء الحجاب لایسعه ان یشهد لاحتمال ان یکون غیرہ اذ النغمة تشبه النغمة" الخ(تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ج:۴،ص:۲۱۳، ۲۱۴،المطبعۃ الکبری الامیریۃ، بیروت/ الفتاوی الہندیۃ، ج:۳،ص:۴۵۳،دارالفکر، بیروت)

وصورة الثنیا التی ذکرت لا تحقق لها فیما نحن فیه کما لایخفی، واللہ تعالیٰ اعلم"(فتاوی رضویہ، قدیم، ج:۴،ص:۵۲۷، رضا اکیڈمی، ممبئ)

(۲) تار اور ٹیلیفون زمانۂ حال کی ایجاد ہے یعنی فقہائے ماسبق کے زمانہ میں یہ چیزیں ایجاد نہیں ہُوئی تھیں اس لئے قدیم کتبِ فقہ اس تذکرے سے خالی ہیں کہ تار اور ٹیلیفون کے ذریعے سے جو خبریں آتی ہیں وہ قابل تسلیم ہیں یا نہیں، اس مسئلہ کی نسبت علما کے ایک عام اجماع واتفاق کی ضرورت ہے، پس براہِ کرم بیان فرمایا جائے کہ تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ سے جو خبر آئے وہ ازرُوئے احکامِ شریعت قابلِ تسلیم ہے یا نہیں؟ اور ایسی خبر کی بنا پر احکامِ شرعیہ مثلاً ترک واختیارِ صوم اور تقرر یوم حج وغیرہ کا تصفیہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: تار محض بے اعتبار، یُونہی ٹیلی فون، اگر خبر دہندہ پیشِ نظر نہ ہو۔ تفصیل فقیر کے فتاوی مرسلہ سے معلوم ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔(فتاویٰ رضویہ، قدیم، ج:۴،ص:۵۲۹، رضا اکیڈمی، ممبئ)

(۳)اس ریاست میں ٹیلیفون ہونے کی وجہ سے بذریعہ ٹیلیفون رؤیت ہلال رمضان یا عیدرُوبروآمنے سامنے دونوں مسلمان ہوں اور ایک جگہ کا مسلمان دوسرے کو خبر دے کہ میں نے چاند دیکھا اور دوسری جگہ والا بھی مسلمان ہو اور اس کی آواز پہچانتا ہو کہ فلاں شخص یہ خبر دے رہا ہے تو اس کی آواز پہچان کر ان کے قول پر عمل کیا جائیگا یا نہیں؟ یا ٹیلیفون دینے والا اور لینے دونوں ملازم مسلمان ہیں، ایک نے دوسرے کو بذریعہ ٹیلیفون خبر دی رؤیت ہلال کی، اس نے دوسرے سے کہا فلاں جگہ سے مجھ کو فلاں نے کہا کہ وہاں پر رؤیت ہلال ہُوئی تو ایسی خبر پر اعتماد چاہئے یا نہیں؟

الجواب: ٹیلی فون دینے والا اگر سُننے والے کے پیشِ نظر نہ ہوتو امورِ شرعیہ میں اس کا کچھ اعتبار نہیں اگرچہ آواز پہچانی جائے کہ آواز مشابہ آواز ہوتی ہے، اگر وہ کوئی شہادت دے معتبر نہ ہوگی، اور اگر کسی بات کا اقرار کرے سننے والے کو اس پر گواہی دینے کی اجازت نہیں، ہاں اگر وہ اس کے پیش نظر ہے جسے دو بدو آمنے سامنے سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی اس کی دونوں آنکھیں اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے ہوں، ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہو، اور ٹیلی فون کا واسطہ صرف بوجہ آسانی آواز رسانی کے لیے ہو کہ اتنی دُور سے آواز پہنچنا دشوار تھا، تو اس صورت میں اس کی بات جس حد تک شرعاً معتبر ہوتی اب بھی معتبر ہوگی، مثلاً خود اپنی رؤیت کی شہادت ادا کرے تو مانی جائے گی اگر وہ مقبول الشہادۃ ہے، لیکن اتنی بات کہ فلاں جگہ رؤیت ہُوئی اگرچہ متصل آکر ادا کرے جب بھی معتبر نہیں کہ یہ محض حکایت ہے نہ کہ شہادت، اور یہ کہ فلاں نے مجھ سے کہا کہ فلاں جگہ ہُوئی، اور زیادہ مہمل کہ حکایت در حکایت ہے۔

تبیین الحقائق پھر فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ولو سمع من وراء الحجاب لایسعه ان یشهد لاحتمال ان یکون غیرہ اذ النغمة تشبه النغمة الا اذا کان فی الداخل وحدہ ودخل وعلم الشاهد انه

لیس فیه غیره ثم جلس علی المسلك ولیس له مسلك غیره فسمع اقرار الداخل ولایراه لانه یحصل به العلم وینبغی للقاضی اذا فسرله ان لایقبله۔" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ج:۴،ص: ۲۱۳، ۲۱۴،المطبعۃ الکبری الأمیریۃ، بیروت/ الفتاوی الہندیۃ، ج:۳،ص: ۴۵۳، دار الفکر، بیروت)

ذخیرہ پھر ہندیہ میں ہے:

"کان الفقیه ابو اللیث یقول اذااقرت المرأة من وراء الحجاب وشهد عنده اثنان انها فلانة لا یجوز لمن سمع اقرارها ان یشهد علی اقرارها الا اذارأی شخصا یعنی حال مااقرت فحینئذ یجوزله ان یشهد علی اقرارها بشرط رؤیة شخصها لارؤیة وجهها" (الفتاوی الہندیۃ، ج:۳،ص: ۴۵۳، دار الفکر، بیروت)

درمختار میں ہے:

شهدوا أنه شهد عند قاضی مصر کذا شاهد ان برؤیة الهلال فی لیلة کذاوقضی القاضی به ووجد استجماع شرائط الدعوی قضی أی جازلهذا القاضی ان یحکم بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهد وابه لا لو شهد وابرؤیة غیرهم لانه حکایةاه۔ (الدر المختار مع رد المحتار، ۳،ص: ۳۹۰، دار الفکر بیروت)

وتمام تحقیقہ فی فتاویٰ نا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہ تینوں فتاوے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے تحریر فرمودہ ہیں انہیں اگر بغور پڑھ کر ان میں لکھے ہوئے حکم شرع کو ذہن نشین کر لیا ہے تو اب غور کیجیے کہ اگر ٹیلیفون سے استفاضہ شرعی کی کوئی صورت ہوتی تو اعلیٰ حضرت قدس سرہ اسے بیان فرماتے، لہٰذا حقائق سے منھ موڑ کر دیوبندیوں کے نو ایجاد شدہ اختراعی و غیر شرعی استفاضہ کی تجدید و احیا کے لیے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا قدس سرہ کے نام و نسبت کا استعمال کرنا غایت درجے کی ہٹ دھرمی ہے۔

ٹیلیفونی استفاضہ صدر الشریعہ کی تشریحات کی روشنی میں

حضور صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء تحریر فرماتے ہیں:

"شریعت مطہرہ نے چاند ہونے میں صرف رویت کا اعتبار کیا ہے، یا یہ کہ اگر وہاں رویت نہ ہوئی تو دوسری جگہ کی رویت ہلال گواہوں سے ثابت ہو جائے اور یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو مہینہ ۳۰؍دن کا لیا جائے گا، اگرچہ جنتریوں میں ۲۹؍ کا لکھا ہو۔ اخبار یا ٹیلیفون یا ریڈیو وغیرہ کا کچھ اعتبار نہیں"۔ (فتاویٰ امجدیہ، ج:۱، ص: ۳۹۳، قادری کتاب گھر، بریلی شریف)

اسی میں ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی گراف اور وائرلیس فقہی نقطۂ نظر سے ان کو دعوی شہادت باقتضائے قاضی اور خبر مستفیض کی کس شق میں داخل سمجھا جا سکتا ہے؟

آپ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ٹیلیفون، ریڈیو کی خبریں اس باب میں نا قابل اعتبار ہیں کہ ان سے کسی چیز کا ثبوت شرعی نہیں ہوتا ایسی خبروں سے نہ روزہ رکھا جائے گا نہ عید کی جائے گی، ان خبروں کو نہ شہادت شمار کیا جا سکتا ہے نہ ان کو استفاضہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (فتاویٰ امجدیہ، ج:۱،ص: ۳۹۴، قادری کتاب گھر، بریلی شریف)

ٹیلیفونی استفاضہ محب الرضا کی تشریحات کی روشنی میں

محب الرضا علامہ مفتی محمد محبوب علی خاں قادری رضوی پیلی بھیتی علیہ الرحمہ [م ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء] تحریر فرماتے ہیں:

"فسبحان الله وبحمده! فقہائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتنی صاف تصریح فرما دینے کے بعد بھی آج کے مدعیان مولوی افواہ و حکایت کو بھی زبردستی خبر مستفیض بنا کر حدود شرعیہ کو توڑنا چاہتے ہیں جس طرح ابنائے وطن نے ایک غیر ذی روح بے جان جسم لاؤڈ اسپیکر کی صدا پر نمازوں میں اقتدا کرا دی اگر کسی دلیل پر بھی نظر نہ کی جائے تو کیا نماز میں لاؤڈ اسپیکر لگانا بدعت اور بدعت سیئہ نہ ہوگا؟ کیا جماعات

کثیرہ میں مکبروں کا مقرر کرنا مشہور ومعروف سنت نہیں ہے؟ اور یہ سنت اس لاؤڈ اسپیکر کے لگانے سے مٹے گی یا نہیں؟ اور جس کام سے کوئی سنت مٹے تو کیا وہ بھی بدعت سیئہ نہ ہوگا؟ اسی طرح اب شہادت و رویت کی حدود و قیود کو بالائے طاق رکھ کر آج کے نو ایجاد بے جان آلات خبر رساں پر رکھ دینا چاہتے ہیں، نعوذ باللہ من ذلک"۔ (ثبوت ہلال کے چند طرق، ص: ٦، انتظامی پریس، کان پور)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی اعظم دہلی کی تشریحات کی روشنی میں

مفتی اعظم دہلی شیخ الاسلام مفتی مظہر اللہ دہلوی فتح پوری قدس سرہ [م ١٣٨٦ھ/ ١٩٦٦ء] سے سوال کیا گیا:

"رویت ہلال کے متعلق تار، ٹیلیفون، خطوط، ریڈیو کی خبر مثل عینی شہادت کے معتبر اور قابل عمل ہے یا نہیں آج کل عوام ہی نہیں بلکہ بعض اہل علم بھی ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر پر اعتماد کلی رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ عذاب، ثواب ہماری گردن پر ہے، کیا ان کا یہ قول شرعاً قابل عمل ہوگا یا نہیں اگر ہوگا تو کیا اگر کوئی عالم رویت کا فیصلہ کر کے بذریعہ ریڈیو اعلان کروائے تو یہ بھی قابل عمل ہوگا یا نہیں؟" (فتاویٰ مظہریہ، ج: ١، ص: ١٣١، ادارہ مسعودیہ، کراچی)

آپ اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"رہی تیسری صورت یعنی خبر مستفیض تو وہ اگرچہ خبر ہے لیکن اس کے تحت بھی ان اخبار میں سے کوئی خبر داخل نہیں اس لیے کہ اس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ خبر مستفیض یہ ہے کہ بلدۂ رویت سے متعدد جماعتیں آکر بیان کریں کہ فلاں مقام پر مثلاً چاند دیکھ کر روزہ رکھا گیا"۔ (فتاوی مظہریہ، ج: ١، ص: ١٣٢، ادارہ مسعودیہ، کراچی)

ٹیلیفونی استفاضہ اجمل العلما کی تشریحات کی روشنی میں

اجمل العلما سلطان المناظرین مفتی اعظم سنبھل شاہ مفتی محمد اجمل قادری نعیمی علیہ الرحمہ [١٣٨٣ھ/ ١٩٦٣ء] تحریر فرماتے ہیں:

"ایک مقام کی رویت ہلال دوسرے مقام کے لئے صرف شہادت علی الرویۃ یا شہادت علی القضا، یا استفاضہ سے ثابت ہو سکتی ہے جو عند الفقہا معتبر ومقبول اور طریق موجب ہے اور ان کے علاوہ تار، ٹیلیفون، لاؤڈ سپیکر، ریڈیو، وایرلیس، خط، افواہ، اخباری خبریں، جنتریاں، قیاسات۔ نہ شہادت کا افادہ کریں نہ استفاضہ کا بلکہ ان سے صرف خبر و حکایت حاصل ہوتی جو شرعاً بھی غیر معتبر، نا مقبول ہے اور قانوناً بھی اس سے شہادت ثابت نہیں ہوتی ہے، ورنہ کچہریوں میں انہیں آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں سے شہادت حاصل کر لی جاتی اور بلا شاہد کے حاضر کیے ہوئے انہیں آلات پر اعتماد کر کے کسی مقدمے کی ڈگری کر دی جاتی۔ لہٰذا ان آلات کی خبروں کا شرعاً قانوناً کسی طرح اعتبار نہیں۔ میں نے اس مبحث میں ایک مبسوط و مفصل رسالہ لکھ دیا ہے جس میں ایک ایک کی پوری پوری بحث اور اس میں بکثرت عبارات منقول ہیں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

▪ تبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد أجمل غفر له الاول، ناظم المدرسة اجمل العلوم فی بلدة سنبهل "(فتاویٰ اجملیہ، ج: ٢، ص: ٦٦٦، شبیر برادرز، لاہور)

اسی میں ہے:

"عید الفطر کے لیے انتیس کا چاند رویت یا شہادت شرعی کی صور یا استفاضہ کی صور یعنی کل طریق سے ثابت ہوتا ہے ان طریق کے علاوہ بیس طریق اور ہیں حکایت، خبر، اخبار، جنتری، تار، ریڈیو، ٹیلیفون، وائرلیس، لاؤڈ اسپیکر، ٹیلی ویزن و قیاس وغیرہ سے ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتا ہے"۔ (فتاویٰ اجملیہ، ج: ٢، ص: ٦٧١، شبیر برادرز، لاہور)

ایک فتوے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"تار، ٹیلیفون، لاوڈ اسپیکر، ریڈیو، وائرلیس، ٹیلی ویژن، افواہ، خطوط، اخباری خبریں، جنتریاں، قیاسات نہ شہادت کا استفادہ کرتی ہیں، نہ استفاضہ کا، بلکہ ان سے صرف خبر و حکایت حاصل ہوتی ہے، اور قانوناً، شرعاً ان کی خبر غیر معتبر و نا مقبول ہے تو ان کی خبر سے نہ روزہ کھولا جا سکتا ہے، نہ عیدین کی نماز پڑھ سکتے ہیں، نہ قربانی کی جا سکتی

ہے۔لہذا ریڈیو وغیرہ کی خبروں پر جنھوں نے روزہ کھولنے یا نماز عیدین پڑھنے یا قربانی کرنے کا حکم دیا وہ غلط اور باطل ہے۔واللہ اعلم
محمد اجمل غفرلہ عزوجل المفتی فی بلندۃ سنبھل
(عید کا چاند،ص:۸۲، ۸۳ جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ محدث گھوسوی کی تشریحات کی روشنی میں

رئیس الاذکیا علامہ غلام یزدانی محدث گھوسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء] تحریر فرماتے ہیں:

”ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار کی خبریں کسی حال میں ثبوت رؤیت ہلال کے لیے کافی نہیں، شریعت کے اصول پختہ ہیں، دنیوی حکومتیں بھی بوقت فیصلہ مقدمات گواہوں کا مجلس حاکم میں ہونا ضروری جانتی ہیں، کسی گواہ کو یہ حق نہیں دیتیں کہ وہ بذریعہ فون، یا بذریعہ تار، یا بذریعہ ریڈیو، یا بذریعہ وائرلیس گواہی دے سکتا ہے، اور اگر کسی گواہ کی خبر فون وغیرہ سے حاکم لے اگرچہ مجلس قضا میں تو حاکم اس خبر پر مقدمہ کے فیصل کی بنا نہیں رکھ سکتا، تو پھر مسلمان اسلامی قانون کو کیوں اتنا کمزور سمجھتے ہیں اور کیوں اخباری افواہ وغیر معتبر خبروں کو سن کر اہل حل و عقد علمائے کرام کو روزہ توڑنے اور عید کرنے پر مجبور کرتے ہیں حاصل یہ کہ ریڈیو وغیرہ کی خبریں عند الشرع تو کیا اہل دنیا کے نزدیک بھی معتبر نہیں، کتبہ الفقیر غلام یزدانی، عفی عنہ۔“ (عید کا چاند، ص:۸۶، ۸۷، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ تاج العلما مارہروی کی تشریحات کی روشنی میں

شہزادۂ صاحب عرس قاسمی تاج العلما اولاد رسول حضرت علامہ مفتی سید شاہ محمد میاں صاحب مارہروی [م ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء] کے فتوی پر سید العلما سند الحکما حضرت مولانا مفتی حکیم سید آلِ مصطفیٰ عرف سید میاں قادری برکاتی [م ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء] اور شیخ المشائخ، زین الاصفیا، احسن العلما حضرت مولانا حافظ قاری سید شاہ مصطفےٰ حیدر حسن میاں قادری برکاتی مارہروی [م ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء] علیہم الرحمہ کی تصدیق سے مزین ہے:

”ریڈیو، ٹیلی فون، تار، وائرلیس، اخبار یہ سب شہادت شرعیہ میں قطعاً نا قابل اعتبار ہیں محض ان کی بنا پر مسائل دینیہ روزہ کھولنے نماز عیدین کے ادا کرنے کا حکم دینا شرعاً جائز نہیں ارشاد ربانی ہے:

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

[القرآن الکریم، سورۃ البقرۃ:۲، الآیۃ:۱۸۵]

عدت رمضان پر تکبیر عید الفطر کو مرتب فرمایا تو جو لوگ تار اور وائرلیس ٹیلی فون وغیرہ وغیرہ پر لگ کر جن سے شرعاً رویت ہلال کا ثبوت ہو کر تکمیل عدت نہیں ہوتی تکمیل کے بغیر تکبیر عید الفطر کی طرف دوڑتے ہیں وہ قرآن شریف کی پر از حکمت ترتیب لطیف کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں ہمارے فقہا نے دربارۂ شہادت خط تک کا اعتبار نہیں فرمایا قاضی شرع کا خط بھی امر شہادت میں جب معتبر ہے کہ دو ثقہ مسلمان مرد یا ایک مرد دو عورتیں گواہی دیں کہ یہ خط قاضی شرع کا ہی ہے اور اس نے ہمارے سامنے لکھا ہے تو اب مقام غور ہے کہ خط جو ایک باقی رہنے والی چیز ہے اور جس کی پہچان بآسانی ہو جاتی ہے پھر خط کا خط سے مشابہ کر لینا بھی بہت مشکل ہے نیز مہر سے مہر ملا دینا بھی مگر صرف اس امکان کی بنا پر کہ خط جعلی بنا لیا جاتا اور مہر بھی جھوٹی گڑھ لی جاتی ہے علمائے کرام نے دستی مہری قاضی شرع کے خط کو بھی جو شرعاً والی اسلام ہوتا ہے امر شہادت میں نامعتبر ٹھہرایا تو اس صورت میں کہ کہنے والا ہمارے سامنے نہیں صرف اس کی ایک آواز ہے اور وہ بھی نہیں مگر ہوائی لہریں جیسا کہ ٹیلی فون اور ریڈیو، وائرلیس میں یہی حال ہے اور تار میں تو اور بھی اس سے گرا ہوا کہ وہاں تو اصل قائل بلکہ ناقل کی بھی اصل آواز بھی نہیں ہوتی تو ایسی برباد چیز پر شہادت شرعیہ کا مدار رکھ کر خواہ مخواہ ان محدثات جدیدہ میں اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ اپنے مظنونات کی بنا پر دین وایمان اور احکام شرع کو مقید کر دینا کونسی دیانت وامانت ہے آج کل کی یہ لادینی حکومت کی کچہریاں جو کھلے ہوئے کفار اور فجار وفساق تک کی گواہیاں مان لیا کرتی ہیں ریڈیو اور وائرلیس اور ٹیلی فون وغیرہ پر دی ہوئی گواہیاں نہیں مانتیں تو انہی مردود ومطرود نام

نہاد گواہیوں اور شہادتوں پر صوم و افطار رمضان وعید وغیرہا کے شرعی احکام حلال وحرام کا دارمدار رکھ لینا کون سی شریعت و دین اور کیسی خیر خواہی اسلام و مسلمین ہے۔

فقیر اولا درسول محمد میاں قادری برکاتی غفر اللہ تعالی لہ خادم سجادہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ۔

حبذ التحقیق و نعم الجواب و حضرۃ المجیب مصیب و مثاب وھو تعالی اعلم و أنا الفقیر المحافظ مصطفی حیدر المعروف بحسن میاں القادری البرکاتی المارھروی غفر لہ

مبسلا و حامدا و مصلیا و مسلما ھذا ھو الحق و الصواب فنعم الجواب و نعم المجیب وھو تعالی اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب و صلی اللہ تعالی علی حبیبہ سیدنا محمّد و علی آلہ اجمعین الی یوم الحساب و انا الفقیر ابو الحسین آل مصطفی سید میاں القادری البرکاتی خادم السجادۃ العالیہ البرکاتیہ المارھرویۃ "(عید کا چاند،ص:۸۰،۸۱،جید برقی پریس،بلی ماران،دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ محدث اعظم ہند کی تشریحات کی روشنی میں

خلیفۂ اعلیٰ حضرت محدثِ اعظمِ ہند ابو المحامد سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ[م ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء] کا فتویٰ ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار وغیرہ سے چاند کی شہادت کے متعلق جو کثیر علمائے کرام کی تائیدات و تصدیقات سے مزین ہے اصل فتویٰ مع تصدیقات ملاحظہ فرمائیں:

"ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار شرعا شہادت ہونا تو بڑی چیز ہے آج تک کسی قانون نے بھی ان چیزوں کو شہادت میں استعمال کرنے کا حق نہیں دیا لہٰذا ان چیزوں کو مسائل دینیہ میں درجہ شہادت کا دینا قطعاً جہالت اور حقیقت شہادت سے نادانی پر مبنی ہے۔

فقط دعا گو فقیر ابو المحامد سید محمد غفرلہ اشرفی جیلانی کچھوچھا شریف ضلع فیض آباد۔

الجواب صحیح سید محمد مختار اشرف سجادہ نشین کچھوچھا شریف ضلع فیض آباد، نعم الجواب و حبذا التحقیق سید معین الدین اشرف کچھوچھا شریف، قد اصاب من اجاب فقیر نعیم اشرف سجادہ نشین استانہ اشرفیہ جائس رائے بریلی، الجواب صحیح سید مجیب الدین اشرف کچھوچھوی، الجواب صحیح حامد حسن اشرفی نعیمی سنبھلی مدرس مدرسہ اسلامیہ نوریہ دھام پور بجنور، الجواب صحیح محمد انور خاں نعیمی قادری غفرلہ ادری ضلع اعظم گڑھ، جواب صحیح محمد سلیمان غفرلہ بھاگل پوری سابق مدرس مدرسہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ، الجواب صحیح قاضی محمد احسان الحق نعیمی قاضی شہر بہرائچ و سابق عالم درگاہ بہرائچ، الجواب صحیح فقیر صلیح الدین احمد نعیمی سجادہ نشین خانقاہ سہسرام ضلع شاہ آباد، الجواب صحیح والمجیب نجیح کتبہ الفقیر شمش الدین جعفری رضوی جونپوری، الجواب صحیح أحقر العبید محمد عبد الحمید قادری عفی عنہ لکھنوی، الجواب صحیح خادم الفقر حکیم سید شاہ عزیز احمد سلیمی ابو العلائی سجادہ نشین نیا حجرہ الہ آباد، الجواب صحیح فقیر محمد زین العابدین مدرسہ منظر حق ٹانڈہ، الجواب صحیح فقیر عبد الحمید ٹانڈہ ضلع فیض آباد، الجواب صحیح محمد اسحاق بقلم خود مدرس مدرسہ منظر حق ٹانڈہ فیض آباد، نعم الجواب محمد خلیل کچھوچھوی خادم دار العلوم اشرفیہ اسلامیہ نسیم آباد کالی برار، الجواب صحیح سید آل حسن بقلم خود سنبھل محلہ جگت ضلع مراد آباد، الجواب صحیح محمد عبد الرب اشرفی امام مسجد چوک شہر بنارس"۔(عید کا چاند، ص:۷۹، ۸۰، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ ملک العلما کی تشریحات کی روشنی میں

ملک العلما ابو البرکات علامہ شاہ مفتی ظفر الدین قادری رضوی قدس سرہ[م ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء] سے سوال کیا گیا:

"زمانے کی ایجادات ریڈیو، تار، ٹیلیفون، ٹرنک کال وغیرہ سے جب خبروں کی آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان کو نہ ماننا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا خود کو سو برس پیچھے ڈھکیل دینے کے مرادف ہے اور اس

بارے میں عام علمائے ہندوستان کا کیا فتوی ہے؟"۔(فتاویٰ ملک العلما، کتاب الصوم،۱۵۶، المجمع الرضوی، بریلی شریف)

آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"تحریرات سابق سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ہلال عیدین میں شہادت گواہان عادل کی ضرورت ہے۔ نہ صرف خبر کی اور تار، ٹیلیفون، ٹرنک کال، ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے لئے موزوں ہیں، نہ شہادت کے لئے۔ اس لیے جن لوگوں نے تار، ٹیلیفون وغیرہ ایجاد کئے، کبھی انہوں نے بھی فوجداری اور دیوانی کے مقدمات میں گواہوں کے لئے ان چیزوں کو قابل قبول نہ جانا۔ ایسے روشن خیال حضرات سے گذارش ہے کہ پہلے یہ نصیحت حکام وقت کو کریں کہ جب دنیا نے ترقی کر کے عوام کی سہولت کے لئے سامان فراہم کیا ہے، اس سے فائدہ نہ اٹھانا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا خود کو سو برس پیچھے ڈھکیل دینے کے مرادف ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو چاہئے کہ مقدمات میں گواہوں کی حاضری لازم قرار نہ دیجئے۔ جی چاہے تو آئے ورنہ جہاں سے چاہے فون کر دے یا تار دیدے یا جو اظہار دینا ہے، ریڈیو اسٹیشن پر جا کر وہیں سے نشر کر دے۔ اس میں متخاصمین کا بہت روپیہ جو گواہوں کے لانے لے جانے میں صرف ہوتا ہے، بچ جائے گا۔ اگر کچہریوں میں اس کو رائج نہ کر سکیں تو الیکشن کا زمانہ قریب ہے کوشش کر کے پہلے اس میں جاری کرائیے کہ ووٹروں کو پولنگ اسٹیشن پر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہر شخص اپنے قریب کی جگہ سے فون کر دے یا تار دیدے یا ریڈیو اسٹیشن پر جا کر بول دے کہ میں نے فلاں شخص کو ووٹ دیا، تب اس روشن خیالی کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ جب کچہریوں کی شہادت میں ان ذرائع کو جاری کر لیں تب علمائے کرام کو نصیحت کریں اور لکیر کے فقیر بننے سے ان کو روکیں۔ افسوس کی بات ہے کہ دنیوی قانون میں ایک انچ کمی بیشی کی ہمت نہیں کر سکتے، ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے کے لیے تیار مگر شرعی مسائل میں مداخلت کے لئے کمربستہ۔ میری یہ غرض نہیں کہ چونکہ دنیوی کچہریوں میں شہادت کے لئے یہ چیزیں مقبول نہیں، اس لئے ثبوت ہلال کے لئے ہم نہیں مانتے۔ جب کسی وقت کچہریوں کی شہادت میں قابل قبول سمجھی جائیں گی ثبوت ہلال میں بھی معتبر ہوں گی بلکہ دکھانا یہ ہے کہ دنیوی کچہریوں میں شہادت کے قواعد و قانون بہت نرم ہیں پھر بھی یہ چیزیں شہادت کے لیے معتبر نہیں پھر شرعی مسائل جس کی شہادت کی شرطیں بہت سخت ہیں، ان میں کیونکر قابل اعتبار سمجھی جاسکتی ہیں۔ یہ فتوی کہ تار، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹرنک کال وغیرہ برقی خبریں صرف خبر رسانی کے لیے ہیں، شرعاً ثبوت ہلال کی شہادت کے لئے معتبر نہیں۔ ہندوستان بھر کے مشاہیر علمائے سابقین و موجودین کی تحقیق ہے۔(فتاویٰ ملک العلما، کتاب الصوم،۱۷۱، ۱۷۲، المجمع الرضوی، بریلی شریف)

ٹیلیفونی استفاضہ محدث اعظم پاکستان کی تشریحات کی روشنی میں

محدث اعظم پاکستان علامہ مفتی سردار احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ [م ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء] تحریر فرماتے ہیں:

"تار، ریڈیو، ٹیلیفون، وغیرہ آلات جدیدہ سے رویت ہلال کا ثبوت شرعاً نہیں ہوتا"۔(فتاویٰ محدث اعظم، ص:۸۵، مکتبہ قادریہ، فیصل آباد)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی محبوب اشرفی مبارکپوری کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مولوی محمد محبوب صاحب اشرفی، مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ تحریر فرماتے ہیں:

ریڈیو، وائرلیس، تار، ٹیلی فون، اخبار یہ سب خبر رسانی کے لیے ضرور موضوع ہیں مگر جب دنیاوی ذمہ داریوں کی جگہ مثلاً کچہریاں، مقدماتِ فوجداری، دیوانی وغیرہ میں ان ذرائع سے نہ شہادت لی جائے نہ ان ذرائع پر اعتماد کیا جائے تو دینی ذمہ داریوں کے موقع پر ان ذرائع کا اعتبار کیسے ہوسکتا ہے؟ لہٰذا موجودہ ریڈیو، تار وغیرہ کی خبر رؤیتِ ہلال پر روزہ رکھنا یا روزہ کھولنا، عید کرنا اور قربانی کا حکم دینا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔(عید کا چاند، ص:۹۲، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی سید عزیز حسین مونگیری کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مولوی سید عزیز حسین صاحب رضوی، لکھنپور، ضلع مونگیر، تحریر فرماتے ہیں:

ریڈیو، تار، وائرلیس اور اخبار وغیرہ یہ سب چیزیں خبر رسانی کے لیے بنائی گئی ہیں، نہ کہ گواہی دینے کے لیے اگر گواہی کے لیے موضوع کی جاتیں تو اس سے برابر یہ کام لیا جاتا حالانکہ جب سے یہ چیزیں وجود میں آئی ہیں کسی ایک دیوانی، فوج داری یا دوسرے مقدموں میں کبھی بھی گواہی کا کام نہیں لیا گیا ہے۔ ہندوستان تو ہندوستان یورپ اور امریکہ جہاں یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہاں بھی اس سے گواہی کا کام نہ پہلے لیا گیا اور نہ اب لیا جاتا ہے اس کا کام اشاعت خبر ہے اور وہ پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔ جب دنیوی معاملات میں اس کی شہادت قابل اعتبار نہیں تو دینی معاملات میں کس طرح قابل اعتبار ولائقِ عمل سمجھا جائے گا، خصوصاً رؤیتِ ہلال کے مسئلہ میں ثبوتِ ہلال کے لیے شہادت ضروری ہے اور ریڈیو، تار، وائرلیس، ٹیلی فون، خط، جنتری اور اخبارات یہ سب حدودِ شہادت سے خارج ہیں۔ ان میں کوئی بھی شرائطِ مذکورہ کتابُ الشہادہ کے تحت قابلِ عمل نہیں قرار دیے جاسکتے ہیں۔ **واللہ تعالی أعلم بأحکامه و صلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد و آله واصحابه أجمعین**

حررہ بقلمہٖ فقیر عزیز حسین رضوی عفی عنہ
امام جامع مسجد، موضع لکھنپور، ڈاکخانہ اثر گنج، ضلع بھاگل پور
(عید کا چاند، ص:۹۰، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مصباح الفقہا کی تشریحات کی روشنی میں

مصباح الفقہا محبوب رب ذوالمنن خواجہ بندہ نواز سید شاہ مصباح الحسن چشتی مودودی قدس سرہ [م ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۵ء] تحریر فرماتے ہیں:

”ریڈیو تار وائرلیس اخبار یہ سب آلات خبر رسانی میں خبر کہتے اسے ہیں جو محتمل الصدق و الکذب ہو ایسی محتملہ خبروں پر شرعی احکام ہرگز نافذ نہیں کئے جاسکتے جن کی یہ ایجادات ہیں ان کی یہ کچہریوں میں خود یہ چیزیں ناقابل اعتبار اور قانون شہادت سے خارج ہیں۔ واللہ اعلم

حررہ از سید مصباح الحسن“
(عید کا چاند، ص:۸۱، ۸۲، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ حضور سید العلما مارہروی کی تشریحات کی روشنی میں

سید العلما سند الحکما حضرت مولانا مفتی حکیم سید آلِ مصطفیٰ عرف سید میاں قادری برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ [م ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء] کی خبر مستفیض کے متعلق تصریح وتشریح ملاحظہ فرمائیں:

”ریڈیو وائرلیس تار اخبار وغیرہ آلات جدیدہ پر آئی ہوئی خبریں شہادت ہونے کی اصلاً قابلیت نہیں رکھتی کہ شہادت میں مشاہدہ وشہود رکن شہادت ہے نہ ان پر آئی خبر خبر مستفیض ہوسکتی ہے کہ خبر مستفیض کے شرائط بھی ان آلات میں مفقود ہیں کہ ان تمام چیزوں میں علم صحیح حاصل ہونا دشوار ہے لہٰذا ان آلات جدیدہ کی خبر پر بھی ان امور شرعیہ میں اعتبار کرنا درست نہیں واللہ تعالی اعلم

فقیر آل مصطفی قادری خطیب مسجد کھڑک بمبئی ۹“
(عید کا چاند، ص:۸۱، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی محمد عمیم الاحسان کی تشریحات کی روشنی میں

علامہ مفتی سید محمد عمیم الاحسان برکتی مجددی، مونگیری [م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۴ء] لکھتے ہیں:

”خطوط، اخبارات کا آنا ثبوت ہلال کے لیے کافی نہیں، نہ تار کی خبر شرعاً اس امر میں معتبر ہے کیونکہ اس کا شرعی کوئی ثبوت نہیں کہ جس کا نام تار میں لکھا ہوا ہے، واقعی اس نے تار بھیجا ہے پھر تار اگرچہ متعدد

ہوں تو شہادت نہیں، بلکہ خبر ہے، وہ بھی متعدد مجہول واسطوں سے جو کافر و مسلم کے درمیان دائر ہیں، پھر غیر مانوس طریقے پر جس میں غلطی کا احتمال ہے، علاوہ ازیں تار دلالت وضعیہ غیر لفظیہ ہونے میں خط کے مشابہ ہے، بلکہ خط سے بھی ادون ہے، تو جب خطوط و مراسلات و جرائد کے عدم اعتبار کا یہ حال ہے تو تار تو بطریق اولی غیر معتبر ہے، واللہ اعلم

کتبہ السید محمد عمیم الاحسان المجد دی، عفاعنہ، مفتی دار الافتا، جامعہ مسجد ناخدا، کلکتہ
الجواب صحیح، والمذکور صدوق حررہ مشتاق احمد عفاعنہ الصمد، خویدیم طلبہ مدرسہ عالیہ کلکتہ
(عید کا چاند، ص: ۷۵، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی عبد الرشید فتح پوری کی تشریحات کی روشنی میں

علامہ مفتی محمد عبد الرشید فتح پوری، علیہ الرحمہ [م ۱۳۹۵ھ] تحریر فرماتے ہیں:

”حامداً و مصلیاً و مسلماً دوسری جگہ کے مسلمانوں پر روزہ رکھنا یا عید کی نماز ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا جب کہ وہاں چاند ہونے کا شرعی ثبوت پہنچ جائے۔ ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار کی خبروں پر روزہ رکھنے یا عید کرنے کا حکم دینا شرعاً جائز نہیں۔ واللہ اعلم

کتبہ محمد عبد الرشید فتحپوری، مفتی جامعہ عربیہ، ناگپور، ایم۔ پی“
(عید کا چاند، ص: ۸۶، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی زین العابدین ناگپوری کی تشریحات کی روشنی میں

”(۱) چاند دیکھنے والا یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا ریڈیو وغیرہ آلات خبر سے اعلان کرے گا تو یہ ایک خبر ہوگی جو شرعاً چاند کے ثبوت میں نا قابل اعتبار عمل ہے۔

(۲) جبکہ فقہائے کرام نے خط کا اعتبار نہیں کیا اگر چہ کاتب کی دستخط اور تحریر پہچانتا ہو اور اس پر اس کی مہر بھی ہو کہ: ”**الخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم**“ تو ٹیلیفون، ٹرنک کال، تار، ریڈیو وغیرہ آلات خبر کا اعتبار کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سب نا قابل اعتبار ہیں تو کیسے استفاضۂ شرعیہ میں داخل ہو سکتے ہیں؟

(۳) دوسرے مقامات والوں کو بذریعۂ خبر اطلاع ہوگی اس لیے ان لوگوں کو عید کرنے کے لئے اعلان کرنے کا حق نہیں ہے اور اس خبر کو منادی اور مثل ڈھول کے اعلان کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ منادی وغیرہ میں اگر کسی کو شک و شبہ ہوگا تو وہ شہر کے مفتی کے پاس جا کر جہاں شہادت شرعیہ سے چاند کا ثبوت ہوا ہے اپنے شک و شبہ کو دور کر سکتا ہے۔ لیکن بذریعۂ خبر جو اطلاع ہوگی اس میں شک اور شبہ کی گنجائش ہوگی اور اس کے ازالہ کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

(۴) شہادت شرعیہ نہیں دیا جا سکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد زین العابدین غفرلہ
خادم دار الافتار جامعہ عربیہ ناگپور
(آلات جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال، ص: ۲۳، انجمن تعمیر ملت، سہسرام)

ٹیلیفونی استفاضہ علمائے خانقاہ عمادیہ پٹنہ وغیرہ کی تشریحات کی روشنی میں

خانقاہ عمادیہ کے آٹھویں سجادہ نشین علامہ مفتی سید شاہ صبیح الحق عمادی علیہ الرحمہ [م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء] تحریر فرماتے ہیں:

”تار، ریڈیو، فون، وائرلیس، اخبار وغیرہ جب حکومت وقت کے نزدیک بھی شہادت کے لئے نا معتبر ہیں تو مسائل دینیہ میں ان کا اعتبار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا آلات جدید کی آئی ہوئی خبروں پر نہ روزہ رکھنا درست ہے، نہ کھولنا صحیح، اور نماز عیدین و قربانی بھی درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم

فقیر صبیح الحق عمادی غفرلہ جاروب کش آستانہ عمادیہ پٹنہ سٹی
الجواب صحیح فرید الحق عمادی، نائب سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ
صحیح الجواب محمد عبد الخالق غفرلہ، خطیب و امام جامع مسجد دریاپور پٹنہ“۔
(عید کا چاند، ص: ۸۳، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ عمدۃ المحققین کی تشریحات کی روشنی میں:

عمدۃ المحققین علامہ مفتی محمد حبیب اللہ نعیمی اشرفی بھاگل پوری علیہ الرحمہ [م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء] تحریر فرماتے ہیں:

”رویت ہلال کے متعلق ریڈیو، تار، ٹیلیفون، وائرلیس کی خبریں

غیر معتبر ہیں، شرعاً ان خبروں پر عید نہیں منائی جاسکتی ہے۔ کسی ہلال کمیٹی کا امور مذکورہ کی خبروں پر عید منانے کا اعلان کرنا صحیح و جائز نہیں، اور جس شخص نے ریڈیو پر اعلان کیا یا کرایا کہ روزہ کھولو یہ سب کے سب خاطی اور گنہگار ہیں۔ ان کا یہ اقدام خلاف شرع ہے ان تمام مسائل کی مکمل تفصیل اہل سنت کے رسائل مبارکہ" از کی الاھلال بابطال ما احدث الناس فی امر الھلال " اور" البدور الاجلۃ فی أمور الاھلۃ " اور ''عید کا چاند'' اور" جامع الاقوال " اور" اجمل المقال " اور" طرق اثبات الھلال " وغیر ہا میں درج ہیں، جو عرصہ دراز سے بریلی شریف، پٹنہ، دہلی، سنبھل ضلع مرادآباد سے شائع ہوتے رہے ہیں۔" اھ ملخصاً۔ (حبیب الفتاویٰ کتاب الصوم، ج:۱، ص:۶۲۰، ۶۲۱، شبیر برادرز، لاہور)

اسی میں ہے:

" ثبوت رویت ہلال کے لیے خط، ٹیلیفون، ریڈیو اور صفحات اخبار و تار بیکار اس لیے کہ دوسرے مقامات پر ثبوت رویت کے واسطے شہادت یا خبر عدل یا طریق موجب یا خبر مستفیض ضروری ہے یعنی یہ کہ مقام رویت ہلال سے اعتبار حکم رویت ہلال کے بعد جماعات متعددہ آکر یہ کہے کہ فلاں شہر میں چاند دیکھ کر لوگوں نے روزہ رکھا ہے یا عید منائی ہے اور اشیائے مذکورہ پر اعتماد کرنا مندرجہ بالا ذریعہ ثبوت کے منافی۔ لہٰذا ان چیزوں پر اعتماد کر کے روزہ توڑنا یا عید الفطر یا عید الاضحیٰ منانا جائز نہیں"۔ (حبیب الفتاویٰ کتاب الصوم، ج:۱، ص:۶۲۳، شبیر برادرز، لاہور)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی محمد یونس نظامی کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مولوی حکیم محمد یونس صاحب نظامی، الہ آبادی لکھتے ہیں:

" ریڈیو، فون، ٹیلیگراف، وائرلیس، اخبار کی خبریں عند الشرع قابلِ قبول نہیں۔ پس ذرائع مذکورہ سے آئی ہوئی خبروں پر روزہ کھولنا یا نمازِ عیدین پڑھنے کا فتویٰ دینا اصولِ دیانتِ شرعیہ کے خلاف ہے۔ خادم الاسلام والمسلمین، محمد یونس نظامی، غفرلہ"۔ (عید کا چاند، ص:۹۲، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ حضور حافظ ملت کی تشریحات کی روشنی میں

استاذ العلما، جلالۃ العلم، حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی قدس سرہ [م ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء] نے ٹیلیفون وغیرہ کو بے اعتبار فرمایا، جو لوگ ان جدید آلات مواصلات کا اعتبار کرتے ہیں ان سے سخت حیرت ظاہر فرمائی اور ایسوں کو کچہریوں کے معاملات سے بھی احکام الٰہی کو ہلکا جاننے والا فرمایا لہٰذا آپ تحریر فرماتے ہیں:

" عید کے چاند کا ثبوت شرعی شہادت سے ہوتا ہے اور شہادت کے لیے تار، فون، ریڈیو وغیرہ ہرگز معتبر نہیں، لہٰذا تار، فون، ریڈیو وغیرہ سے اس چاند کا ثبوت ہرگز نہیں ہوسکتا، دنیاوی معاملات میں بھی جہاں شہادت ضروری ہے فون وغیرہ کا اعتبار نہیں بلکہ شاہد کا برسر اجلاس حاضر ہو کر شہادت دینا ضروری ہے۔ ان بزرگوں پر سخت حیرت ہے کہ ماہ رمضان و عید وغیرہ کہ اہم فرائض کے ثبوت کے لیے تار، فون، ریڈیو وغیرہ کا اعتبار کرتے اور ان خبروں کی بنا پر مسلمانوں کے روزے توڑواتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک احکام الٰہی کا وزن کچہریوں کے معاملات سے بھی کم ہے مولا تعالیٰ ہدایت دے۔ واللہ اعلم۔

کتبہ عبد العزیز، صدر المدرسین دار العلوم اشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔
الجواب صحیح واللہ تعالیٰ اعلم عبد المصطفیٰ اعظمی خادم الطلبہ دار العلوم اشرفیہ
الجواب صحیح غلام جیلانی اعظمی مدرس دار العلوم اشرفیہ
الجواب صحیح واللہ تعالیٰ اعلم، محمد یحییٰ دار العلوم اشرفیہ
صح الجواب بعون الملک الوہاب احقر علی احمد خادم دار العلوم اشرفیہ
جواب صحیح ہے، مظفر حسین، مدرس مدرسہ اشرفیہ"
(عید کا چاند، ص:۸۵، ۸۶، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

آپ کے مجموعۂ فتاویٰ میں ہے:

" تار، ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر لائقِ اعتبار نہیں"۔ (فتاویٰ جامعہ اشرفیہ، ج:۱، ص:۳۲۸، مجلس فقہی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ)

آئندہ صفحات میں بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ کے ایک فتوے پر بھی تصدیق ہے جس میں بحر العلوم نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ٹیلیفون کی خبر کو استفاضہ نہیں کہا جا سکتا۔

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی اعظم پاکستان کی تشریحات کی روشنی میں:

مفتی اعظم پاکستان استاذ الاکابر ابو البرکات سید احمد صاحب قادری لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء] تحریر فرماتے ہیں:

”چاند اخبار، ٹیلیفون، ریڈیو، خطوط اور افواہ بازار کا دربار رویت ہلال اصلاً اعتبار نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم

فقیر قادری ابو البرکات سید احمد غفرلہ

ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف، لاہور“

(عید کا چاند، ص: ۳۷، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی نذیر الاکرم نعیمی کی تشریحات کی روشنی میں:

مولانا مولوی حکیم نذیر الاکرم صاحب نعیمی، مراد آبادی قدس سرہ [م ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۰ء] تحریر فرماتے ہیں:

”ریڈیو، ٹیلی فون، تار، وائرلیس، اخبار یہ تمام چیزیں امورِ شرعیہ میں باطل و نامعتبر ہیں اور ان پر استفاضہ خبر کی تعریف صادق نہیں آتی علاوہ بریں یہ کہ دنیوی کچہریوں میں بھی جہاں فاسق، فاجر، مستور الحال تک کی شہادت مان لی جاتی ہے، وہاں بھی ریڈیو، ٹیلی فون، تار، وائرلیس، اخبار وغیرہ کی شہادت نہیں مانی جاتی تو امور دینیہ شرعیہ میں جہاں شاہد کا عادل اور ثقہ ہونا ضروری ہے یہ ذرائع کیوں کر معتبر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ وہو اعلم بالصواب

کتبہ محمد نذیر الاکرم نعیمی، مراد آبادی، عفی عنہ

الجواب صحیح محمد حبیب اللہ، غفرلہ نعیمی، استاذ جامعہ نعیمیہ

(عید کا چاند، ص: ۸۷، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مصنف ”قانون شریعت“ کی تشریحات کی روشنی میں:

شمس العلما ابو المعالی علامہ قاضی مفتی شمس الدین احمد جعفری رضوی جون پوری علیہ الرحمہ [م ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۰] تحریر فرماتے ہیں:

”تار، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹرنک کال سے چاند دیکھنا ثابت نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اگر انہیں ہر طرح صحیح مان بھی لیا جائے جب بھی یہ محض ایک خبر ہے شہادت نہیں اور محض ایک خبر سے چاند کا ثبوت نہیں ہوتا اور اسی طرح بازاری افواہ سے اور جنتریوں اور اخباروں میں چھپنے سے بھی چاند ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ عالمگیری میں ہے:

ان كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة اذا كان عدلا، مسلماً، عاقلا، بالغا، حرا كان أو عبدا، ذكرا كان أو انثى۔

یعنی اگر مطلع صاف نہ ہو تو ہلال رمضان کے لئے ایک عادل، عاقل، بالغ مسلمان کی شہادت مقبول ہے اور اسی بحث میں آگے عید کے چاند کے بارے میں ہے کہ مطلع صاف نہ ہو تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں تب چاند ہونا مانا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الفقیر شمس الدین امجدی رضوی جونپوری

جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس“

(آلات جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال، ص: ۲۲، انجمن تعمیر ملت، سہسرام)

دوسرے مقام پر یوں تحریر فرماتے ہیں:

”ایک جگہ چاند ہوا تو وہ صرف وہیں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے، مگر دوسری جگہ کے لیے اس کا حکم اس وقت ہے جب چاند کا ہونا شرعی ثبوت سے ثابت ہو جائے اور تار، ٹیلی فون، ریڈیو سے چاند دیکھنا ثابت نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ یہ محض ایک خبر ہے، شہادت نہیں، اور محض ایک خبر سے چاند کا ثبوت نہیں ہوتا“۔

کتبہ الفقیر ابو المعالی احمد المعروف بہ شمس الدین الجعفری الرضوی

صدر المدرسین مدرسہ منظر حق ٹانڈہ ضلع فیض آباد

(عید کا چاند، ص: ۹۰، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی اعظم ہند کی تشریحات کی روشنی میں:

تاج دار اہل سنت مفتی اعظم ہند علامہ مصطفیٰ رضا خاں علیہ الرحمہ [م ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء] کا بھی صاف اور صریح موقف یہی ہے کہ ٹیلیفون کی خبر کا اعتبار نہیں اس کی خبر پر شرعی احکام کی بنا نہیں رکھی جاسکتی جیسا کہ رضوی دار الافتا سے جاری ہونے والے درج ذیل فتوے پر حضرت کی تحقیق سے صراحت کے ساتھ مفہوم ہوتا ہے:

"دربارۂ ہلال، ریڈیو، تار، ٹیلیفون، ٹرنک کال، خط اور افواہی خبروں کا اعتبار نہیں محض ان کی خبر پر احکام شرع کی بنا درست نہیں جب تک کہ شرعی شہادت نہ گذرے۔ شہادت شرعی یہ ہے کہ دو مرد عادل متقی یا ایک مرد اور دو عورتیں ثقہ جن کے متعلق جھوٹ کا گمان نہ ہو وہ آ کر شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آج ۲۹ رمضان یا شوال کا چاند دیکھا ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"بشهادة رجلين أو رجل و امرأتين"

ریڈیو، ٹرنک کال وغیرہ کی خبریں اگرچہ کسی معتبر شخص یا ادارے کی ہو شہادت شرعی نہیں کہ آڑ سے جو آواز مسموع ہو اس پر احکام شرع کی بنا نہیں ہوسکتی کہ آواز آواز سے مشابہ ہوتی ہے، تبیین الحقائق اور فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

"لو سمع من وراء الحجاب لا يسعه أن يشهد لاحتمال ان يكون غيره اذ النعمة تشبه النعمة"۔

پھر یہ کہ ٹرنک کال وغیرہ پر ایک ہی شخص بولتا ہے اگر وہ سامنے بھی ہو ثقہ و عادل ہو اور خبر نہیں شہادت ادا کرے جب بھی وہ شہادت شرعی نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح واللہ اعلم

فقیر مصطفے رضا خاں رضوی دار الافتا، بریلی شریف (مہر)

(آلات جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال، ص:۲۱، انجمن تعمیر ملت، سہسرام)

ٹیلیفونی استفاضہ بحر العلوم مونگیری کی تشریحات کی روشنی میں:

بحر العلوم علامہ مفتی سید افضل حسین حسینی مونگیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء] تحریر فرماتے ہیں:

شریعتِ طاہرہ نے دربارِ ثبوتِ ہلال دوسرے شہر کی خبر کو شہادتِ شرعیہ یا استفاضۂ شرعیہ پر معلق فرمایا ہے، عبارات درمختار جلد دوم، صفحہ ۹۹ و فتح القدیر، صفحہ ۲۴۳ و فتاوٰی عالمگیری، صفحہ ۲۱۱، ان عبارات سے ثابت و روشن ہے کہ دربارہ ثبوت ہلال دوسرے شہر کی خبریں ریڈیو، ٹیلی فون، تار، خطوط، اخبار وغیرہ سے سب بیکار ہیں، جنہوں نے ریڈیو وغیرہ کی خبروں پر اعتماد کرکے افطار کیا، عید کی، وہ سب گنہگار ہوئے، مانا کہ وہ دن واقع میں عید کا ہی صحیح، لیکن جب انہوں نے افطار کیا تھا، عید کی تھی، اس وقت تک تو وہاں اس دن کا روز عید ہونا دلیلِ شرعی سے ثابت نہ ہوا تھا، تو ان کے حق میں رمضان کا مہینہ باقی تھا، ہدایہ وغیرہا میں ہے: "لأن الأصل بقاء الشهرِ فلا ينتقل عنه إلّا بدليل" اور رمضان میں کھانا پینا بے حکم شرع حرام۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ محمد افضل حسین، مفتی دار العلوم مظہرِ اسلام، بریلی

(عید کا چاند، ص:۸۶، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ حضور برہان ملت کی تشریحات کی روشنی میں:

خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبد الباقی شاہ مفتی برہان الحق جبل پوری جبل پوری علیہ الرحمہ [م ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء] نے تار، ٹیلیفون، ریڈیو کی بے تکی خبروں پر شرعاً عمل ناجائز فرمایا اور ایسی خبروں پر عمل کر کے ۲۹ رکو روزہ ختم کرنا جائز نہیں اگر کوئی روزہ رکھ کر توڑ دے تو اس پر اس روزے کی قضا اور کفارہ واجب قرار دیا ہے:

"ریڈیو، تار، ٹیلیفون، اخبار کو دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی قانون شہادت نہیں کہتا، عام محاورہ ہے ریڈیو کی خبر ہے، ٹیلیفون پر خبر آئی، تار سے خبر ملی، اخبار میں خبر ہے لیکن ان ذرائع سے حاصل شدہ خبروں کو شہادت کبھی نہیں کہا گیا۔ خبر میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے اور جہاں سچ اور جھوٹ دونوں کا امکان ہو وہاں یقین نہیں حاصل ہوسکتا اور رویت کا دارمدار یقین پر ہے اس لیے شارع نے شہادت کو بمنزلہ یقین قرار دیا ہے کوئی شخص کسی مقدمہ میں تار یا ٹیلیفون یا آل انڈیا ریڈیو

کے ذریعہ شہادت دینا چاہے دنیا کی کوئی عدالت اس شہادت کو تسلیم نہیں کرے گی بنا بر تصریحات مذکورہ پاکستان ریڈیو ہو یا ہندوستان کسی بھی ریڈیو کی خبر سے شرعاً چاند کی تصدیق نہیں ہوتی تصدیق کے لیے صریح رویت یا شہادت شرط ہے اسی لیے تار، ٹیلیفون، ریڈیو کی بے تکی خبروں پر شرعاً عمل جائز نہیں نہ ایسی خبروں پر عمل کر کے ۲۹ ر کو روزہ ختم کرنا جائز، اگر روزہ رکھ کر توڑ دیا اس روزے کی قضا اور کفارہ واجب ہے جتنے لوگ ریڈیو وغیرہ کی خبروں پر عید کریں گے وہ سب گنہ گار ہوں گے اور سب پر روزے کی قضا واجب ہوگی۔ واللہ اعلم۔

کتبہ الفقیر عبدالباقی محمد برہان الحق القادري الرضوی الجبلپو رغفرلہ

(عید کا چاند، ص: ۸۲، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ قاضی عبد الشکور کاٹھیاواڑی کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا قاضی محمد عبدالشکور قادری گونڈل کاٹھیاواڑ تحریر فرماتے ہیں:

”حامداً او مصلیاً و مسلماً، الجواب بعون الملک الوہاب: مسئولہ صورتوں میں سے کوئی صورت ثبوتِ رؤیت کے لیے کافی نہیں، بلکہ مفتیِ اعظم قبلہ، فرزندِ ارجمند اعلیٰ حضرت قبلہ قدس سرہٗ العزیز نے خط کو بھی ناکافی تحریر فرمایا ہے، جب تک کتابُ القاضی الی القاضی کے شرائط نہ پائے جائیں۔ بحوالۂ فتاویٰ رضویہ، کتابُ الصوم، مبیضہ، صفحہ ۲۶۰۔ تو جب تک ثبوتِ شرعی نہ ہو، کسی طرح رؤیتِ ہلال کے لیے مثبت نہ ہوگا۔ واللہ ورسولہٗ اعلم بالصواب۔

کتبہ الفقیر الحقیر قاضی عبدالشکور میاں قادری برکاتی غفرلہ

الجواب صحیح کتبہٗ أحوج الناس الی الرحمن الفقیر الحقیر احمد میاں قادری غفرلہ الرحمن، ساکن دھوراجی

(عید کا چاند، ص: ۹۴، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ محدث امروہوی کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مفتی مبین الدین محدث امروہوی قدس سرہ م[۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء] تحریر فرماتے ہیں:

”یہ موصولہ چیزیں صرف خبروں کے لیے بکارآمد ہیں اور یہی کام انجام دیتی ہیں۔ شہادت کے لیے نہ ان کی وضع ہے اور نہ ان میں شہادت کی صلاحیت ہے، اس لیے عبادات اور معاملات میں کوئی بھی تعمیر ان پر نہیں کی جاسکتی ہے، چاہے وہ شرعی ہوں یا شہری۔ چونکہ یہ ناحق ہیں اور ہر حق میں ثبوت کے لیے کم از کم اتنے شاہد عینی کا ہونا ضروری ہے کہ جن میں پھوٹ کا احتمال نہ ہوتا کہ وہ جھوٹ پر متفق نہ ہو سکیں۔ خادمُ العلم والعمل محمد مبین الدین صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ رانچی

(عید کا چاند، ص: ۹۳، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مولانا ارشاد حسین کی تشریحات کی روشنی میں

خانقاہ سجادیہ شیش گڑھ بریلی شریف کے مولانا شاہ ارشاد حسین تحریر فرماتے ہیں:

”امام علاؤالدین حصکفی حنفی فرماتے ہیں:

وفی الاشباہ لا یعمل بالخط (درمختار)

شریعت مطہرہ نے خط جیسی چیز کو جس میں دستخط ہوتے ہیں، مہر بھی ہوتی ہے ناقابل عمل قرار دیا، تو ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار پر شرعاً عمل کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ یہ ذرائع شرعاً محض باطل و نامعتبر ہیں، ان ذرائع سے ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی، نہ بازاری افواہ اور جنتریوں وغیرہ میں چھپا ہونا کوئی ثبوت ہے، اس لیے ذرائع مذکورہ سے آئی ہوئی خبروں پر عمل کر کے روزہ رکھنا، افطار کرنا، نماز عیدین پڑھنا شرعاً ہرگز جائز نہیں۔ واللہ اعلم

کتبہ الفقیر محمد ارشاد حسین جعفری اشرفی نعیمی غفرلہ

سجادہ نشین خانقاہ سجادیہ، شیش گڑھ“

(عید کا چاند، ص: ۸۴، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی اعظم کان پور کی تشریحات کی روشنی میں

مفتی اعظم کان پور علامہ مفتی رفاقت حسین کان پوری قدس

سرہ [م ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء] تحریر فرماتے ہیں:

”ریڈیو، فون، تار، وائرلیس، اخبار یہ سب شہادتِ شرعیہ کے ذرائع نہیں، ان ذرائع سے جو خبر موصول ہو اس کی بنا پر کوئی حکمِ شرعی نہیں لگایا جا سکتا۔ ان تمام ذرائع میں خط زیادہ قوی ہوسکتا ہے مگر شریعتِ مطہرہ نے اس کا بھی اعتبار نہیں کیا۔ افطار اور قربانی کے لیے شہادت کی ضرورت ہے، افواہ، بے بنیاد خبروں پر شرعی احکام نہیں لگائے جاسکتے۔ واللہ اعلم

فقیر رفاقت حسین غفرلہ
احسن المدارس، قدیم، کان پور
الجوابُ صحیح، فقیر محمد محبوب اشرفی غفرلہ، احسن المدارس جدید، کان پور
محمد رجب علی القادری الرضوی، خطیب مسجد بانس منڈی، کان پور
(عید کا چاند، ص: ۹۱، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی مجیب اللہ بھاگل پوری کی تشریحات کی روشنی میں

حضرت مولانا مولوی محمد مجیب اللہ بھاگل پوری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

”ریڈیو، ٹیلیفون، تار، وائرلیس، اخبار کسی قانون کی نگاہ میں شہادت کا درجہ نہیں رکھتے تو مسائل دینیہ روزہ رکھنے، روزہ کھولنے، نماز عیدین ادا کرنے کا ان چیزوں کی وجہ سے حکم دینا شرعاً ہرگز جائز نہیں۔ اس جگہ ایک شبہہ ہوسکتا ہے کہ ریڈیو کی آواز نہ تو خبر ہے کہ مسترد کر دی جائے اور نہ شہادت ہے جو خلاف قانون قرار دی جائے بلکہ ایک اعلان ہے جیسے پرانے زمانے میں نقارہ بجا دیا جاتا، توپ داغی جاتی، چراغاں کر دیا جاتا تو سننے والے دیکھنے والے سمجھ جاتے کہ چاند ہوا اور فقہائے کرام نے اس کو جائز رکھا، اسی طرح ہمارے زمانہ سائنسی دور میں ان چیزوں سے بہتر ریڈیو موجود ہے تو اس کا اعلان بھی اسی طرح حجت ہونا چاہیے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اعلان قاضی خواہ کسی طرح پر ہو، اپنے حدودِ قضا سے متجاوز نہیں ہوسکتا۔ عامہ فقہائے کرام قاضی کو اس کے حدود سے باہر صرف گواہ کا درجہ دیتے ہیں۔ جس کو ماننا نہ ماننا اس قاضی کی مرضی پر ہے، جہاں وہ گواہی دینے جائے۔ اگر ریڈیو سے دہلی اور جوارِ دہلی کے لیے دہلی کا قاضی یا اس کا وکیل اعلان کرے تو کرسکتا ہے لیکن اس کے حدود کے باہر لکھنؤ، پٹنہ، مونگیر، کلکتہ کے لیے اس کا اعلان بالکل بے اثر ہے۔ جس طرح بغیر استعمالِ آلہ اگر بذاتِ خود حدود سے باہر آکر کہے تو وہ محض ایک گواہ ہے۔ اگر نصاب شہادتِ واقعہ کا میسر نہ ہوا ہو تو اس کی گواہی نہ سنی جائے گی۔

اسی طرح ریڈیو سے اس کا اعلان بھی حدود سے باہر معتبر نہ ہوگا۔ یہ وہ منزلۃ الاقدم ہے جہاں نیچری اور قلتِ تدبر کی وجہ سے لوگ پھسلتے ہیں۔ اللہ اعلم

مجیب اللہ قادری، صدر مدرس اگر پور، بھاگلپور
قد اصاب المجیب، محمد ساجد اللہ
خطیب جامعہ مسجد تا تار پور، بھاگلپور
صحّ الجواب واللہُ اعلم بالصواب، محمد عزیز الدین اشرفی، ابراہیم پور، ڈاکخانہ سبور، ضلع بھاگلپور
الجواب صحیح، شاہد حسن عفی عنہ
مقام راجپور، ڈاکخانہ سبور، ضلع بھاگلپور
الجواب صحیح، محمد ایوب اشرفی عفی عنہ، اگر پور، ڈاکخانہ سبور، ضلع بھاگلپور
صحّ الجواب، محمد عبد الرشید قادری، صدر مدرس، مدرسہ انوار العلوم، سر بیلہ، مونگیر
صح الجواب، محمد عبد القدوس، مدرس دوم، مدرسہ انوار العلوم، سر بیلہ، سلکھو ابازار، مونگیر
(عید کا چاند، ص: ۹۴، ۹۵، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی فضل کریم رضوی مظفر پوری کی تشریحات کی روشنی میں:

خلیفۂ حجۃ الاسلام استاذ العلما مفتی قاضی محمد فضل کریم رضوی حامدی قدس سرہ [م ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء] تحریر فرماتے ہیں:

”رویت ہلال کے سلسلہ میں ائمہ عظام وفقہائے کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ خبر رسانی کے موجودہ آلات جیسے ریڈیو، ٹیلی گرام، ٹیلی فون کے ذریعہ رویت ہلال کی خبریں نا قابل اعتماد ہیں، نیز جنتری، کلینڈر، اخبار وغیرہ میں لکھی ہوئی تاریخوں پر بھی عمل کرنا شرعا جائز و درست نہیں، مذکورہ بالا ذرائع سے، جو خبریں نشر کی جاتی ہیں، ان خبروں پر نہ روزہ رکھا جاسکتا ہے اور نہ عیدین کی نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں، آلات

مذکورہ سے جوخبریں نشر کی جاسکتی ہیں وہ شہادت نہیں بلکہ خبر محض ہیں اور ثبوت رویت ہلال کے لئے شرعی شہادت یا شہادت علی الشہادۃ ضروری ہے نہ کہ خبر۔ (فتاوی شرعیہ، ج:۱، ص:۴۰۰، شبیر برادرز، لاہور)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی عطاء الرحمن نوری مظفر پوری کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مولوی حکیم محمد عطاء الرحمن صاحب نوری مظفر پوری ["الصوارم الہندیہ" پر آپ کی تائید وتصدیق، موجود ہے] تحریر فرماتے ہیں:

ایک جگہ چاند ہونے کی محض خبر سے دوسری جگہ نمازِ عید پڑھنی یا قربانی کرنی کسی حال میں جائز نہیں کہ خبر میں احتمالِ صدق و کذب مساوی ہے۔ نمازِ عیدین اور قربانی کے لیے رؤیتِ ہلال کا ثبوت بطریقِ موجب لازم ہے۔ ریڈیو، تار، وائرلیس وغیرہ ذرائعِ خبر رسانی صدق وکذب کے محتمل اور شریعت کا حکم احتمال نہیں ہوتا۔ حاشا کہ ان کی خبریں رؤیتِ ہلال کے لیے کافی ہوں۔ ریڈیو، تار، وائرلیس کی خبر پر نمازِ عیدین یا قربانی کا حکم دینا یا کرنا ہرگز جائز نہیں۔ واللہ اعلم

فقیر عطاء الرحمن غفرلہ، ناظم مدرسہ نور الہدی، پوکھریرا، رائے پور، مظفر پور
جواب صحیح ہے، محمد مطیع الرحمن نوری، مدرس اول مدرسہ نور الہدی، پوکھریرا، رائے پور
(عید کا چاند، ص:۹۳، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ خطیب مشرق کی تشریحات کی روشنی میں

خطیبِ مشرق پاسبان ملت علامہ مشتاق احمد نظامی الہ آبادی قدس سرہ [۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء] تحریر فرماتے ہیں:

"علمائے بریلی نے تار، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کو رویتِ ہلال وغیرہ کے لیے نا قابلِ اعتبار تصور کیا ہے اور اپنا بھی یہی مسلک ہے"۔
مشتاق احمد نظامی، دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد"
(عید کا چاند، ص:۹۲، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ بدرالعلما کی تشریحات کی روشنی میں

بدر العلما حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ [م ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء] ایک فتوے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"ریڈیو، ٹیلی فون، تار اور خط کی خبروں سے رویت ہلال کا شرعی ثبوت نہ ہوگا۔ لہٰذا جو لوگ ریڈیو، ٹیلی فون، تار وغیرہ کی بنیاد پر اپنا روزہ برباد کر کے عید مناتے ہیں وہ شرعاً گنہ گار ہیں ان پر توبہ فرض ہے"
(فتاویٰ بدر العلما، باب رویۃ الہلال، ص:۱۸۲، رضا اکیڈمی، ممبئ)

ٹیلیفونی استفاضہ بلبل ہند کی تشریحات کی روشنی میں:

بلبل ہند علامہ مفتی رجب علی قادری نانپاروی بہرائچی قدس سرہ [م ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء] بہرائچ شریف، تحریر فرماتے ہیں:

"مشرق کی رویت مغرب کے لیے حجت و قابلِ عمل ہے جبکہ طرقِ شرعیہ سے ثابت ہو، مجرد اخبار یا افواہِ بازار ہرگز ہرگز اس بارے میں معتبر نہیں۔ اسی طرح ریڈیو، فون، تار، وائرلیس وغیرہ ذرائع سے بھی رؤیت کی شہادت نہیں ہوسکتی۔ ایسے نا قابلِ اعتماد ذرائع سے رویت پر افطار و قربانی کا حکم دینا غلط و ناجائز و خطا فی الافتا ہے۔ والمسائل کلها مع الأدلة و تفاصيلها فی الکتب الفقهية المسلمة مسطورة۔ واللہ اعلم

الاحقر رجب علی غفرلہ"
(عید کا چاند، ص:۹۳، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ علمائے خانقاہ پٹنہ بہادر شاہ ارزاں وغیرہ کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا مولوی سید شاہ محمد عاشق حسین قدس سرہ [م ۱۴۲۲ھ] خانقاہ بہادر شاہ ارزاں، پٹنہ، تحریر فرماتے ہیں:

"تار، ریڈیو، اخبارات، خطوط وغیرہ کے ذریعے جو خبریں مشتہر ہوتی ہیں وہ صرف خبر ہی ہوتی ہیں اور خبر محض کا اعتبار نہیں علاوہ ازیں اس کے ذرائع و وسائط اکثر نا قابل اعتبار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے ذریعے شرعا رویت ہلال کا ثبوت نہیں ہوسکتا ہے (عبارت ہدایہ) اس سے معلوم ہوا کہ خطوط رویت کے لیے قطعا نہ کافی ہیں، تو پھر وہ ذرائع

جو خطوں سے بھی زیادہ نا قابل توجہ اور کمتر وادون ہیں ان پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ علاوہ ازیں دنیاوی معاملات کے سلسلے میں بھی ریڈیو، ٹیلی گرام وغیرہ کی خبریں کچھ وقعت نہیں رکھتیں اور نہ ان آلات کے ذریعے آئی ہوئی شہادت پر کوئی حاکم یا منصف دنیاوی معاملات مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے بلکہ ایسی خبریں قطعا لغو اور نا قابل اعتماد سمجھی جاتی ہیں تو پھر دینی معاملات میں اس قسم کی خبروں کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے۔ واللہ تعالی عالم وعلمہ اتم واحکم

حررہ السید الشاہ عاشق حسین القادری درگاہ شاہ ارزاں، پٹنہ

لقد اصاب من اجاب ومن انکر فقد خسرو خاب بلا شك وارتیاب وھو اعلم بالصدق والصواب و عندہ حسن الثواب والیه المرجع و المآب عبدہ الاثیم المحتاج الی المولی العلیم محمد فضل کریم غفرله الرحیم القادری المظفرپوری

صح الجواب ہو اعلم بالصواب احقر عبد الودود شمس صدیقی مظفر پوری"

(عید کا چاند، ص: ۸۴، ۸۵، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی محمد نذیر اشرفی ٹانڈوی کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا، مولوی، مفتی، حافظ محمد نذیر صاحب اشرفی ٹانڈوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

رؤیتِ ہلال کا ثبوت شہادتِ رؤیت یا شہادت علی الشہادۃ یا شہادت علیٰ حکمِ القاضی ہی سے ہوسکتا ہے۔ ریڈیو، تار، ٹیلی فون، ٹرنک کال کی خبر شہادت نہیں، محض خبر ہے جو شہادت کے لیے صفر ہے۔ اگر بجائے خبر کے اعلان کہیے تو اعلان بھی شہادت نہیں جو دوسری جگہوں کے لیے ثبوت ہو سکے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

محمد نذیر اشرفی، مفتی دار العلوم منظر حق، فیض آباد

(عید کا چاند، ص: ۹۰، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی عبد المنان گیاوی کی تشریحات کی روشنی میں

"تار، خطوط، جرائد، ٹیلیفون وغیرہ کی آئی ہوئی خبروں کا امور شرعیہ میں کوئی اعتبار نہیں اور نہ ان ذرائع سے شرعی طور پر ثبوت ہلال ہوگا کیونکہ رویت کا شرعی ثبوت دوسرے شہر اور بستیوں کے رہنے والوں کے لیے تین ہی طریقوں سے ہوتا ہے اور ان تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ میں بھی تار خطوط وغیرہ داخل نہیں ہیں رہا یہ کہ خط وغیرہ کا امور شرعیہ میں کیوں اعتبار نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط میں دوسرے کے نام سے بنا لینے اور گڑھ لینے کا احتمال ہے عینی شرح کنز میں ہے:

"الخط یشبه الخط فلا یلزم حجة لانه یحتمل التزویر"

اس لیے جب خطوط کا اعتبار نہیں کیا گیا تو تار وغیرہ کس شمار میں ہیں ظاہر ہے کہ ان کے ذریعہ سے جو خبریں آئیں خط کی طرح غیر معتبر عند الشرع ہیں اور ان سے کوئی حکم شرعی ثابت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ ابو سلمان الشاہ محمد عبد المنان الچشتی القادری غفر لہ الباری المدرس الاول بالمدرستہ المحمدیہ فی عظیم آباد"

(عید کا چاند، ص: ۴۷، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مولانا سید شاہ محمد قاسم رحمانی کی تشریحات کی روشنی میں:

مولانا سید شاہ محمد قاسم رحمانی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

بحکم حدیث شریف: "صوموالرویت وافطروالرویت"۔ روزہ رکھنا اور روزہ کھولنا چاند ہونے کے بعد ہونا چاہیے اور چاند ہونا رویت سے ثابت ہوگا یا شہادت سے اور ہر عقل و دین والا جانتا ہے کہ تار، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹرنک کال وغیرہ یہ چیزیں خبر کے لیے موضوع ہیں دنیاوی کچہریوں میں بھی شہادت کے موقع پر کبھی مستعمل نہ ہوئیں پھر دینی امور میں جہاں شہادت کی شرطیں اور سخت ہیں کیوں کر معتبر ہوسکتی ہیں؟ اس لیے روزہ رکھنے، روزہ کھولنے، عید کرنے کا حکم دینا ٹیلی فون اور ٹرنک کال کی خبروں پر غلط اور خلاف شریعت مطہرہ ہے واللہ اعلم

حررہ الفقیر سید محمد قاسم رحمانی غفرلہ
ریٹائرڈ سینئر مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
(عید کا چاند، ص: ۸۴، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی کی تشریحات کی روشنی میں

شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ [م ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء] تحریر فرماتے ہیں:

"مولیٰ عز وجل ان علما پر رحم فرمائے اور انہیں قبول حق اور استقامت علی الحق پر ہمت اور توفیق عطا فرمائے، رویت ہلال کے سلسلہ میں ٹیلیفون اور فیکس کی اطلاع کالعدم اور بالکلیہ غیر معتبر ہے۔ اولاً یہ خبر مستفیض ہرگز ہرگز کسی قیمت پر نہیں"۔ (فتاویٰ جامعہ اشرفیہ، ج: ۵، ص: ۳۰۴، مجلس برکات، مبارک پور)

اسی میں ہے:

"ٹیلیفون اگرچہ ایک ہی شہر سے ہزاروں آئیں، فیکس اگرچہ ایک ہی شہر سے ہزاروں آئیں کالعدم، اس پر اعتماد کر کے جو لوگ تیس رمضان کو روزہ نہ رکھیں یا رکھ کر توڑ دیں اور نماز عید پڑھ لیں وہ ایک نہیں چار گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

(۱) شرعاً غیر معتبر بات کو شرعی دلیل اعتقاد کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔ (۲) تیس رمضان کا روزہ فرض تھا اسے چھوڑا یا رکھ کر توڑا۔ (۳) اس دن نماز عید کا وقت نہیں تھا پھر بھی بنام نماز عید نماز پڑھی، یہ نفل ہوئی اور تداعی کے ساتھ ہوئی جس طرح نماز عید پڑھی جاتی ہے اس طرح کوئی نماز نفل مشروع نہیں ۔ یہ اشتغال بمالایصح ہوا جسے عبادت گمان کیا۔ (۴) دوسرے دن نماز عید واجب تھی، اس گمان پر کہ نماز عید پڑھ لی ہے، نماز عید نہیں پڑھی، یہ واجب کا ترک ہوا۔ جن جن لوگوں نے ٹیلیفون یا فیکس پر اعتماد کر کے اس پر عمل کیا ان سب لوگوں پر یہ چار گناہ ہوئے اور سب کے برابر اعلان کرنے والے پر۔ ان سب لوگوں پر توبہ فرض ہے اور آئندہ احتیاط لازم ۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (فتاویٰ جامعہ اشرفیہ، ج: ۵، ص: ۳۰۶، ۳۰۷، مجلس برکات، مبارک پور)

اسی میں ہے:

"ٹیلیفون سے استفاضہ نہیں ہوگا یہ بالکل ظاہر ہے"۔ (فتاویٰ جامعہ اشرفیہ، ج: ۵، ص: ۳۱۱، مجلس برکات، مبارک پور)

اسی میں ہے:

"روزمرہ کے معاملات میں خبر کا معتبر ہونا اور بات ہے اور دینی معاملات میں کسی خبر کا معتبر ہونا یا نہ ہونا اور بات ہے۔ کسی کے انتقال کی خبر یہ دنیوی معاملہ ہے اور رمضان کب شروع ہوگا، کب ختم ہوگا، کب سے روزہ رکھا جائے، کب عید کی نماز پڑھی جائے، یہ خالص دینی معاملہ ہے۔ دینی معاملے میں ہر مسلمان شریعت کا پابند ہے۔ شریعت نے جس دینی معاملے کو جس طرح ثابت مانا ہے اسی طرح ہم ثابت ماننے کے پابند ہیں اور جس طریقے کو شریعت نے غیر معتبر مانا ہے اسے غیر معتبر ماننا واجب۔ اس میں اپنی ٹانگ اڑانا شریعت کی مخالفت کرنا اور نئی شریعت بنانا ہے۔ رویت ہلال سے چوں کہ ایک فرض متعلق ہے اس لیے یہ خالص شرعی معاملہ ہے۔ شریعت نے اس کے ثبوت کے طریقے مقرر فرما دیے ہیں جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں"۔ (فتاوی جامعہ اشرفیہ، ج: ۵، ص: ۳۴۵، مجلس برکات، مبارک پور)

ماہنامہ پاسبان میں ہے کہ آپ سے ایک استفتا کی گیا:

"ملک میں اکثر ابر چھایا ہوا رہتا ہے لہٰذا چاند دکھائی دینا مشکل ہو جاتا ہے یا مطلع صاف تھا مگر چاند نہیں دکھائی دیا، ایسی صورت حال میں اطراف سے آئی ہوئی، تار ٹیلیفون، ریڈیو کی خبروں پر رمضان شریف کے روزے رکھنا اور عید منانا جائز ہے یا نہیں؟"

آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"رویت ہلال کے بارے میں تار، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، ریڈیو، لاسلکی ٹرانسمیٹر وغیرہ کی خبریں بالکلیہ ناکافی اور غیر معتبر، خواہ مطلع صاف ہو، خواہ ابر یا غبار آلود، خواہ رمضان کا چاند ہو، خواہ عیدین وغیرہ کا۔ اس لئے کہ ایک غیر شرعی معاملہ ہے"۔ (ماہ نامہ پاسبان الہ آباد، باب الاستفتا، ص: ۲۰، اپریل ۱۹۷۳ء)

ٹیلیفونی استفاضہ علمائے خانقاہ شہبازیہ بھاگل پور کی تشریحات کی روشنی میں

علامہ مفتی سید شاہ صفی العالم قدس سرہ خانقاہ شہبازیہ بھاگل پور تحریر فرماتے ہیں:

"رویت ہلال کے متعلق ریڈیو، تار، ٹیلیفون کی شہادت قابل اعتبار نہیں، جب دنیاوی قانون کچہریوں میں ان سب ذرائع کی شہادتیں قابل قبول نہیں ہوتیں تو پھر شرعی معاملات میں انہیں شہادت کا درجہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ قاضی و امام کا فیصلہ بھی صرف اسی علاقہ کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے جس علاقہ کا قاضی و امام اس کے متعلق اعلان کرے لہٰذا شرعی شہادت کے بغیر افطار و نماز عید صحیح نہیں۔

فقط شاہ محمد صفی العام

سجادہ نشیں خانقاہ شہبازی، ملا چک، بھاگلپور

الجواب صحیح سید محمد شاہ حق، نائب سجادہ نشین و امام عیدگاہ شہر بھاگلپور"۔

(عید کا چاند، ص: ۸۳، ۸۴، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ فقیہ ملت کی تشریحات کی روشنی میں:

فقیہ ملت مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ [م ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۱ء] ٹیلیفون کی خبر کے متعلق ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

"ٹیلیفون کی خبر پر ۲۹ر کا چاند ماننا ہرگز ہرگز جائز نہیں اس لیے کہ یہ نئے آلات خبر پہونچانے میں تو کام آسکتے ہیں لیکن شہادتوں میں نہیں معتبر ہوسکتے"۔ (فتاویٰ فیض الرسول، ج:۱، ص:۵۲۶، دار الاشاعت فیض الرسول، براؤں شریف)

۲۰ر شوال المکرم ۱۳۹۱ھ کو ایک فتوے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"رہے تار اور ٹیلیفون تو یہ بے اعتباری میں خط سے بڑھ کر ہیں اس لیے کہ خط میں کم از کم کاتب کے ہاتھ کی علامت ہوتی ہے، تار و ٹیلیفون میں وہ بھی مفقود، جن لوگوں نے ریڈیو اور ٹیلیفون وغیرہ کی خبروں پر عید کرلی اور ۳۰ر روزے پورے نہ کیے ان پر توبہ واستغفار اور روزے کی قضا لازم ہے اور عید کی نماز دوسرے روز پڑھنا واجب ہے، ہاں اگر بعد میں شہادت شرعیہ سے ۲۹ر کی رویت ہلال ثابت ہوجائے تو روزہ کی قضا لازم نہیں مگر توبہ واستغفار بہرصورت ضروری ہے"۔اھ، ملخصاً (فتاویٰ فیض الرسول، ج:۱، ص:۵۲۷، ۵۲۸، دار الاشاعت فیض الرسول، براؤں شریف)

ٹیلیفونی استفاضہ صدر المفتیین کی تشریحات کی روشنی میں

صدر المفتیین، استاذ الفقہا علامہ مفتی قاضی عبد الرحیم بستوی علیہ الرحمہ [م ۱۴۳۱ھ] سے سوال کیا گیا کہ ہلال رمضان و ہلال عید کا ثبوت کیا آلات جدیدہ مثلاً ٹیلیفون، فیکس، تار، ریڈیو سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ مذکورہ آلات کے ذریعے خبر کسی درجے میں معتبر ہے یا بالکل ساقط الاعتبار ہے؟

آپ نے اس کے جواب میں یوں تحریر فرمایا:

"آلات مذکورہ کے ذریعہ موصولہ خبریں رویت ہلالِ رمضان و عید وغیرہ کے ثبوت کے لیے محض باطل و مردود اور ساقط الاعتبار ہیں، جو لوگ آلات مذکورہ کی خبروں پر روزہ یا عید کریں وہ سخت گناہ گار ہوں گے، واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (فتاویٰ بریلی شریف، ص:۲۱۲، زاویہ پبلشرز، لاہور)

آپ سے سوال کیا گیا:

"ملک میں اکثر ابر چھایا ہوا رہتا ہے لہٰذا چاند دکھائی دینا مشکل ہوجاتا ہے یا مطلع صاف تھا مگر چاند نہیں دکھائی دیا، ایسی صورت حال میں اطراف سے آئی ہوئی، تار ٹیلیفون، ریڈیو کی خبروں پر رمضان شریف کے روزے رکھنا اور عید منانا جائز ہے یا نہیں؟"

آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"جائز نہیں، تار، ٹیلیفون کی خبر سے شہادت کا ثبوت نہ ہوگا"۔

(ماہ نامہ نوری کرن، باب الاستفتاء، ص:۳۱، فروری ۱۹۷۰ء)

ٹیلیفونی استفاضہ فیض ملت کی تشریحات کی روشنی میں

شیخ الحدیث والتفسیر ابو الصالح مفتی محمد فیض احمد اویسی قدس سرہ [م ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء] تحریر فرماتے ہیں:

”سوال: اگر کوئی کہے کہ متعدد مقامات سے ٹیلی فون آئے ہیں فلہٰذا اسے استفاضہ شرعی صحیح طریقہ نمبر ۵، میں داخل کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب: استفاضہ میں شرائط ذیل ضروری ہیں: استفاضہ میں چند شرائط جو ردالمختار کے حوالہ سے طریقہ نمبر ۵، میں درج کئے ہیں دوبارہ سن لیں۔

(۱) جہاں سے وہ خبریں آئیں وہ شہر اسلامی ہو کہ احکام اسلامی کی پابندی ہوتی ہو۔

(۲) وہاں کا حاکم شرعی قاضی اسلام ہو کہ احکام ہلال اسی کے یہاں سے صادر ہوتے ہوں۔

(۳) وہ حاکم خود عالم اور اُن احکام میں علم پر عامل وقائم یا کسی عالم دین محقق معتمد پر اعتماد کا ملتزم ولازم۔

(۴) جہاں قاضی شرع نہیں تو مفتی اسلام مرجع عوام منبع الاحکام ہو کہ احکام روزہ وعیدین اُسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہوں۔

(۵) وہاں سے متعدد جماعتیں درکار ہیں کہ جو بالا تفاق وہ خبر دیں کہ ان کی خبر سے یقین یا غلبۂ ظن ملحق بالیقین ہو جائے۔

ان شرائط کے بعد ہمارے ملک پر ایک نظر

(۱) بفضلہ تعالیٰ ملک تو ہمارا اسلامی لیکن احکام وقوانین اسلامیہ ناپید بلکہ الٹا بڑے بڑے امور وقوانین شرع کے صریح خلاف ہیں۔

(۲) حاکم شرع قاضی اسلام یہاں کا العنقاء ہیں بلکہ الٹی چال کہ ماہ رمضان میں رعایا روزہ دار اور ہمارے حکام اکثر روزہ خور ہوتے ہیں۔

(۳) ہمارے ملک کے حکام علم دین سے بالکل ناواقف اور نہ ہی اُن کو علمائے اسلام پر اعتماد بلکہ اپنی مانیں اور اپنی منوائیں۔

(۴) بفضلہ تعالیٰ ہمارے ملک میں بڑے محقق مفتی عالم دین موجود ہیں لیکن ایسے تاریک ماحول میں کہ عوام کو ان کے فتاویٰ کی کوئی پرواہ نہیں۔

(۵) متعدد جماعات کا آنا تو درکنار ہمارے پاس ایک آدمی کو آنا بھی نصیب نہیں بلکہ ہمارے پاس ریڈیو، ٹیلیفون، تار، خطوط وغیرہ آئے ہیں جن کا شرعاً کچھ اعتبار نہیں جبکہ تعزیرات ان اشیا کو اپنے اُمور کے لیے نہیں مانتی تو ہم کس طرح انہیں شرعی امور میں دخیل کا ربنائیں۔

ہماری نظر میں تو تعزیرات کی عزت شریعت کے مقابلے میں چیونٹی کی ٹانگ سے در جہا کم ہے بنابریں ٹیلیفون، تار، خطوط، ریڈیو کی خبروں کو استفاضے میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔

افسوس کہ اسلام سے دوری ونفرت کی حد ہوگئی کہ آج کل کا ماڈرن مسلمان نکاح جیسی مقدس رسم کو ٹیلیفون کے ذریعے ادا کرنے لگا ہے لیکن افسوس کہ جہاں غیر اسلامی امور کا تعلق ہے وہاں بھی مسلمان ٹیلیفون کو روا نہیں رکھتا مثلاً کسی عدالت میں ٹیلیفون پر گواہی دینا یا لینا نئی روشنی کا دلدادہ کلمہ گو روادار نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ رؤیت ہلال یا نکاح کے لیے کیوں روادار بن گیا اُسی کا نام اسلام سے دوری یا نفرت نہیں تو اور کیا ہے۔“ (رویت ہلال، ص: ۲۱، ۲۲، عطاری پبلشرز، کراچی)

ٹیلیفونی استفاضہ بحر العلوم کی تشریحات کی روشنی میں

بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ [م ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۲ء] بھی اپنے استاذ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ اور دیگر علمائے اہل سنت کی طرح ٹیلیفون کی خبر کو ثبوت چاند کے بارے میں بے اعتبار ہی مانتے تھے ان کا ایک فتوی جو کہ حضور حافظ ملت اور علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی علیہما الرحمہ کی مبارک تصدیقات سے مزین ہے ملاحظہ فرمائیے:

”آپ کے سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ جدید آلات پیغام رسانی کی خبر نہ شہادت شرعی ہے نہ ان سے چاند کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ نہ ان کی خبر کو استفاضہ کہا جاسکتا ہے نہ ان پر کسی ذمہ دار عالم کا اعلان شرعی حکم نیت ہلال ہے نہ ان پر کسی کو عمل کرنا چاہیے۔

تفصیل کے لئے آپ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم مطالعہ کریں۔ ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

عبد المنان اعظمی

خادم دار الافتا دار العلوم اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ

۲۸/جمادی الاول ۱۳۹۰ھ

الجواب صحیح، عبد الرؤف غفرلہ

مدرس دار العلوم اشرفیہ مبارکپور

عبد العزیز عفی عنہ (مہر) دار الافتا اشرفیہ مبارکپور"

(آلات جدیدہ کی شرعی حیثیت اور رویت ہلال، ص:۲۱، انجمن تعمیر ملت، سہسرام)

آپ اپنے ایک فتوے میں صراحت کے ساتھ یوں تحریر فرماتے ہیں:

"استفاضہ یہ ہے کہ کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور ہر ایک نے یہی خبر دی کہ اس شہر والوں نے رویت ہلال کے بعد روزہ رکھا، صرف اتنی خبر جماعت کی بھی تسلیم نہ ہوگی کہ یہاں رویت مشہور ہے اور یہ پتہ بھی نہیں کہ یہ رویت کی خبر کیسے پھیلی، تو جو لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں آتے ہوئے کثیر التعداد فونوں کو خبر مستفیض قرار دیتے ہیں شاید خبر مستفیض کی تعریف کے اس ضروری نکتے کو بھول جاتے ہیں کہ استفاضے کے لیے مقام رویت سے متعدد جماعتوں کا آ کر یہاں متفقہ بیان دینا ضروری ہے جب کہ ٹیلیفون کی صورت میں اجتماع صرف خبروں کا ہوتا ہے، مخبرین تو سب اپنے اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں تو اس خبر میں شہادت بلکہ تواتر یا استفاضہ کی صورت کیسے پیدا ہوگی، یہ ایک مجرد خبر ہے"۔ (فتاویٰ بحر العلوم، کتاب الصوم، ج:۲، ص:۲۴۱، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف)

ٹیلیفونی استفاضہ مولانا نعیم اللہ خاں الہ آبادی کی تشریحات کی روشنی میں

"تار، ٹیلیفون، ریڈیو، وائرلیس یا ڈاک کے ذریعے رویت ہلال کا ثبوت شرعاً نہیں ہوسکتا نہ بازاری افواہ، نہ اخبار و جنتری سے فقہائے کرام نے رویت ہلال کے معاملے میں خط کا تو اعتبار ہی نہیں کیا ہے اگرچہ کاتب کے دستخط و تحریر کو پہچانتے ہوں اور اس پر اس کی مہر بھی ثبت ہو کیونکہ کھلا ہوا مسئلہ ہے:

"الخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم"

یعنی خط خط کے مشابہ ہوتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ تو کجا تار، ٹیلی فون وغیرہ جس میں متعدد وسائل، مختلف شبہات و احتمالات پائے جاتے ہیں۔

محمد نعیم اللہ خاں مدرس و سکریٹری جامعہ حبیبیہ الہ آباد

ذلک ذلک محمد عبد الرب مدرس و مہتمم جامعہ حبیبیہ الہ آباد"

(عید کا چاند، ص:۸۷، جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی)

ٹیلیفونی استفاضہ مفتی شبیر حسن کی تشریحات کی روشنی میں

استفاضہ کے معنیٰ و مفہوم کو بدل کر موبائل کے ذریعے جدید اختراعی و غیر شرعی استفاضہ کو جو لوگ متعارف کرانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں ان کے متعلق عمدۃ المحققین حضرت علامہ مفتی شبیر حسن رضوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۴۴۱ھ/ ۲۰۱۹ء] تحریر فرماتے ہیں:

"ثبوت رویت ہلال کے طرق موجبہ میں سے ایک طریقہ استفاضہ بھی فقہائے کرام نے ذکر فرمایا ہے اور اس کے معنیٰ کی تعریف و تعیین بھی فرمادی ہے جس کی تفصیل مجدد دین و ملت آقائے نعمت، سیدنا اعلیٰ حضرت امام اہلسنت امام احمد رضا قادری بریلوی رضی اللہ عنہ نے اپنے متعدد فتاویٰ میں فرمائی ہے۔ آج بعض تجدد پسند حضرات، فقہائے کرام کے متعین کردہ استفاضہ کے معنیٰ و مفہوم میں تبدیلی اور بے جا تاویل کے درپے ہیں جو ہرگز قابل التفات نہیں"۔ (جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کی شرعی حیثیت، ص:۳۰، امام احمد رضا ویلفیئر ٹرسٹ، چھپرہ، بہار)

ٹیلیفونی استفاضہ حضور تاج الشریعہ کی تشریحات کی

روشنی میں

وارث علوم اعلیٰ حضرت نائب حضور مفتی اعظم ہند فقیہ اسلام تاج الشریعہ قاضی القضاۃ فی الہند مفتی محمد اختر رضا خاں قادری قدس سرہ [م ۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۸ء] کے کئی فتاوے اس متعلق "فتاویٰ تاج الشریعہ" میں شامل ہیں اس کے علاوہ آپ نے ان لوگوں کی تردید و تفہیم کے لیے ایک مدلل و مبرہن علمی و فقہی کتاب "جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کی شرعی حیثیت" کے نام سے تحریر فرمائی، جو ہندوستان کے کثیر اکابر و اصاغر علمائے کرام کی تائید و تصدیق سے مزین ہے۔ حضرت کی تحقیق و تدقیق اور دلائل براہین کی کثرت، اس مسئلہ کی کمالی توضیح و تشریح اور مخالفین کا مثالی رد اور ان کے تمام سوالات کے جوابات وغیرہ اس میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

ٹیلیفونی استفاضہ ماہر ہفت لسان کی تشریحات کی روشنی میں

ماہر ہفت لسان علامہ مفتی عاشق الرحمن حبیبی الٰہ آبادی علیہ الرحمہ [م ۱۴۴۲ھ/ ۲۰۲۱ء] کے مجموعۂ فتاویٰ میں ہے:

"ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے سے دی جانے والی اطلاع شرعاً معتبر نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی اطلاع پر عید کی نماز ادا کرنا جائز نہیں ہے، ہاں صحیح العقیدہ سنی اعلم اہل بلد کہ قاضی کے قائم مقام ہیں پرچے میں یہ لکھ کر کہ میرے سامنے شہادتیں گذریں فلاں روز عید ہے اپنا دستخط و مہر ثبت کرنے کے بعد اپنے شہر اور حوالی شہر میں روانہ کرنے کے ذریعہ سے اعلان کرا دیں، وہ معتبر ہوگا اور اس کے مطابق عید کی نماز ادا کی جائے گی تو ہو جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم واحکم"۔
(فتاویٰ حبیبیہ، قسط دوم، کتاب الصوم، ص: ۱۲۹، جامعہ حبیبیہ، مسجد اعظم، الٰہ آباد)

ٹیلیفونی استفاضہ محدث کبیر کی تشریحات کی روشنی میں

شہزادۂ صدر الشریعہ محدث کبیر علامہ مفتی ضیاء المصطفیٰ قادری نے بھی صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ استفاضۂ خبر کے لیے موبائل وغیرہ کی خبر کا اعتبار نہیں ہے آپ تحریر فرماتے ہیں:

"لہٰذا استفاضۂ خبر کے لیے مبائل اور ٹیلیفون سے خبر دینا ہرگز معتبر نہیں، اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

شریعت مطہرہ نے دربارۂ ہلال دوسرے شہر کی خبر کو شہادت کافیہ یا تواتر شرعی پر بنا فرمایا اور ان میں بھی کافی و شرعی ہونے کے لیے بہت قیود و شرائط لگائیں، جن کے بغیر ہرگز گواہی و شہرت بکار آمد نہیں۔

اس لیے ہمارے مشائخ نے پردے کے پیچھے سے سنی ہوئی خبروں کو ثبوت شرعی کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا ٹیلیفون کہ اس میں شاہد و مشہود نہیں ہوتا صرف آواز سنائی دیتی ہے، علما تصریح فرماتے ہیں کہ آڑ سے جو آواز مسموع ہو اس پر احکام شرعیہ کی بنا نہیں ہو سکتی"۔ (جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کی شرعی حیثیت، ص: ۲۰، ۲۱، امام احمد رضا ویلفیئر ٹرسٹ، چھپرہ، بہار)

پچاس سے زائد علما و مفتیان کرام کی مذکورہ تصریحات نقل ہوئی جن میں کثیر تعداد میں تصدیق کرنے والوں کے نام بھی درج ہیں اگر سب کا شمار کیا جائے تو تعداد اور کثیر ہو جائے اتنی کثرت سے بزرگان دین، علمائے کرام کی عبارات اس لیے نقل کی گئی ہیں تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ استفاضہ کے متعلق ہمارے اکابرین و اسلاف، علما و مشائخ اور مفتیان کرام کا موقف و مذہب کیا تھا اور موصوف بھی بزرگوں کی عبارات کو اپنے غلط مطلب کے لیے استعمال نہ کر سکیں، نیز علمائے کرام کی تصریحات سے یہ خوب واضح ہو گیا کہ موصوف فتاویٰ رضویہ کے خوشہ چیں ہیں یا استفاضے کے معاملہ دیوبندیوں کے اختراعی استفاضہ کو فروغ دے کر تمام فقہائے کرام اور اپنے اساتذہ و مشائخ کے ساتھ اعلیٰ حضرت، حضور مفتی اعظم ہند، حضور صدر الشریعہ اور حضور حافظ ملت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کے موقف حق سے بھی انحراف کرنے والے ہیں؟ اس کا فیصلہ کوئی بھی منصف قاری آسانی سے کر سکتا ہے۔

سوال میں آپ نے تحریروں کو نامزد کر کے بھیجا تھا لیکن میں نے سوال سے ان کے ناموں کو حذف کر دیا تاکہ کوئی بھی اس فقہی تحریر کو ذاتیات کے تناظر میں نہ دیکھے۔ جن لوگوں نے جدید مواصلات سے استفاضہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کے دلائل کی طرف

منسوب آپ نے تین تحریریں بھیجی ہیں، یہاں پر ان تینوں حضرات کا نام لکھے بغیر سب سے پہلے ان کا کچھ ضروری تعارف پیش کرتا ہوں:

ان تینوں میں سے دو حضرات تاج دار اہل سنت حضور مفتی اعظم ہند علامہ مفتی مصطفیٰ رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ کے مرید ہیں ان میں سے ایک کا تعلق چمن حافظ ملت جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے ہے، جب کہ دوسرے صاحب کا تعلق بہار سے ہے، جو تیسرے ہیں ان کا تعلق خانقاہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ سے ہے۔ ان تینوں حضرات کے اساتذۂ کرام اور مشائخ طریقت وغیرہ کی تفصیل کو دیکھیے تو قارئین پر مذکورہ بزرگوں کی تصریحات کی روشنی میں روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ یہ حضرات اپنے اساتذہ اور مشائخ طریقت کے ساتھ تمام قدیم وجدید فقہائے کرام کی روش سے ہٹ کر دیوبندیوں کا اختراعی استفاضہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

اول الذکر: جن کا تعلق جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے ہے ان کے اساتذہ میں سے مدرسین اشرفیہ ہیں کیوں کہ یہاں آپ نے کئی سال تک تعلیم حاصل کی ان میں سے بعض کے نام ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) شہزادۂ صدر الشریعہ محدث کبیر علامہ مفتی ضیاء المصطفیٰ قادری

(۲) بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری

(۳) شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی

(۴) عمدۃ المحققین علامہ مفتی شبیر حسن رضوی (ان سے "نانپارہ میں تعلیم حاصل کی)

موصوف اپنی نسبتِ ارادت وتلمذ کے متعلق خود بتاتے ہیں:

["ہم اس سے پہلے کہ گفتگو کا آغاز کریں آپ پر یہ امر منکشف کردیں کہ حبر الامہ، حضور سیدی ومرشدی، مولائی وملاذی مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں علیہ الرحمہ سے اس گنہگار کو دو طرح کی نسبت حاصل ہے: پہلی نسبت تو یہ ہے کہ حضرت کے دست حق پرست پر میں مدرسہ عزیز العلوم، نان پارہ میں بیعت سے مشرف ہوا ۱۹۷۴ء میں۔ پھر اشرفیہ میں میرا داخلہ ہوا تو شارح بخاری علیہ الرحمہ کے کمرے کے بغل میں ہی میرا قیام تھا۔ اس وقت سے فقہی دلچسپی کی وجہ سے میں حضرت سے قریب تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہ اور فتویٰ نویسی حضرت شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھی اور حضرت نے حضور سیدی مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھی، اور حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ نے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان سے سیکھی۔ فقہ اور فتوی نویسی میں میرا سلسلۂ تلمذ حضور سیدی مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ تک صرف ایک واسطے سے پہنچتا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ تک دو واسطوں سے۔ یہ حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے دوسری نسبت ہوئی۔

ہم فتاویٰ رضویہ کے خوشہ چیں ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہماری تحقیقات کی بنیاد فتاویٰ رضویہ پر ہو اور اگر اس پر بنیاد نہ ہو تو کم سے کم تحقیق کا کوئی بھی گوشہ فتاویٰ رضویہ کے خلاف نہ ہو۔ یہ میری تحقیق کا نقش اول بھی ہے اور نقش آخر بھی"۔] (موبائل سے استفاضہ خبر کب اور کیسے؟ ص: ۱۳، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

ان کا تعلق حضور مفتی اعظم قدس سرہ سے ایک تو ارادت کا ہے، دوسرا ایک (حضرت شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ) واسطے سے حضور مفتی اعظم قدس سرہ سے سلسلۂ تلمذ بھی جا ملتا ہے، اسی طرح سے موصوف کا سلسلۂ تلمذ حضور حافظ ملت علامہ عبد العزیز محدث مراد آبادی، حضور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی اور محدث اعظم پاکستان علامہ سردار احمد گرداسپوری (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم) سے صرف ایک واسطے سے جا ملتا ہے۔

دوسرے: جن کا تعلق بہار سے ہے ان کو حضور مفتی اعظم قدس سرہ سے نسبت ارادت کے ساتھ شرف تلمذ بھی حاصل ہے اور حضرت کی خدمت کا موقع بھی ملا ہے ان کے دیگر اساتذہ یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا حاجی مبین الدین محدث امروہوی

(۲) خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی

(۳) مولانا نعیم اللہ خاں رضوی بستوی

تلمذ میں ان کا سلسلہ صرف ایک (مولانا نعیم اللہ خاں رضوی

بستوی) واسطے سے حضور حافظ ملت علامہ عبد العزیز محدث مراد آبادی، استاذ العلما علامہ حافظ عبد الرؤف قادری بلیاوی اور دو واسطوں سے حضور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی اور حضور سیدی اعلیٰ حضرت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم تک پہنچ جاتا ہے۔

تیسرے: محدثِ اعظمِ ہند خلیفۂ اعلیٰ حضرت ابو المحامد سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صاحبزادے اور ان کے شاگرد ہیں، ان کے اساتذہ میں حضور حافظ ملت علامہ عبد العزیز محدث مراد آبادی، اشرف العلما سید حامد اشرف کچھوچھوی، شمس العلما قاضی مفتی شمس الدین رضوی قادری جونپوری، استاذ العلما علامہ حافظ عبد الرؤف قادری بلیاوی، علامہ قاری محمد یحییٰ قادری اعظمی، شیخ العلما مفتی غلام جیلانی قادری اعظمی اور بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری وغیرہ ہیں۔ حضور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی اور حضور سیدی اعلیٰ حضرت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم تک ان کا سلسلۂ تلمذ صرف ایک واسطے سے پہنچ جاتا ہے۔

لیکن یہ تمام نسبتیں غلط استعمال کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان نسبتوں کا پاس ولحاظ بھی از حد لازم وضروری ہے، ان نسبتوں کے ذکر و بیان کا حقیقی فائدہ تبھی حاصل ہوگا جب ان نسبتوں کا لحاظ کر کے ان بزرگوں کی روش اختیار کی جائے۔ ان تینوں حضرات کی نسبتوں کو دیکھیے، پھر غور کیجیے کہ انہوں نے چاند کے مسئلہ میں کیسے اپنے اساتذہ بلکہ اساتذہ کے اساتذہ اور مشائخ سلسلہ کی فکر سے انحراف کیا ہے اور مخالفت جمہور کر کے ایجاد امور کی راہ پر چل کر دیوبندیوں کے ایجاد کردہ اس استفاضہ کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس کا رد تسلسل کے ساتھ ہمارے علما و مفتیان کرام ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء سے لے کر اب تک دلائل و براہین سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ان تینوں حضرات کی سب سے اہم دلیل وہی ہے جو دیوبندی مولوی کفایت اللہ دہلوی اور مولوی شفیع دیوبندی وغیرہ نے آج سے تقریباً ۷۵ رسال پہلے لکھی تھی جس کی تفصیل پیچھے گذر چکی ہے یہاں پر ان میں سے صرف دو عبارات مکرر نقل کی جاتی ہیں، چنانچہ دیوبندی مولوی کفایت اللہ دہلوی نے لکھا ہے:

”استفاضہ کی جو تعریف آپ نے نقل کی وہ صحیح ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت استفاضہ کی نہیں، اگر متعدد اخبار یعنی کم از کم دس اخبار اپنے اندر رؤیت ہلال کی خبر معتبر آدمیوں کے ذریعہ سے دیں تو وہ خبر مستفیض ہوئی“۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد دوم یعنی امداد المفتیین کامل، کتاب الصوم، ص: ۴۰۹، دار الاشاعت، کراچی)

اس جواب پر سائل نے پھر سوال کیا تو اس سوال کا جواب مولوی شفیع نے یوں دیا:

”جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا، یہ صحیح ہے کہ علامہ شامی نے استفاضہ کی ایک خاص صورت بیان فرمائی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلق استفاضہ اس میں منحصر ہو بلکہ یہ صورت بھی استفاضہ میں داخل ہے کہ مختلف شہروں سے مختلف لوگوں کے ذریعہ رویت ہلال، یا حکم بالرؤیہ کی خبر بعد تواتر موصول ہو جائیں، اس میں مختلف شہروں کے اخبار، یا ٹیلی فون، یا مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کی خبریں شامل ہیں، جب وہ حد تواتر کو پہنچ جائیں تو استفاضہ کی تعریف میں داخل ہیں“۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد دوم یعنی امداد المفتیین کامل، کتاب الصوم، ص: ۴۱۰، دار الاشاعت، کراچی)

اس کے علاوہ ان کی دلیلیں دھوکہ وتزویر مرصع ہیں لہٰذا اب ان کی دلیلوں پر بھی کچھ کلام کر لیا جائے اس کے لیے یہ ملحوظ رہے کہ جہاں پر ان کی کوئی عبارت نقل کروں گا تو وہ عبارت اس [ ] علامت کے مابین ہوگی۔

[”دیکھیے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جو لکھا ہے کہ ٹیلی فون اور تار کی خبر چاند کے بارے میں بالکل غیر معتبر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے چاند کا ثبوت نہیں ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے ثابت شدہ چاند کا اعلان بھی نہیں ہوگا۔ غور فرمائیے ہم کیا کہہ رہے ہیں چاند کا ثبوت شرعی ہمارے پاس ہو گیا، چاند کا فیصلہ ہو گیا۔ اب صرف اعلان کرنا ہے جو ہم موبائل سے کر رہے ہیں اور اس بارے میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ ہمارے لیے پیشوا ہیں، رہنما ہیں۔ اعلیٰ حضرت علیہ

الرحمہ جب توپ کی آواز کو، نقارے کی آواز کو، ڈھنڈورا وغیرہ کی آواز کو چاند کے اعلان کے لیے حجت مان رہے ہیں تو ہم بھی ان کو بشمول موبائل حجت مان رہے ہیں۔ہم نے کہا کہ آواز میں تو احتمال ہے، کہ جو آواز جاتی ہے، نقارے وغیرہ کی، ہوسکتا ہے کہ روزے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے ہو، نقارہ کسی اور کام سے بجایا گیا ہو،لیکن جب قاضی شریعت اپنے موبائل نمبر سے دوسرے قاضی کو، دوسرے عالم کو فون کر رہا ہے، ہر ایک دوسرے کی آواز کو پہچان رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں دوبارہ فون کر کے،تو اس کی آواز نقارے کی آواز سے بھی کمتر ہوگئی۔اگر نقارے کی آواز معتبر ہے تو ایک مفتی شریعت کی جانی پہچانی آواز جو موبائل کے ذریعے کلام کی شکل میں دوسرے مفتی شریعت کو پہنچ رہی ہے وہ بدرجہ اولیٰ معتبر ہوگی۔مقصود پوچھنے والے کا سمجھنا تھا سمجھ گئے تو قبول بھی کر لیا"۔](موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟، ص:۲۲، ۲۳،جامعہ قادریہ، پونہ،مہاراشٹر)

مذکورہ عبارت کو غور سے پڑھیے موصوف کیا کہہ رہے ہیں اور کیسے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی عبارت کی غلط توضیح وتشریح کر کے عوام مسلمین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے نقارے اور ڈھنڈورے کی آواز کا اعتبار شہر حوالی شہر کے لیے قیود وشرائط کے ساتھ کیا ہے فتاویٰ رضویہ میں ہے:

"علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے توپیں سُننے کو بھی حوالی شہر کے دیہات والوں کے واسطے دلائل ثبوت ہلال سے گنا۔ظاہر ہے کہ یہاں بھی وہی شرائط مشروط ہوں گے کہ اسلامی شہر میں حاکمِ شرع معتمد کے حکم سے انتیس کی شام کو توپوں کے فائر صرف بحالتِ ثبوت شرعی رؤیت ہلال ہوا کرتے ہوں کسی کے آنے جانے کی سلامی وغیرہ کا اصلاً احتمال نہ ہو ورنہ شہر اگرچہ اسلامی ہو مگر وہاں احکام شرعیہ کی قدر نہیں احکام نہال بے خرد یا نیچری رافضی وغیرہم بد مذہبوں کے حوالے ہیں جنہیں نہ قواعد شرعیہ معلوم نہ اُن کے اتباع کی پروا، اپنی رائے ناقص میں جو آیا اس پر حکم لگادیا، توپیں چل گئیں، تو ایسی بے سروپا باتیں کیا قابل لحاظ ہوسکتی ہیں کما لایخفی ، پھر جہاں کی توپیں شرعاً قابلِ اعتماد ہوں اُن پر عمل اہلِ دیہات ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عند التحقیق خاص اس شہر والوں کو بھی اُن پر اعتماد سے مفر نہیں کہ حاکمِ شرع کے حضور شہادتیں گزرنا اُس کا اُن پر حکم نافذ کرنا ہر شخص کہاں دیکھتا سُنتا ہے بحکمِ حاکم اسلام اعلان عام کے لیے ایسی ہی کوئی علامتِ معہودہ معروفہ قائم کی جاتی ہے جیسے توپوں کے فائر یا ڈھنڈورا وغیرہ"۔(فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰،ص:۴۲۰،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی عبارت پڑھیے اور پھر موصوف کی یہ عبارت دیکھیے:

["ہم نے کہا کہ آواز میں تو احتمال ہے، کہ جو آواز جاتی ہے، نقارے وغیرہ کی، ہوسکتا ہے کہ روزے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے ہو، نقارہ کسی اور کام سے بجایا گیا ہو،لیکن جب قاضی شریعت اپنے موبائل نمبر سے دوسرے قاضی کو، دوسرے عالم کو فون کر رہا ہے، ہر ایک دوسرے کی آواز کو پہچان رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں دوبارہ فون کر کے،تو اس کی آواز نقارے کی آواز سے بھی کمتر ہوگئی۔اگر نقارے کی آواز معتبر ہے تو ایک مفتی شریعت کی جانی پہچانی آواز جو موبائل کے ذریعے کلام کی شکل میں دوسرے مفتی شریعت کو پہنچ رہی ہے وہ بدرجہ اولیٰ معتبر ہوگی۔"]

نقارے وغیرہ کی آواز کے شہر اور حوالی شہر کے دیہات والوں کے لیے معتبر ہونے کے لیے بھی ان شرطوں کا پایا جانا لازم وضروری ہے:

(۱)اسلامی شہر میں حاکمِ شرع معتمد ہو۔ (۲)اسی حاکم کے حکم سے انتیس کی شام کو توپوں کے فائر صرف بحالتِ ثبوت شرعی رؤیت ہلال ہوا کرتے ہوں۔(۳)کسی کے آنے جانے کی سلامی وغیرہ کا اصلاً احتمال نہ ہو۔

جس اسلامی شہر میں شرعی طریقے سے ثبوت رویت ہلال ہوگیا ہے اگر مذکورہ شرائط پائے جائیں تو بحکم حاکم ڈھنڈورا یا توپوں کے فائر وغیرہ علامات معہودہ ومعروفہ شہر کے متعلق دیہات والوں بلکہ عند التحقیق خاص اسی شہر والوں کے لیے شرعاً قابل اعتماد ہیں لیکن اس شہر کے حاکم

کے حکم سے اگر کسی دوسرے شہر میں کہ جس میں ابھی چاند کا ثبوت شرعی نہیں ہوا ہے توپوں کے فائر کیے جائیں یا ڈھنڈورا پیٹا جائے تو یہ اس دوسرے شہر اور اس کے متعلق دیہات میں چاند کے ثبوت کے لیے قابل اعتبار نہیں ہے یہ آوازیں تو بہت دور اگر کسی ملک کا سب سے بڑا عالم و مفتی جس کو ملک بھر میں سب مسلمان پورے ملک کا قاضی (قاضی القضاۃ) تسلیم کرتے ہوں اگر وہ اپنے ہی ملک میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر کے اور اپنے دارالافتا و دارالقضا کے ہی لیٹر ہیڈ پر اپنی اور دارالافتا و دارالقضا کی مہر لگا کر اپنے شہر اور حوالی شہر سے باہر کسی دوسرے قاضی کے پاس کسی کے ذریعے بھیجا جو لے کر آیا وہ بھی مشہور و معروف عالم و مفتی اور کسی شہر کا قاضی ہو اگر چہ اس کا محتاط عالم و مفتی ہونا علما و عوام میں مسلم ہو تب بھی اس سے ثبوت رویت ہلال نہیں ہوگا۔ اس طرح کے خطوط اس قاضی کے پاس دس بیس پچاس شہروں کے قاضیوں کے پاس سے آجائیں ان سے رویت ہلال کا ثبوت نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہاں پر کتاب القاضی الی القاضی کے جو شرائط تھے وہ نہیں پائے گئے۔

موصوف نے کیسی ڈنڈی ماری جس شہر میں ثبوت ہوگیا ہے اس پر ان شہروں کو قیاس کر کے کہہ رہے ہیں کہ جب نقارے کی آواز سے چاند کا ثبوت ہوجائے گا تو ”قاضی شریعت اپنے موبائل نمبر سے دوسرے قاضی کو، دوسرے عالم کو فون کر رہا ہے، ہر ایک دوسرے کی آواز کو پہچان رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں دوبارہ فون کر کے، تو اس کی آواز نقارے کی آواز سے بھی کمتر ہوگئی۔ اگر نقارے کی آواز معتبر ہے تو ایک مفتی شریعت کی جانی پہچانی آواز جو موبائل کے ذریعے کلام کی شکل میں دوسرے مفتی شریعت کو پہنچ رہی ہے وہ بدرجہ اولیٰ معتبر ہوگی۔“ (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص: ۲۲، ۲۳، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

قاضی شریعت کی کال کا معتبر ہونا تو بہت دور کی بات ہے بلکہ فقہائے تو یہاں تک تصریح فرماتے ہیں، کہ اگر قاضی اپنا آدمی بھیجے بلکہ بذات خود ہی آکر بیان کرے، کہ میرے سامنے گواہیاں گذریں، ہرگز نہ سنیں گے، کہ اجماع تو صرف دربارۂ خط منعقد ہوا ہے، پیام ایلچی اور خود قاضی کا بیان تو اس سے الگ ہیں، امام ابن ہمام محقق علی الاطلاق شرح ہدایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”الفرق بين رسول القاضي و كتابه حيث يقبل كتابه ولا يقبل رسوله. فلان غاية رسوله ان يكون كنفسه، وقدمنا انه لوذكر مافي كتابه لذلك القاضي بنفسه لا يقبله، وكان القياس في كتابه كذلك، الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه“۔ (فتح القدیر، ج: ۷، ص: ۲۹۱، دارالفکر، بیروت)

قاضی کے قاصد اور اس کے خط میں یہ فرق ہے کہ خط (بطریق کتاب القاضی الی القاضی) قبول کیا جائے گا لیکن قاصد مقبول نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ قاصد، قاضی کے قائم مقام ہے جبکہ ہم پہلے بیان کر چکے کہ اگر قاضی خود جا کر دوسرے قاضی کو خط والا مضمون بتائے تو دوسرا قاضی اسے قبول نہیں کرے گا، خط کے بارے میں قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ قبول نہ ہو لیکن تابعین حضرات کے اجماع سے اسے جائز و مقبول قرار دیا گیا جو کہ خلاف قیاس ہے اسی لیے اسی میں اجازت محصور رہے گی۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت شاہ امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

”ائمۂ دین تو یہاں تک تصریح فرماتے ہیں کہ اگر قاضی اپنا آدمی بھیجے بلکہ بذاتِ خود ہی آکر بیان کرے کہ میرے سامنے گواہیاں گذریں ہرگز نہ سُنیں گے“۔ (فتاوی رضویہ مترجم، ج: ۱۰، ص: ۳۶۴، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

یہ قاضی دوسرے شہر میں بنفس نفیس بھی چلا جائے اور دوسرے قاضی کے سامنے جا کر کہے کہ ہمارے یہاں چاند کا ثبوت ہوگیا ہے اس سے بھی چاند کا ثبوت نہیں ہوگا کیوں کہ یہاں پر چاند کے ثبوت کے لیے جو طرق موجبہ ہیں ان میں سے کوئی بھی طریق نہیں پایا گیا تو بھلا فون پر صرف قاضی کی آواز اگر چہ پہچانی ہوئی ہو لیکن اس سے چاند کا ثبوت نہیں ہوسکتا کیوں کہ فون میں کیسے بھی آواز پہچانی جائے یہ اس

سے قوی نہیں ہے کہ قاضی دوسرے قاضی کے پاس خود حاضر ہو کر ثبوت چاند کا حکم خود اپنی زبان سے آمنے سامنے دوسرے قاضی کو بتائے جب اس کا اعتبار نہیں ہے تو فون کال کا اعتبار کیوں کر ہوگا۔

اختراعی استفاضہ کو ثابت کرنے کے لیے کرامت کا اختراع

اپنے جدید اختراعی وغیر شرعی استفاضہ کو ثابت کرنے کے لیے جب فقہائے کرام کی کوئی صراحت نہیں ملی تو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی ایک کرامت گڑھی ملاحظہ فرمائیں:

["بعض نے سمجھنے کے لیے یہ پوچھا کہ ٹیلی فون کے بارے میں تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے لکھ دیا ہے کہ چاند کے باب میں اس کی خبر بالکل غیر معتبر ہے تو آپ نے اس کو کہاں سے معتبر قرار دے دیا؟

تو ہم نے کہا بات تو صحیح ہے مگر دیکھیے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جو لکھا ہے کہ ٹیلی فون اور تار کی خبر چاند کے بارے میں بالکل غیر معتبر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے چاند کا ثبوت نہیں ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے ثابت شدہ چاند کا اعلان بھی نہیں ہوگا۔ غور فرمائیے ہم کیا کہہ رہے ہیں چاند کا ثبوت شرعی ہمارے پاس ہو گیا، چاند کا فیصلہ ہو گیا۔ اب صرف اعلان کرنا ہے جو ہم موبائل سے کر رہے ہیں اور اس بارے میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ ہمارے لیے پیشوا ہیں، رہنما ہیں۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ جب توپ کی آواز کو، نقارے کی آواز کو، ڈھنڈورا وغیرہ کی آواز کو چاند کے اعلان کے لیے حجت مان رہے ہیں تو ہم بھی ان کو بشمول موبائل حجت مان رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آواز میں تو احتمال ہے، کہ جو آواز جاتی ہے۔ نقارے وغیرہ کی، ہوسکتا ہے کہ روزے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے ہو، نقارہ کسی اور کام سے بجایا گیا ہو، لیکن جب قاضی شریعت اپنے موبائل نمبر سے دوسرے قاضی کو دوسرے عالم کو فون کر رہا ہے، ہر ایک دوسرے کی آواز کو پہچان رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں دوبارہ فون کر کے، تو اس کی آواز نقارے کی آواز سے بھی کمتر ہو گئی۔ اگر نقارے کی آواز معتبر ہے تو ایک مفتی شریعت کی جانی پہچانی آواز جو موبائل کے ذریعے کلام کی شکل میں دوسرے مفتی شریعت کو پہنچ رہی ہے وہ بدرجہ اولی معتبر ہوگی۔ مقصود پوچھنے والے کا سمجھنا تھا سمجھ گئے تو قبول بھی کر لیا۔

ہم نے کہا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے صرف ڈھنڈورا اور توپ نہیں لکھا بلکہ توپ اور ڈھنڈورا وغیرہ لکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی نگاہ آج کے آنے والے زمانے پر بھی تھی کہ ہوسکتا ہے آگے چل کر توپ نہ ہو، نقارہ نہ ہو، ڈھنڈورا نہ ہو، اس کی جگہ پر اس سے بہتر کوئی اور چیز آ جائے تو "وغیرہ" کہہ کر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے ہمارے زمانے کے موبائل کو بھی شامل کر لیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی کرامت ہے جو "وغیرہ" کا لفظ بڑھا کر موبائل، وغیرہ کو بھی شامل حکم فرما دیا۔ تو یہ اعلیٰ حضرت کا اتباع ہے کہ نہیں؟ کہاں ہے خلاف ورزی؟"] (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص: ۲۳، ۲۴، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

واہ! اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کتنی عظیم دلیل پیش کی گئی ہے یہ ایسی عظیم اور انوکھی دلیل ہے کہ قدیم و جدید فقہا کی کسی بھی فقہ و فتاوے کی کتاب میں اس کی نظیر تلاش کرنا بھی کسی کرامت سے کم نہیں ہوگا۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا قادری اور دیگر فقہائے کرام رحمہم اللہ کی تصریحات ابھی گذریں کہ نقارہ، توپ کے فائر اور ڈنڈھورا وغیرہ کی آواز سے شرائط کے ساتھ اس شہر اور حوالی شہر وغیرہ میں چاند کا ثبوت ہوجائے گا دوسرے شہر میں نہیں اگر ایک شہر کا قاضی دوسرے شہر میں اپنے قاصد و خط وغیرہ بھیج کر اعلان کروائے تو صرف اس کے خط یا اعلان سے چاند کی رویت ثابت نہیں ہوگی بلکہ قاضی خود جا کر بھی دوسرے قاضی سے کہے کہ ہمارے یہاں چاند کی شرعی شہادت ہو گئی اس سے بھی چاند کا ثبوت اس دوسرے شہر میں نہیں ہوگا۔

"وغیرہ" کی نظیر وہی پرچے ہیں جن کی تفصیل فتاویٰ رضویہ کی روشنی میں گذر چکی ہے کہ جب اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے یہاں چاند کا ثبوت شرعی ہوجاتا تو آپ پرچوں پر یہ لکھوا دیتے کہ میرے سامنے شہادتیں گذر گئیں کل ۔۔کو عید ہے جیسا کہ بلند شہر کے ایک صاحب

نے آپ سے سوال کیا سوال وجواب ملاحظہ ہوں:

"حضرت مولانا.... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معروض خدمت شریف ہے کہ جناب والا کا ایک مختصر سا پرچہ جس پر جناب کی مہر لگی ہوتی ہے اور ایک سطر میں یہ عبارت مرقوم ہے (میرے سامنے شہادتیں گذر گئیں کل جمعہ کو عید ہے) خاکسار کو موصول ہُوا اس کے متعلق فتویٰ شرعی دریافت طلب ہے کہ جس جگہ یہ پرچہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو جمعہ کو عید کرنا تھی یا نہیں اور روزے توڑ دینا ضرور تھے یا نہیں اور اس کی عام تشہیر اور دیگر بلاد میں اشاعت سے کیا مفاد تھا؟ بینوا توجروا

الجواب: وہ پرچے دیگر بلاد میں نہ بھیجے گئے، تقسیم کرنے والوں نے اسٹیشن پر بھی دیئے، ان میں سے کوئی لے گیا ہوگا۔ بعض لوگوں نے پیلی بھیت کے واسطے چاہا اور ان کو جواب دے دیا گیا کہ جب تک دو شاہد عادل لے کر نہ جائیں پرچہ کافی نہ ہوگا اور بلاد بعیدہ کو کیونکر بھیجے جاتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص:۳۵۷،۳۵۶، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اب "وغیرہ" کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اعلیٰ حضرت کے زمانے میں جو "پرچے" لکھ کر بانٹے جاتے تھے وہ وغیرہ کے ضمن میں ہیں، "لیٹر ہیڈ" بھی اسی وغیرہ میں شامل ہیں، جن پر لکھ کر شہر قاضی اعلان کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے چاند کے متعلق لکھی ہوئی تحریر کو صرف بریلی اور اس مضافات کے لیے ہی قابل اعتبار فرمایا بلند شہر بلکہ پیلی بھیت کے لیے اس تحریر کو غیر معتبر فرمایا لہٰذا یہ لیٹر ہیڈ یا پرچے یا دیگر معہود ومعروف طریقے صرف اسی شہر کے لیے شرائط کے ساتھ مفید ہوں گے دیگر شہروں کے لیے تحریر تبھی مفید ہوگی جب کہ اسے لے جانے میں شرائط کتاب القاضی کی رعایت کی جائے۔

ایک خطیب صاحب کو دلیل

موصوف اپنا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

["ایک خطیب صاحب کا اعتراض: ایک عالم صاحب سے جو بڑے خطیب بھی ہیں اپنے علاقے میں، ملاقات ہوگئی اور انھوں نے چاند کا یہی مسئلہ چھیڑ دیا، اور میں نے انھیں یہی جواب دیا، تو ناراض ہو کر کہنے لگے اور میں مسکراتا رہا اور مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ بولنے لگے کہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے توپ کے لیے لکھا کہ جائز ہے اور توپ حاکم اسلام کی اجازت ہی سے داغی جا سکتی تھی، دوسرا کوئی داغ نہیں سکتا تھا، اس لیے اس میں ذرہ برابر بھی احتمال نہیں ہے کہ روزے کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے توپ داغ دی گئی ہو مگر آپ کا موبائل لے کر ہم بھی فون کر سکتے ہیں، دوسرا بھی فون کر سکتا ہے، اتنا تو احتمال ہے؟

جواب: ہم نے کہا آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے صرف توپ لکھا ہوتا تو آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر ہوتا لیکن اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا قلم دیکھیے، وہ لکھتے ہیں توپ، ڈھنڈورا، وغیرہ۔ تو کیا ڈھنڈورا کے لیے بھی حاکم اسلام کی اجازت کی ضرورت ہے اور کیا وغیرہ کے لیے بھی ضرورت ہے؟؟ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت وغیرہ جانتے ہیں کیا ہے؟ یہی (موبائل) ہے۔ جتنا مجمع تھا سب لوگ مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے بھی اُس وقت تسلیم کر لیا کہ حق یہی ہے۔ تو تحقیق کی بنیاد فتاویٰ رضویہ پر ہی ہے، بلفظ دیگر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ ہی حرف آخر ہیں۔"] (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟، ص: ۲۴، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

بڑے خطیبوں کا کیا ان میں تو بہت سے ایسے بھی ہیں جو مطالعہ کے قریب تک نہیں جاتے، محض فن کاری واکٹنگ سے عوام میں اثر و رسوخ بنا لیتے ہیں۔ ایک بڑے مشہور خطیب ہیں انہوں نے کفار کے پیشوا و دیوتا کی تعریف وتوصیف کی، انہوں نے خود بر سر اسٹیج بتایا کہ ان کی بیوی کفار ومشرکین کے مذہبی پیشوا کے پروچن سننے یا دیکھنے کا شوق رکھتی ہے۔ اب جس بڑے خطیب کو موصوف نے غلط "ڈھنڈورا" سمجھا کر مطمئن کر دیا اس میں موصوف کا کمال ہے یا مطمئن ہونے والے بڑے خطیب صاحب کا اسے تو یہی دونوں لوگ سمجھیں۔ لیکن "ڈھنڈورا" سے یہ مطلب کہاں سے نکال لیا گیا کہ اس "ڈھنڈورا"

سے بھی چاند ثابت ہو جائے گا جو حاکم اسلامی کے حکم کے خلاف ہو بلکہ "ڈھنڈورا" سے مراد ہی یہ ہے کہ حاکم کے حکم سے اعلان عام کیا جائے دیکھیے نور اللغات میں اس کا معنیٰ یوں بیان کیا گیا ہے:

"ڈھنڈورا: ڈُبل منادی کا جو حکم حاکم سے کسی امر کے اعلان کے واسطے بجاتے ہیں تاکہ ہر شخص اس سے آگاہ ہو جائے"۔(نور اللغات، ج:۳،ص:۲۳،حلقۂ اشاعت،لکھنؤ)

فیروز اللغات میں اس کے معانی یہ بیان کیے گیے ہیں:

"ڈھنڈورا: ڈگڈگی، ڈھول، منادی، تشہیر"۔(فیروز اللغات، اردو، ۶۸۵،ادبی دنیا، دہلی)

آج بھی بولا جاتا ہے:"حکومت کے فلاں نے قانون کی تشہیر کے لیے شہر میں "ڈھنڈورا" پیٹا گیا"۔تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ حاکم کے حکم یا اس کی اجازت سے مخصوص طریقے سے شہر میں اعلان کیا گیا۔

اگر شہر میں چاند کا ثبوت ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ "ڈھنڈورا" موصوف کے نزدیک بھی چاند ثابت کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہوگا تو اگر موبائل فون کو "ڈھنڈورا" کا ہی درجہ موصوف دیدیں تب بھی موبائل کے ذریعہ سے ایسے شہر میں چاند ثابت نہیں ہوگا کہ جہاں ابھی تک چاند کا ثبوت شرعی نہیں ہوا ہے، کیوں کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ "ڈھنڈورا" وغیرہ کے ذریعہ شرائط کے ساتھ صرف اسی شہر اور حوالی شہر میں اعلان کیا جا سکتا ہے جہاں شرعی رویت ثابت ہو چکی ہے۔

["دیکھیے! خبر جب تک خالص خبر رہتی ہے وہ سچ کا بھی احتمال رکھتی ہے، جھوٹ کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ ہوسکتا ہے سچی ہو، ہوسکتا ہے جھوٹی ہو۔ اس کو معتمد بنانے کے لیے شریعت نے دو راستے بتائے۔ایک شہادت کا۔ اور ایک کثرت کا۔"](موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص:۲۷،جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

کثرت سے خبر معتمد ہو سکتی ہے لیکن چاند کے ثبوت کے لیے وہ خبر درکار ہے جو مستفیض ہو اور خبر مستفیض کے لیے متعدد شرطوں کا پایا جانا لازم ہے جو موبائل فون سے دی جانے والی خبر میں مفقود ہے لہٰذا صرف موبائل کی خبر سے استفاضۂ شرعی کا تحقق نہیں ہو سکتا، جب استفاضہ کا تحقق نہیں ہوگا تو اس سے چاند کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا۔

["یہ اس وقت ہے جب لوگ ہمارے پاس آئیں۔لیکن اگر واقعہ یہ ہو کہ کسی نے چاند دیکھا پونہ میں، کسی نے چاند دیکھا مدراس میں کسی نے چاند دیکھا میسور میں، کسی نے چاند دیکھا بنگلور میں، کسی نے چاند دیکھا کلکتہ میں، کسی نے چاند دیکھا گجرات میں، کسی نے چاند دیکھا آسام میں، غرض یہ کہ چودہ پندرہ لوگوں نے چاند دیکھا اور دور دراز کے مختلف شہروں اور علاقوں میں چاند دیکھا، ہم سب کو اکٹھا نہیں کر سکتے، نہ وہ سب آسکتے ہیں تو پھر کیا کیا جائے؟

کل تک ٹیلی فون کا نظام بڑا کمزور تھا اسی لیے ٹیلی فونی نظام کے ذریعے دور دراز کے لوگوں سے یہ معلوم ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کس نے چاند دیکھا، کس نے نہیں دیکھا، اور بسا اوقات اگر معلوم بھی کر لیا جائے اور ان میں سے کوئی جھوٹ بول دیتا تو اس کی تحقیق فوراً نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔لیکن آج یہ ٹیلی فونی نظام، موبائلی نظام اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر ہم لوگ پورے ہندوستان کو کھنگال لیتے ہیں اور یہ بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ کہاں کہاں صحیح میں چاند دیکھا ہے اور کہاں کہاں چاند نہیں دکھا ہے اور یہ بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ کہاں کہاں علما، ائمہ، قاریوں، حافظوں اور حاجیوں نے چاند دیکھا ہے اور کہاں کہاں پاجیوں نے چاند دیکھا ہے، یہ سب کچھ ہم لوگ آدھے گھنٹے کے اندر تحقیق کر لیتے ہیں۔"](موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص:۲۹، ۳۰،جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

ٹیلیفونی نظام ایک زمانے سے اتنی قوت رکھتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو چاند کی خبر دہائیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں یہی وجہ ہے کہ دیوبندی جو پہلے خط سے استفاضے کے قائل تھے تقریباً ۷۵ رسال پہلے وہ ٹیلیفون سے بھی استفاضہ کے قائل ہو گئے ہمارے اکابرین نے ان کے خطوط والے استفاضہ کا جیسے رد بلیغ فرمایا تھا ویسے ہی ان کے ٹیلیفونی استفاضہ کا بھی رد فرمایا جس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

موصوف کے پاس جب تک کلکتہ، میسور اور بنگلور وغیرہ سے چاند دیکھنے کے فون نہیں آئے تھے تب تک موصوف کے نزدیک بھی دوسرے شہر کا چاند ثابت نہیں تھا جیسا کہ موصوف کی اس عبارت سے ظاہر ہے اب موصوف کی وہ عبارت دیکھیے جو پیچھے گزر چکی ہے دونوں عبارتوں سے تضاد اور دھوکہ قارئین پر واضح ہو جائے گا کہ یہاں فون کال سے چاند ثابت کر رہے ہیں اور پیچھے یہ بیان کر چکے ہیں کہ فون سے چاند کا ثبوت نہیں ہو رہا ہے صرف اعلان ہو رہا ہے:

[" دیکھیے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جو لکھا ہے کہ ٹیلی فون اور تار کی خبر چاند کے بارے میں بالکل غیر معتبر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے چاند کا ثبوت نہیں ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے ثابت شدہ چاند کا اعلان بھی نہیں ہوگا۔ غور فرمائیے ہم کیا کہہ رہے ہیں چاند کا ثبوت شرعی ہمارے پاس ہو گیا، چاند کا فیصلہ ہو گیا۔ اب صرف اعلان کرنا ہے جو ہم موبائل سے کر رہے ہیں"۔] (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص: ۲۲، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

ان سطحی باتوں کا صدور موصوف سے صرف اس وجہ سے ہی ہو رہا ہے کہ موصوف نے اپنے مرشدان طریقت، اساتذۂ کرام بلکہ تمام علما و فقہا کے خلاف جدید غیر شرعی اور اختراعی استفاضہ کی وہ صورت اختیار کی کہ جسے ان سے پہلے آج تک دیوبندیوں کے سوا کسی بھی قدیم و جدید عالم و فقیہ اور مفتی نے بیان نہ کیا۔

چاند کے ثبوت کی انوکھی دلیل

[" اب دیکھئے استفاضہ کے لیے صحیح خبر ہونا ضروری ہے، خبر صحیح ہو، سچی ہو، پکی ہو تو وہ حجت اور معتبر ہے۔ آج آپ دیکھیں، ہماری جماعت اہل سنت میں چھوٹے چھوٹے علما بھی ہیں، اوسط درجے کے علما بھی ہیں اور بڑے سے بڑے، اونچی چوٹی کے علما بھی ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا جب کوئی مسئلہ پھنستا ہے تو جس کا جس عالم سے تعلق ہوتا ہے وہ موبائل کے ذریعے پوچھتا ہے اور فون پر جب وہ عالم مسئلہ شرعیہ بتا دیتے ہیں تو وہ مان لیتے ہیں۔ یہ دینی معاملہ ہے۔ اس دینی معاملے میں عالم کی بتائی ہوئی خبر پر وہ عمل کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس معاملے میں جو عالم جتنا بڑا ہے اس کے پاس اتنے ہی زیادہ فون جاتے ہیں اور جو چھوٹا ہوتا ہے اس کے پاس بھی فون آتے ہیں مگر کم آتے ہیں۔ تو روزانہ صرف ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں سنی مسلمان سنی علما کے پاس فون کرتے ہیں۔ سنی علما بتاتے ہیں، اور عامہ مومنین اس پر عمل کرتے ہیں۔

علما بھی ہمارے پاس فون کرتے ہیں اور ہماری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں اور سائل و مفتی کے درمیان اتنی لمبی مسافت ہوتی ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں رہا ہوتا ہے۔ تو دینی معاملے میں ٹیلی فون یا موبائل سے حاصل ہونے والی خبر پر خود علما اپنے سے بڑے علما پر اعتماد کر رہے ہیں اور عامہ امت مسلمہ بھی اعتماد کر رہی ہے، پوری دنیا کو سامنے رکھ کر دیکھ لیجیے تو روزانہ لاکھوں، لاکھ لوگ دینی امور میں اپنے علما سے رجوع کرتے ہیں، اور جو بتایا جاتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ علما فون پر موبائل پر دینی امور کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اعتماد کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خبر سچی ہے، پکی ہے، صحیح ہے پھر چاند کا مسئلہ بھی تو دینی امر ہے تو اس وقت اس معاملے میں اگر یہی علما کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا، دوسری جگہ کے علما کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا؟

دینی امر وہ بھی ہے کہ لاکھوں لاکھ لوگ روزانہ اس پر عمل کر رہے ہیں اور دینی امر یہ بھی ہے تو کیوں نہ اس پر بھی عمل کیا جائے؟ خبر استفاضہ میں بس یہ ضروری ہے کہ خبر صحیح ہو، اس کے صحیح ہونے کی تحقیق ہو یہ ہمارے عالم ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں، یہ فون پر ہم کو بتا رہے ہیں کہ حضرت میں نے خود اپنی آنکھوں سے آج مغرب کی نماز پڑھ کے نکلا تو رمضان کا چاند دیکھا، میں کیسے کہہ دوں کہ مولانا جھوٹ بول رہے ہیں، میں حکیم صاحب کو جانتا ہوں کہ یہ اپنی آنکھوں سے چاند دیکھنے کا بیان دے رہے ہیں فون پر تو میں کیسے کہہ دوں کہ حکیم صاحب جھوٹ بول رہے ہیں، ہم سو مرتبہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دین کے معاملے

میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے، سومرتبہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا دین کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتے اس لیے کہ یہ حضرات خدا ترس ہیں اور جھوٹ بولنے میں ان کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔"](موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ص: ۳۰،۱۳۱، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

ٹیلیفون سے استفاضہ تو دیوبندیوں، وہابیوں نے بھی ثابت کیا اور وہ اس کو تقریباً سات، آٹھ دہائیوں سے ثابت کرتے ہوئے بھی چلے آرہے ہیں لیکن ایسی مضحکہ خیز دلیل آج تک کسی کی بھی کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں مسائل شرعیہ فقہیہ میں کسی ایسے شخص سے تصور بھی نہیں کی جاسکتی ہیں کہ جس کا تعلق فقہ وافتا سے ہو۔ ملاحظہ کیجیے ایسی بے مثال دلیل جس کی کہیں کوئی مثال نہ مل سکے:

["علما فون پر موبائل پر دینی امور کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اعتماد کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خبر سچی ہے، پکی ہے، صحیح ہے پھر چاند کا مسئلہ بھی تو دینی امر ہے تو اس وقت اس معاملے میں اگر یہی علما کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا، دوسری جگہ کے علما کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا؟" الخ]

یہ قیاس فقہ وافتا سے متعلق کسی شخص کا لگتا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہوگیا کہ ایک صاحب عمرہ کرکے آئے اور مسجد میں قصداً نمازیوں کے آگے سے گذرنا شروع کردیا جب اعتراض کیا گیا تو کہنے لگے کہ "مسجد حرام" مکہ شریف اور "مسجد نبوی" مدینہ منورہ میں بھی لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں پھر بھی لوگ ان کے آگے سے گذرتے ہیں میں نے اپنے معتبر سنی عالم کو بھی وہاں نمازیوں کے آگے سے گذرتے ہوئے دیکھا۔ جب وہاں مسجد میں نمازیوں کے آگے سے گذر سکتے ہیں تو یہاں کیوں نہیں؟ اب اس بیچارے کو کیا معلوم کہ وہاں مسجد کبیر کی وجہ سے حکم الگ ہے اور یہاں الگ۔

اب استفاضہ کی یہ دلیل پڑھ کر لگتا ہے کہ اس شخص کا بھی اس معاملے میں مقام ومرتبہ کوئی کم نہیں ہے اس نے تو نمازی کے آگے گذرنے کو نمازی کے آگے گذرنے پر ہی قیاس کیا وہ تو بظاہر ایک ہی سے لگ رہے تھے بیچارہ عام، سادہ انسان تھا اس کو مسجد صغیر وکبیر کا کیا علم؟

لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے یہاں تو فقہ وفتاوے کے علم بردار، تحقیقات وتنقیحات کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، دلائل و براہین کے گولے داغنے والے ہیں تو حیرت تو ہوگی ہی کہ چاند کو ثابت کرنے کے لیے کیسا قیاس کیا جارہا ہے؟ کہ علما دینی مسائل میں رہنمائی کرتے ہیں لوگ اس پر عمل کرتے ہیں، اعتماد کرتے ہیں، چاند بھی دینی مسئلہ تو یہی علما اگر چاند کی گواہی دیں گے تو کیوں معتبر نہیں ہوگی۔

کیا دلیل دینے والے مفتی صاحب کے لیے یہ دونوں باتیں ایک برابر ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ دونوں میں اگر کوئی بھی سوجھ بوجھ والا غور وفکر کرے تو فرق سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

دینی مسئلہ تو کسی ایک معتمد عالم دین سے معلوم کرلے تو اس کو مان کر عمل کرنا درست ہے لیکن اگر چاند ثابت نہ ہوا تو عیدین وغیرہ کے لیے صرف ایک عالم کا چاند کی خبر دینا چاند کو ثابت کردے گا؟ حالاں کہ موصوف کے بقول 'دینی معاملہ وہ بھی ہے اور دینی معاملہ یہ بھی'۔

دارالافتا سے ایک شخص دوسرے شہر یا دوسرے ملک کو فتویٰ لے کر گیا لوگوں کا اس پر عمل کرنا درست پھر اگر دارالافتا سے ایک شخص دوسرے شہر یا دوسرے ملک چاند کی شہادت کے متعلق لکھوا کر لے جائے تو کیا اس چاند کا ثبوت ہوجائے گا؟ حالاں کہ موصوف کے بقول دینی معاملہ وہ بھی ہے اور دینی معاملہ یہ بھی۔

دارالافتا کو بذریعہ ڈاک کوئی سوال دوسرے شہر یا دوسرے ملک سے بھیجا، ڈاک کے ذریعہ ہی دارالافتا سے اس ملک یا شہر کو فتویٰ آگیا، اگر کوئی وجہ شرعی نہ ہو تو وہ قابل عمل ہے، لیکن اگر اسی دارالافتا سے بذریعہ ڈاک چاند کی خبر بھی لکھ کر بھیج دی تو کیا اس سے چاند کا ثبوت ہوجائے گا؟ حالاں کہ موصوف کے بقول دینی معاملہ وہ بھی ہے اور دینی معاملہ یہ بھی۔

[اس کے صحیح ہونے کی تحقیق ہو یہ ہمارے عالم ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں، یہ فون پر ہم کو بتا رہے ہیں کہ حضرت میں نے خود اپنی

آنکھوں سے آج مغرب کی نماز پڑھ کے نکلا تو رمضان کا چاند دیکھا، میں کیسے کہہ دوں کہ مولانا جھوٹ بول رہے ہیں.... الخ"]

واہ! ایسی بے مثال اور انوکھی دلیل چاند کے ثبوت کے لیے کتب فقہ و فتاوے میں تلاش کیجیے کہیں نہیں مل سکتی ہے کہ موصوف مولانا صاحب اور حاجی صاحب کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے اور بلا وجہ شرعی جھوٹا کہنا بھی نہیں چاہیے مگر یہ کس جگہ سے ثابت ہوا کہ جس خبر کو آپ جھوٹا نہ کہہ سکیں وہ چاند کے ثبوت کے لیے بھی کافی ہوگی، کسی کی خبر کو سچا کہنا الگ بات ہے لیکن اس سے چاند کا ثابت ہونا الگ۔

["تو استفاضہ کے لیے خبر کا صحیح ہونا ضروری ہے اور یہ علما جب خبر دیتے ہیں تو ہم مانتے ہیں کہ یہ لوگ صحیح بول رہے ہیں۔ لیکن ایک احتمال کذب کا بھی ہے۔ آخر یہ خبر ہے اور خبر جھوٹی بھی ہوسکتی ہے۔ اس جھوٹ کے احتمال کو دور کرنے کے لیے کثرت چاہیے۔ ہم کو میسور سے چار پانچ لوگوں نے فون پر خبر دی، اسی طور پر کلکتہ سے خبر دے دی، گجرات سے، کرناٹک سے، یوپی کے مختلف اضلاع سے، بہار سے خبر دے دی، جھارکھنڈ سے خبر دے دی۔ اب ہمارے پاس چودہ، پندرہ یا اس سے زیادہ قابل اعتماد، ثقہ لوگوں کی طرف سے خود چاند دیکھنے کی خبریں آ گئیں اور اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا کہ اتنے کثیر اور ذمہ دار لوگ مختلف مقامات سے تقریباً وقت واحد میں بمضمون واحد خبر دے رہے ہیں تو وہ ضرور سچے اور ان کی خبر ضرور سچی و درست ہے۔ لہٰذا ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ استفاضہ ہو گیا۔ اور جب استفاضہ ہو گیا تو چاند ثابت ہو گیا۔"] (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟، ص: ۳۱، ۳۲، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

استفاضہ کے لیے صرف بولنا، خبر دینا کافی نہیں ہے بلکہ استفاضہ کے لیے وہ خبر درکار ہے کہ جسے شہادت سے تعبیر کر سکیں وارث علوم اعلیٰ حضرت تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"صورت استفاضہ میں بھی یہ لازم ہے کہ مخبرین قاضی کے یہاں اپنی رویت کی شہادت دیں۔ (۱) یا دوسروں کی شہادت پر شاہد ہوں کیا ایسی خبر رنگ شہادت سے جدا ہوسکتی ہے؟ اور جب رنگ شہادت سے جدا نہیں ہوسکتی تو کیا کسی زمانے میں بھی دستور شہادت بدلا جا سکتا ہے؟ نہیں، تو اعلیٰ حضرت کے زمانے اور اس زمانے کا فرق کیا معنی؟ اور اس تفرقہ پر بنا کیا مفید؟ اور اس تفرقہ کے لیے کون سی ضرورت داعی؟ (۲) اب جیسے رمضان میں خبر واحد کی ادائیگی میں لفظ "اشھد" کہنا شرط نہیں مگر پھر بھی ایک نکتے کے لحاظ سے خبر واحد کو مجازاً شہادت سے تعبیر کیا اسی طرح خبر مستفیض میں بدرجہ اولی لفظ "أشھد" شرط نہیں مگر اسی نکتے کے لحاظ سے یہاں بھی "حتی لو شھد" کہا وہ نکتہ کیا ہے یہی کہ مخبر کو ادائے خبر کے لیے شہود عند القاضی سے مفر نہیں تو یہ خبر کیا بالکلیہ شہادت سے جدا ہے یا رنگ شہادت لیے ہوئے ہے اور خبر مستفیض میں بھی استفاضہ کیا یونہی ہو جائے گا ہر گز نہیں بلکہ ضروری ہے کہ مخبرین اپنی رویت کی بیک زبان خبر دیں یا اس شہر والوں کی رویت پر شہادت ادا کریں تا کہ یہ خبر مجرد حکایت نہ ٹھہرے اس پر عالمگیری کے جزئیہ کا اخیر فقرہ "لأنھم لم یشھدوا بالرؤیة ولا علی شھادة غیرھم وانما حکوا رؤیة غیرھم" کیا یہ شہادت نہیں دے رہا ہے کہ مجرد خبر معتبر نہیں بلکہ وہ خبر معتبر ہے جسے شہادت سے تعبیر کر سکیں کیا محل خبر میں شہادت بولنا بے محل و بے فائدہ ہے پھر بمناسبت مقام یہاں ایک سوال فائدے سے خالی نہیں اگرچہ اس میں کسی قدر گذشتہ کی تکرار ہے۔ سوال یہ ہے کہ عالمگیری کے جزئیے میں لو شھد جماعة أن اھل بلدة قد رأو ھلال رمضان قبلکم بیوم ،الخ" آپ کی تقریر کی روشنی میں قطعاً خبر مستفیض ہے کہ چند افراد کی خبر ہے۔ پھر کیوں فرمایا "لا یباح فطر غد الخ حالانکہ اس جگہ خبر مستفیض بلفظ "شھد" ادا ہوئی، اب وہی سوال لوٹ کے آیا کہ خبر مستفیض میں بھی استفاضہ کیا یوں ہی ہو جائیگا؟ کیا اس سے نہ کھلا کہ استفاضے سے مراد مجرد استفاضہ واشتہار نہیں بلکہ استفاضۂ شرعیہ مراد ہے جس کی رو سے خبر میں شہادت کی طرح معنی الزام ہو جہاں "أخبر" کی جگہ "شھد" بولنا صحیح ہو اس جگہ جماعت مخبرین کی بہ نسبت "شھد" کہا گیا، پھر کیوں ان کی خبر پر عید کرنا

حلال نہ ہوا اسی لئے نا کہ یہاں خبر مجرد خبر ہے محض حکایت ہے، چنانچہ کہا "لأنهم لم يشهدوا بالرؤية ولا على شهادة غيرهم وانما حكوا رؤية غيرهم "اور حکایت میں معنیٰ الزام نہیں، لہٰذا ایسی خبر مخملہ طرق موجبہ نہیں، اگر چہ بلفظ شہادت ادا کی جائے پھر سوال ہے کہ مخبرین اگر بیک زبان خود اپنی آنکھ سے چاند دیکھنا بیان کریں مانا جائے گا اور لفظ "اشهد " کہنا شرط نہ ہوگا لیکن ذرا محل تاویل میں "ولم يشهدوا على شهادة غيرهم " کے تیور دیکھ کے بتائیے کہ اگر مخبرین اس شہر والوں کی شہادت پر شہادت نہ دیں بلکہ یوں بیان کریں کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا ہے اس پر جملہ سابقہ "لو شهد جماعة ان اهل بلدة قد رأو هلال رمضان قبلكم بيوم " صادق ہے جس پر یہ فرمایا "لا يباح فطر غد " یہ دوسری صورت بھی خبر مستفیض کی ہے، جزئیہ دیکھ کر بتایا جائے کیا یہاں جماعت کثیرہ کا مطلق بیان کافی ہے یا ان کی شہادت سے کام چل جائے گا یا شہادت علی الشہادت کی شرط ہے؟ کیا اب بھی نہ کھلا کہ استفاضہ شرعیہ بالکلیہ شہادت سے جدا نہیں ، هكذا ينبغي ان تفهم كلماتهم والله الموفق يفهم من يشاء "۔(جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کی شرعی حیثیت، ص:۵۰، تا ص:۵۲، امام احمد رضا ویلفیئر ٹرسٹ، چھپرہ، بہار)

استفاضۂ شرعیہ کے متعلق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری اور دیگر فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کی تصریحات پیچھے گزر چکی ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ استفاضہ کے تعلق سے مندرجہ ذیل امور کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں۔

موبائل اور ٹیلیفون کی خبر استفاضہ کیسے ہو جائے گی؟ جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا ہے متعدد جماعتیں تو بہت دور کی بات ایک جماعت بھی نہیں بلکہ جماعت بھی بہت دور فرد واحد بھی نہیں آیا۔

(۲) متعدد جماعتیں آکر سب یک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بر بنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی۔

موبائل اور ٹیلیفون کی خبر میں جو خبر دینے والا ہے وہ فرد واحد ہے جماعت نہیں۔

(۳) موبائل اور ٹیلیفون پر خبر دینے والا جہاں سے بول رہا ہے وہاں قاضیِ شرع تو ہے نہیں کوئی مفتیِ اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ احکامِ روزہ وعیدین اُسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہوں عوام کالانعام بطور خود عید ورمضان نہیں ٹھہرا لیتے ہوں، ہے بھی یا نہیں یہ بھی محل نظر ہے۔ یا اگر حاکم شرع نہیں بھی ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہاں سے جماعات کثیرہ آکر یہ بیان بالاتفاق دیں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ چاند دیکھنا بیان کرتے تھے۔ یہاں ان امور سے کچھ بھی نہیں پایا گیا۔

(۴) استفاضہ کے تحقق کے لیے وہ خبر درکار ہے کہ جس کو شہادت سے تعبیر کرسکیں، فون پر خبر دینے والے قاضی وحاجی اور مولانا ومفتی کی خبر کو شہادت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

اب چاند دیکھنے والے قاضی، حاجی، مولانا، مفتی وغیرہ کے بیانات اور ان کی خبریں دور دراز مقامات سے موبائل فون وغیرہ آلات مواصلات وترسیل کے ذریعے اگر چہ ان سے یقین حاصل ہو جائے لیکن یہ یقین ثبوت رویت ہلال کے لیے کافی نہیں ہے۔

اولاً: اس وجہ سے کہ یہ پس پردہ آواز ہے اس لیے یہ شہادت تو ہو ہی نہیں سکتی۔

ثانیاً: استفاضہ کے اس میں شرائط متحقق نہیں ہیں تو استفاضہ بھی نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا جو یقین فون پر چاند کی خبر دینے والے قاضیوں، حاجیوں، مفتیوں اور عالموں وغیرہ کے بیانات سے حاصل ہوا ہے وہ یقین عرفی ہے یہ یقین چاند کے معاملے میں مقبول ومعتبر نہیں ہے کیوں کہ ثبوت ہلال کے لیے یہ عرفی یقین کافی نہیں بلکہ وہ طریقہ درکار ہے جو شریعت مطہرہ نے بتایا ہے۔ موبائل وٹیلی فون مع اپنے تمام وسائط کے مظان شرعیہ میں داخل نہیں ہے، پس اس سے حاصل ہونے والا غلبۂ ظن مفید نہیں، یہ غلبۂ ظن چاہے کسی ایک طریقے سے حاصل ہوا ہو یا متعدد

طرق سے۔

یہ خبر اگر چہ بظاہر ایک مخبر معلوم متعین کی جانب سے حاصل ہوئی ہے، لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہے کیوں کہ مخبر کے تبدل کا احتمال موجود ہے تو یہ صورت مجرد شیوع میں داخل مانی جائے گی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"مگر حاشا مجرد شیوع وشہرت کافی نہیں کہ صدہا خبریں خصوصاً آج کل ایسی اڑتی ہیں جن کا تمام شہر میں چرچا ہوتا ہے، پھر تجربہ گواہ ہے کہ بعد تنقیح محض بے اصل نکلتی ہیں انہیں افواہ کہتے ہیں، نہ استفاضہ شرعیہ، ولہٰذا علما تصریح فرماتے ہیں کہ ایسا چرچا محض نامعتبر جب تک ثبوت شرعی نہ ہو"۔ (فتاویٰ رضویہ مترجم، ج:۱۰، ص: ۴۳۳، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

["صدر الشریعہ، بدر الطریقہ حضرت مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے اس بارے میں یہ صراحت کی ہے:

ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبریں اس باب میں ناقابل اعتبار ہیں کہ ان سے کسی چیز کا ثبوت شرعی نہیں ہوتا۔ (فتاویٰ امجدیہ ج:۱، ص: ۳۹۴، کتاب الصوم)

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ خبریں نہ شہادت ہیں، نہ استفاضہ۔ صدر الشریعہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ ٹیلی فون سے خبر استفاضہ کا تحقق نہیں ہوگا بلکہ یہ بتا رہے ہیں کہ جس طور پر خبریں آتی ہیں وہ ثبوت شرعی نہیں کہ وہ خبر محض ہیں۔" (موبائل سے استفاضۂ خبر کب اور کیسے؟ ص: ۳۴، ۳۵، جامعہ قادریہ، پونہ، مہاراشٹر)

یہ اقتباس اس وجہ سے نقل کیا گیا کہ حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے سوال ہی یہی کیا گیا تھا کہ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی گراف اور وائرلیس فقہی نقطۂ نظر سے ان کو دعوی شہادت باقتضائے قاضی اور خبر مستفیض کی کس شق میں داخل سمجھا جا سکتا ہے؟

تو آپ نے اس کے جواب میں صاف اور صریح الفاظ میں تحریر فرمایا کہ ٹیلیفون وغیرہ کو استفاضہ میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف نے حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی عبارت کا ذکر کیا لیکن استفاضے والی عبارت کو چھوڑ دی پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"ٹیلیفون، ریڈیو کی خبریں اس باب میں ناقابل اعتبار ہیں کہ ان سے کسی چیز کا ثبوت شرعی نہیں ہوتا ایسی خبروں سے نہ روزہ رکھا جائے گا نہ عید کی جائے گی، ان خبروں کو نہ شہادت شمار کیا جا سکتا ہے نہ ان کو استفاضہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔

(فتاویٰ امجدیہ، ج:۱، ص: ۳۹۴، قادری کتاب گھر، بریلی شریف)

صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی عبارت کی تشریح کی حاجت نہیں ہے وہ صریح ہے اسے بیان کرنے کے لیے کہ ٹیلیفون وغیرہ جدید آلات کے ذریعہ استفاضہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن موصوف کی یہ خوبی ہے کہ بزرگوں کے اقوال کی ایسی توضیح کرتے ہیں جو ان کی مراد ہی نہیں ہوتی ہے قارئین اسے پڑھ کر موصوف کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ موصوف اپنے دعویٰ ثابت کرنے کے لیے بزرگوں کی عبارات کا مطلب ومقصد توڑ مروڑ کر کیسے پیش کر دیتے ہیں؟

مخالفت جمہور اور ایجاد امور کے نام کو تحقیق نہیں کہا جا سکتا ہے اور خاص کر جدید غیر شرعی استفاضہ جو استفاضۂ شرعی ثابت کر رہے ہیں یہ ہرگز تحقیق جدید نہیں ہے بلکہ اس استفاضہ کا احیا اور تجدید ہے جس استفاضہ کا اختراع دہائیوں قبل دیوبندیوں نے کیا تھا۔

اس کے علاوہ جن دو لوگوں کی آپ نے تحریریں بھیجی ہیں ان کا جواب بھی اسی میں ہو چکا ہے جو مزید تحقیق کا خواہش مند ہو وہ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی تصنیف "جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کی شرعی حیثیت" کی طرف رجوع کرے۔

جن لوگوں نے موبائل وغیرہ کی خبر سے استفاضہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اس کے ثبوت کے لیے غلط طریقے سے اعلیٰ حضرت یا حضور صدر الشریعہ اور دیگر بزرگان دین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کے نام کو دھوکہ دہی کے لیے استعمال کیا ہے ان کے پاس اپنے دعوے کے ثبوت پر ایک بھی قابل قبول دلیل نہیں ہے کیوں کہ فقہائے متقدمین و متاخرین کی تصریحات سے یہ ثابت ہے استفاضہ کے تحقق کے لیے مخبرین کی جماعت کا دوسرے شہر میں قاضی کے سامنے ہونا ضروری

ہے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

”یہی وجہ ہے کہ علامہ رحمتی نے استفاضہ کی وہ تعریف کی جس کی رو سے جماعت مخبرین کا دوسرے شہر میں قاضی کے روبرو حاضر ہونا ضروری ہے، جن حضرات نے استفاضے کی دوسری قسم کی نشاندہی کی جس کی رو سے قاضی کے حضور حاضر ہونے کی اتفاقی شرط اُٹھ گئی، ان پر لازم ہے کہ قرآن وسنت سے یا کم از کم فقہ کی کتب معتمدہ سے اس صورت جدیدہ کا استثنا مبرہن کریں، دلیل لائیں تاکہ اس میں نظر کی جائے اور اگر اس پر کوئی دلیل نہیں رکھتے تو بتائیں کہ آپ حضرات نے از روئے تقلید التزام مذہب معین کا عہد کیا یا نہیں؟ تقلید مذہب معین سے یہ عہد ضرور لگا بندھا ہے، اس کی رو سے کیا آپ پر لازم نہیں کہ قول راجح ہی پر عمل کریں اور اسی کو مذہب جانیں؟ ضرور لازم ہے، اسی لئے ماوشما کس گنتی میں؟ لہٰذا قول راجح سے عدول، **عدول عن المذهب** ہے جسکی اجازت صلاحیت ترجیح سے عاطل نرے مقلدین کو نہیں ہوسکتی جیسا کہ عبارات مندرجہ بالا سے ظاہر ہے۔ جب قول راجح سے عدول کے سلسلے میں علما کی یہ کچھ تصریحیں ہیں تو ایسے مسئلے سے عدول کا کیا حال ہوگا جس کے خلاف کوئی قول مرجوح بھی منقول نہیں۔ **ومن ادعی فعلیه البیان**، بہر حال یہ سوال ہے کہ استفاضے کی دوسری قسم کی راہ ائمہ ہدی نے دکھائی یا محض ہوی نے یہ ہوا دکھائی“۔ ملخصاً۔ (جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کی شرعی حیثیت، ص: ۳۷، امام احمد رضا ویلفیئر ٹرسٹ، چھپرہ، بہار)

لہٰذا قدیم وجدید فقہائے اہل سنت کا یہ مذہب ہے کہ جدید آلاتِ مواصلات وترسیل ٹیلیفون، موبائل، وہاٹس ایپ، ٹیلیگرام، ای میل، فیس بوک وغیرہ سوشل سائٹس کے ذریعہ ثبوت رویت ہلال نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

□□□□

تلاوتِ قرآن: روحانی قرار

تلاوتِ قرآن محض الفاظ کی ادائیگی نہیں، یہ دل کی دھڑکنوں کا ذکرِ الٰہی سے ہم آہنگ ہو جانا ہے۔ یہ وہ نور ہے جو اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے، وہ نسیمِ سحر ہے جو پژمردہ روحوں کو تازگی عطا کرتی ہے۔ قرآن مجید کلامِ ربِّ ذوالجلال ہے، اس کی تلاوت بندے کو اپنے رب سے ہم کلامی کا شرف بخشتی ہے۔ جب زبان آیاتِ الٰہی سے تر ہوتی ہے تو دل کی ویرانیاں آباد ہو جاتی ہیں، فکر کو جلا ملتی ہے اور کردار کو استقامت نصیب ہوتی ہے۔ تلاوت کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ یہ انسان کے باطن کی اصلاح کرتی ہے۔ یہ محاسبۂ نفس کی دعوت دیتی ہے، گناہوں پہ ندامت پیدا کرتی ہے اور اطاعتِ الٰہی کا شوق بیدار کرتی ہے۔ قرآن پڑھنے والا محض قاری نہیں رہتا، وہ حاملِ پیغام بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں نظم پیدا ہوتا ہے، اخلاق میں نرمی اور معاملات میں دیانت جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جو فرد کو صالح اور معاشرے کو فلاح کی راہ دکھاتی ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں تلاوتِ قرآن کے بے شمار فضائل وارد ہوئے ہیں، ہر حرف پہ دس نیکیوں کی بشارت دل کو شوق سے بھر دیتی ہے۔ مگر اصل کمال یہ ہے کہ تلاوت تدبر کے ساتھ ہو، دل کی حضوری کے ساتھ ہو تاکہ آیات محض زبان سے نہ گذریں بلکہ دل پہ نقش ہو جائیں۔ جب قرآن زندگی کا دستور بن جائے تو فکر میں اعتدال، نظر میں بصیرت اور عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

آیئے! ہم تلاوتِ قرآن کو اپنی روز مرہ زندگی کا حصہ بنائیں۔ گھروں میں اس کی صدائیں گونجیں، بچوں کے لب اس نور سے آشنا ہوں اور ہمارے شب و روز اس کلامِ مقدس کی برکتوں سے معطر رہیں۔ یہی وہ چراغ ہے جو دنیا میں سکون اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہے۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

میں آئینہ ہوں، چہرہ نہیں

ایک فکری لغزش کا محاسبہ

تاریخ محض گذرے ہوئے واقعات کا بے جان دفتر نہیں ہوتی بلکہ وہ اقوام کے فکری تشخص، دینی مزاج اور اجتماعی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جو قومیں اپنے ماضی کو سنبھال کر رکھتی ہیں، وہی حال کے طوفانوں میں بھی اپنی سمت متعین رکھتی ہیں اور جو اپنے اسلاف کی روشن روایتوں سے آنکھیں چرا لیں وہ رفتہ رفتہ فکری انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً اہلِ سنّت کی تاریخ تو محض اقتدار و سیاست کی کہانی نہیں بلکہ عدل، تقویٰ، شریعت پسندی اور علمی دیانت کی ایک مسلسل روایت ہے، جس کے ہر ورق پر ذمہ داری کا احساس اور جواب دہی کی روشنی جھلکتی ہے۔

مذہبی منبر اور ملّی اجتماعات اسی روایت کے امین ہوتے ہیں۔ یہاں ادا ہونے والا ہر لفظ صرف ایک آواز نہیں بلکہ ایک مسلک کی ترجمانی اور ایک نسل کی فکری تربیت کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم نے ہمیشہ کلام سے پہلے میزانِ احتیاط کو لازم پکڑا اور تاریخ و عقائد کے معاملات میں غیر محتاط جملوں کو فتنے کا دروازہ قرار دیا۔ کیونکہ بعض اوقات ایک لمحے کی لغزش صدیوں کی محنت سے تشکیل پانے والے فکری اعتماد کو مجروح کر دیتی ہے۔

زیرِ نظر تحریر بھی اسی احساسِ ذمہ داری کا عکس ہے۔ اس کا مقصد نہ کسی فرد کو ہدفِ تنقید بنانا ہے اور نہ کسی نام کو موضوعِ نزاع بلکہ ان افکار و رجانات کا محاسبہ کرنا ہے جو وقتی مصلحت یا سیاسی فضا کے زیرِ اثر اہلِ سنّت کی مسلمہ تاریخ اور درخشاں شخصیات کے بارے میں ابہام پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک فکری مکالمہ ہے--- آئینہ دکھانے کی کوشش--- تاکہ چہرے سنوریں، داغ نہیں چھپیں اور روایتِ حق اپنی اصل آب و تاب کے ساتھ باقی رہے۔ ع

میں آئینہ ہوں تراخ بیان کردوں گا

یہ مصرعہ صرف ایک ادبی موزوں جملہ نہیں بلکہ فکری دیانت کا اظہار و اعلان ہے۔ آئینہ نہ دشمن ہوتا ہے نہ دوست، وہ تو بس حقیقت دکھاتا ہے۔ اصل مسئلہ چہرے پر موجود داغ کا ہوتا ہے، جسے دیکھنے کی ہمت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ یہی اصول قوموں کی فکری زندگی میں بھی کارفرما ہوتا ہے جہاں بعض بیانات وقتی مصلحت کے تحت دیے جاتے ہیں مگر ان کی بازگشت دیرپا اضطراب اور بدنامی کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے جملے لمحاتی فائدہ تو دے سکتے ہیں مگر ان کے اثرات قوم کے فکری اعصاب پر دیر تک لرزہ طاری رکھتے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ وہی الفاظ دلیل نہیں بنتے بلکہ سوال بن کر لوٹتے ہیں اور بولنے والے کے نہیں بلکہ ملت کی پوری پاکیزہ روایات کے وقار کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ تاریخ نے بارہا دیکھا ہے کہ مصلحت کی زبان خاموش ہو جاتی ہے مگر اس کے پیدا کیے ہوئے زخم نسلوں تک رسنے لگتے ہیں اور پھر ان کی تلافی محض وضاحت سے نہیں بلکہ فکری رجوع اور اخلاقی جرأت سے ہوتی ہے۔

دینی و ملّی اجتماعات وہ مقدس منبر ہیں جہاں الفاظ عبادت کی طرح ناپ تول کر ادا کیے جاتے ہیں۔ یہاں کہی گئی ہر بات صرف ایک فرد کی نہیں رہتی بلکہ ایک مسلک، ایک روایت اور ایک تاریخ کی نمائندگی بن جاتی ہے۔ اسی لیے اس مقام پر لغزش محض ذاتی نہیں رہتی

بلکہ اجتماعی فکر میں شگاف ڈال دیتی ہے۔ منبر سے اٹھنے والی آواز اگر احتیاط اور ذمہ داری سے خالی ہو تو وہ رہنمائی کی بجائے انتشار کا سبب بن جاتی ہے اور اعتماد کی وہ فضا مجروح ہو جاتی ہے جسے ہمارے پاک طینت اسلاف نے صدیوں کی محنت سے قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منبر کا ہر جملہ ضمیر کی عدالت سے گذر کر نکلتا ہے کیونکہ یہاں زبان کی خطا پوری امت کے وقار پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ایسے میں اگر کسی بیان سے اہلِ سنّت کے مسلمہ تاریخی شعور پہ ضرب پڑے تو خاموشی جرم بن جاتی ہے اور تنقید اصلاح کا فریضہ قرار پاتی ہے۔

برصغیر کی اسلامی تاریخ میں بعض شخصیات محض حکمران نہیں رہیں بلکہ دینی احیا، شریعت کی بالادستی اور اخلاقی تطہیر کی علامت بن کر ابھریں۔ وہ تخت و تاج کی اسیر نہیں رہیں بلکہ کردار و تقویٰ کی قوت سے بادشاہ نہیں، محیِ دین بن گئیں۔ ان کی حکومت کی اساس طاقت یا سیاست نہیں تھی بلکہ خوفِ خدا، عدلِ اجتماعی اور دینی ذمہ داری کا شعور تھا۔ انہوں نے اقتدار کو امتیاز نہیں، امانت سمجھا اور سلطنت کو ذاتی خواہش کی جگہ شریعت و ملت کی خدمت کا وسیلہ بنایا۔ اسی لیے ان کا ذکر تاریخ میں محض فتوحات کے باب میں نہیں بلکہ اصلاحِ معاشرہ، احیائے دین اور اخلاقی بالادستی کے عنوان سے محفوظ ہے۔

ان میں وہ نام بھی شامل ہیں جنہوں نے اقتدار کو عیش نہیں بلکہ ذمہ داری سمجھا، جن کے ہاتھ میں تاج تھا مگر دل میں خوفِ خدا، جن کے دربار میں جاہ و جلال نہیں بلکہ فقہ و فتوے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ ایسے افراد کو تاریخ نے محض بادشاہ نہیں بلکہ محیِ دین کے لقب سے یاد کیا۔ ان کے فیصلوں میں نفس کی آمیزش نہیں بلکہ شریعت کی میزان کارفرما تھی اور ان کی خاموشی بھی وعظ و نصیحت کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں جیتے تھے بلکہ دین کے وقار اور ملت کی امانت کے لیے زندہ رہے۔ اسی لیے وقت کی گرد ان کے نام کو ماند نہ کر سکی اور تاریخ نے انہیں اقتدار کے صفحات سے اٹھا کر اصول و اقدار کے باب میں ثبت کر دیا۔

وہ عہد جب اخلاقی زوال، توہم پرستی، بے دینی، شراب و جوا، ناجائز محاصل اور فحاشی معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے، جب اقدار کی دیواریں لرزاں اور کردار کی بنیادیں کمزور ہو چکی تھیں--- ایسے نازک اور تاریک ماحول میں اصلاح کی ایک مضبوط صدا بلند ہوئی۔ یہ صدا محض وعظ تک محدود نہ رہی بلکہ نظام میں سرایت کر گئی، قانون کو اخلاق کا پابند بنایا اور اقتدار کو شریعت کے تابع کر دیا۔ بکھرتی ہوئی معاشرت کو ضبطِ نفس، عدلِ اجتماعی اور دینی شعور کے سہارے از سرِ نو استوار کیا گیا یہاں تک کہ ظلم کا بازار سرد پڑ گیا اور اصلاح محض خواہش نہیں بلکہ عملی حقیقت بن گئی۔

اُس نازک وقت میں ایک مضبوط ہاتھ نے شریعت کا علم بلند کیا۔ گانے بجانے اور لہو و لعب کے سرکاری سرپرستی یافتہ مظاہر بند کیے گئے، غیر اسلامی رسومات پر قدغن لگی، اکبر کے نام نہاد دین الٰہی کے پھیلنے والے فتنوں کا سد باب ہوا، محتسبِ شرعی کا نظام قائم ہوا، مساجد کو ناجائز قبضوں سے آزاد کرایا گیا، قمری تقویم کو رواج ملا اور فقہِ حنفی کے عظیم ذخیرے ''فتاویٰ عالمگیری'' کی تدوین عمل میں آئی--- جو آج بھی عالمِ اسلام میں عدل و شریعت کا مستند حوالہ ہے۔ یہ اقدامات وقتی جوش یا نمائشی اصلاح نہیں تھے بلکہ ایک ہمہ گیر دینی وژن کا اظہار تھے، جس میں ریاست بھی جواب دہ تھی اور فرد بھی۔ اقتدار کو شریعت کے تابع کر کے یہ پیغام دیا گیا کہ قانون طاقت سے نہیں بلکہ اصول سے چلتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر تاریخ نے اس عہد کو اصلاح و احیا کے سنہرے دور کے طور پر محفوظ کر لیا۔

ایسی روشن، درخشاں اور بے غبار تاریخ کے ہوتے ہوئے اگر کسی دینی منبر سے اس پاکیزہ اور بے داغ دینی روایت کے تئیں بے اعتنائی کا اظہار ہونے لگے اور کوئی فرد جو انتہائی ذمہ دار منصب پر فائز ہو یہ جسارت کر بیٹھے کہ ایک شریعت پسند، دین دوست، مجددِ دوراں اور عدل شعار فرماں روا ہمارے لیے معیار نہیں، ہم انہیں اپنا رول ماڈل تسلیم نہیں کرتے--- تو معاملہ محض ایک جملے یا ایک رائے تک محدود نہیں رہتا۔ یہاں سوال کسی فرد کے ذوق یا اس کی پسند و ناپسند کا نہیں بلکہ اُس فکر کا ہے جو دینی منبر کو فکری تجربہ گاہ اور تاریخ کو وقتی مصلحت کا ایندھن سمجھنے لگی ہے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کسی نام کو نشانہ بنایا جائے بلکہ یہ ہے کہ فکر کی سمت درست کی جائے۔ کیونکہ جب منبر سے اٹھنے والی آواز تاریخ کے آئینے میں دھندلا عکس بن جائے تو خاموشی جرم اور سوال اٹھانا عین وفاداری بن جاتا ہے۔ دینی اجتماعات کا مقصد افراد کی نمود نہیں بلکہ مسلک کی

تاریخ، اس کے اکابر کی امانت اور اس کے فکری تسلسل کی حفاظت ہوتا ہے۔ اگر ذاتی رجحانات کو مسلکی تاریخ پہ فوقیت دی جائے تو، روایات کا تسلسل منقطع ہوتا ہے، اکابر کی امانت مجروح ہوتی ہے، اجتماعیت انفرادیت کی شکار ہو جاتی ہے۔

اہلِ سنت کے مسلکی ڈھانچے کو دیکھیں تو ہمیں امام احمد رضا قادری بریلوی کی حیاتِ مبارکہ میں یہی اصول ملتا ہے کہ شخصیت کو مسلک پہ نہیں بلکہ مسلک کو شخصیت پہ معیار بنایا جائے۔

اسی طرح اکابرِ اہلِ سنت کی مجالس میں انفرادی ذوق کو ہمیشہ اجتماعی وراثت کے تابع رکھا گیا، نہ کہ اس کے بالمقابل۔ دینی اجتماعات میں ذاتی رجحانات اور وقتی سیاسی فضا کے دباؤ میں آکر ان مسلمہ حقائق سے کنارہ کشی اختیار کرنا مسلک کی تاریخ پہ فوقیت دینا جن پہ اہلِ سنّت کا فکری تشخص قائم ہے نہ حکمت ہے، نہ امانت داری۔

دینی منبر ذاتی احساسات کے اظہار کی جگہ نہیں ہوتا، نہ ہی یہ سیاسی تماشہ گری کا وہ اسٹیج ہے جہاں تاریخ کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی آزادی حاصل ہو۔ یہاں کہی گئی ہر بات حق وصداقت کے مسلک کی نمائندہ اور ایک بے داغ روایت کی امین ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی زبان، شعور کی رہنمائی کی بجائے ابہام پیدا کرے اور مسلمہ تاریخی قدروں کو نظر انداز کرنے لگے تو یہ محض لغزش نہیں بلکہ فکری انحراف کی علامت بن جاتی ہے۔

یہ کہنا کہ فلاں عظیم دینی و تاریخی کردار ہمارے لیے معیار نہیں--- درحقیقت اس تسلسل سے انکار ہے جو اہلِ سنّت کی شناخت کی بنیاد ہے۔ سوال یہ نہیں کہ کس کے آئیڈیل کون ہیں یا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ کن اصولوں، کن قربانیوں اور کن روشن اقدار کو ہم اجتماعی طور پر معتبر مانتے ہیں۔ اگر عدل، تقویٰ، شریعت کی بالادستی اور دینی غیرت بھی معیار نہیں رہیں تو پھر معیار آخر ہے کیا؟

یہاں تنقید نام پر نہیں بلکہ نظریے پر ہے۔ یہ سوال کسی شخصیت سے نہیں بلکہ اُس سوچ سے ہے جو تاریخ کو سہولت کے مطابق منتخب کرنا چاہتی ہے۔ اگر آج ہم نے اپنے ہی روشن اسلاف سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تو کل ہماری نسلیں ہم سے سوال کریں گی: ہماری شناخت کیا تھی؟ ہم کس روایت کے وارث تھے؟ وہ ہم سے پوچھیں گی کہ جن اقدار کی بنیاد پر ایک تہذیب نے جنم لیا تھا انہیں کن مصلحتوں کی نذر کر دیا گیا۔ وہ جاننا چاہیں گی کہ ہم نے اقتدار کے شور میں تاریخ کی صدا کیوں دبنے دی اور سہولت کی خاطر اصولوں سے دست برداری کیوں اختیار کی۔ اس وقت ہمارے پاس کہنے کو محض خاموشی ہوگی، کیونکہ جو قومیں اپنے ماضی سے نظریں چرا لیتی ہیں، انہیں مستقبل جواب نہیں دیتا بلکہ حساب مانگتا ہے۔

اہلِ سنت کی تاریخ جذباتی نعروں سے نہیں بلکہ علمی تسلسل اور فکری دیانت سے محفوظ رہی ہے۔ اس تاریخ کے ساتھ غیر محتاط کھیل، خواہ وہ کسی بھی مصلحت کے تحت ہو، بالآخر مسلکی وقار کو مجروح کرتا ہے۔ اصلاح کا تقاضا یہی ہے کہ لغزش کو لغزش مانا جائے، وضاحت کو ابہام پر ترجیح دیا جائے اور رجوع کو انا پر فوقیت دی جائے۔

کیونکہ اگر مصلح خود فکری لغزش کا شکار ہو جائے تو اصلاحِ قوم کا خواب تعبیر کیسے پائے؟ اور اگر آئینہ دکھائے گئے داغ پر ہی الزام دھرا جائے تو چہرہ کیسے سنورے؟ یہ تحریر محض احتجاج نہیں بلکہ ایک دردمند گذارش ہے--- کہ دین، تاریخ اور اہلِ سنت کے وقار کو سیاسی موسموں کی نذر نہ کیا جائے۔ خاموشی اگر کمزوری ہے تو بروقت رجوع قوت کی علامت ہے اور یہی قوت قوموں کو سرخرو رکھتی ہے۔

اہلِ سنّت کی فکری روایت کسی وقتی جذبے یا سیاسی ضرورت کی پیداوار نہیں بلکہ صدیوں کی قربانی، علمی دیانت اور دینی استقامت کا ثمرہ ہے۔ اس روایت کی حفاظت صرف کتابوں اور تذکروں سے نہیں ہوتی بلکہ زبانوں کی احتیاط، منبروں کی ذمہ داری اور افکار کی راست بازی سے ہوتی ہے۔ جب تاریخ کو سہولت کے مطابق برتا جانے لگے اور مسلمہ شخصیات کو مصلحت کے ترازو میں تولا جائے تو نقصان کسی ایک فرد کا نہیں، پورے مسلک کے وقار کا ہوتا ہے۔

یہ تحریر اسی احساسِ جواب دہی کی یاد دہانی ہے۔ مقصد یہ باور کرانا ہے کہ اختلافِ رائے اور فکری مکالمہ اپنی جگہ مگر تاریخ کے روشن میناروں کو دھندلانے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ جن نفوسِ قدسیہ نے اقتدار کو عبادت اور سلطنت کو خدمت بنا دیا، وہ ہمارے لیے محض ماضی کا حوالہ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کا معیار ہیں۔ ان سے بے نیازی دراصل اپنی فکری بنیادوں سے دست برداری کے مترادف ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ناموں کے خول سے نکل کر افکار کی تہہ میں جھانکیں اور شخصی وابستگیوں کی بجائے مسلکی امانت کو مقدم رکھیں۔ لغزش اگر ہو جائے تو رجوع اسے کمزور نہیں بلکہ معتبر بناتا ہے، خاموشی اگر فتنہ بن جائے تو وضاحت امن کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی میں خیر ہے، اسی میں وقار--- اور یہی وہ راستہ ہے جس پہ چل کر اہلِ سنّت اپنی تاریخ، اپنی شناخت اور اپنا اعتماد محفوظ رکھ سکتی ہے۔



مفتی محمد اشرف قادری
بانی وسربراہ جامعہ مدینۃ العلوم، گجرات

روزہ: روح کی بالیدگی، اخلاق کی تہذیب اور جسم کی شفا

انسان کی زندگی محض سانسوں کی آمد و رفت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل روحانی سفر ہے--- ایسا سفر جس میں ہر موڑ پہ خواہشات کی آزمائش، نفس کی سرکشی اور مادّیت کی کشش انسان کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہے مگر روزہ ان سب کے درمیان انسان کو رب کی یاد، تقویٰ اور صبر کی رہنمائی عطا کرتا ہے۔ بھوک اور پیاس کے لمحے میں انسان اپنے اندر ایک نرم گوشہ محسوس کرتا ہے جو دوسروں کی تکلیف اور ضرورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہی وہ تربیتی عمل ہے جو نفس کو لگام دیتا، دل کو ہمدرد بناتا اور ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب پیدا کرتا ہے۔ یوں روزہ انسان کی روح، اخلاق اور جسم کو نہ صرف سنوارتا ہے بلکہ اسے ایک ایسا مکمل انسان بناتا ہے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھ کر اللہ تعالیٰ کے قرب میں بلند ہوتا ہے۔

دنیا کے ان مادی ہنگاموں کے درمیان اگر کوئی عبادت انسان کو ٹھہراؤ، توازن اور باطن کی صفائی عطا کرتی ہے تو وہ روزہ ہے۔ روزہ وہ خموش عبادت ہے جس میں بندہ کسی ظاہری نمود کے بغیر صرف اپنے رب کے علم اور شعور کے سائے میں اپنے نفس کو بھوک اور پیاس کی بھٹی میں ڈال کر کندن بناتا ہے۔

ماہِ رمضان المبارک جب اپنی روحانی فضا، نورانی ساعتوں اور رحمت بھری راتوں کے ساتھ وارد ہوتا ہے تو گویا زمین و آسمان کے درمیان ایک خاص نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ فضائیں تسبیح خواں ہوتی ہیں، دل نرم پڑ جاتے ہیں اور روح اپنے اصل وطن کی طرف لوٹنے کا اشتیاق محسوس کرنے لگتی ہے۔ یہی وہ موسم ہے جب انسان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اس کی اصل پہچان محض جسم نہیں بلکہ وہ روح ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی امانت رکھی گئی ہے۔

ایسے مبارک اور پاکیزہ لمحوں میں دنیا کی چمک دمک مدھم پڑ جاتی ہے اور دل کی آنکھ کھلنے لگتی ہے۔ خواہشاتِ نفس کی تیزی آہستہ آہستہ تھمتی ہے اور بندہ اپنے باطن میں اتر کر خود سے اور اپنے رب سے مکالمہ کرنے لگتا ہے۔ سحر کی خموشی، افطار کی دعا اور شبِ رمضان کی سرگوشیاں انسان کے دل پہ یہ حقیقت ثبت کر دیتی ہیں کہ اصل زندگی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے معمور ہو۔ اس کے محبوب محمد عربی ﷺ کی محبت سے قلب و روح کا گوشہ تابناک و منور ہو۔ انھی ساعتوں میں بندہ یہ سمجھ پاتا ہے کہ عزت، سکون اور نجات کا راستہ ضبطِ نفس، اطاعتِ الٰہی اور محبت رسول ﷺ سے ہو کر گزرتا ہے اور یہی ماہ رمضان شریف کا اصل پیغام اور اس کی سب سے بڑی عطا ہے۔

روزہ انسان کو سکھاتا ہے کہ کمال صرف سیر چشمی، آسائش اور خواہشات کی تکمیل میں نہیں بلکہ اصل عظمت ضبط، صبر اور اطاعت میں ہے۔ یہ عبادت بندے کو لمحہ لمحہ یہ احساس دلاتی ہے کہ اس کا جینا، اس کا رکنا، اس کا کھانا اور اس کا رک جانا---- سب رب کے حکم کے تابع ہیں۔ بھوک کے سناٹے میں دل کی آواز بلند ہوتی ہے، پیاس کی شدت میں آنکھیں نم ہوتی ہیں اور انسان اپنے اندر ایک ایسی خموش صدا سنتا ہے جو اسے اس کے رب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان لمحوں میں نفس کی سرکشی دم توڑنے لگتی ہے اور روح جو مدتوں خواہشات کے شور میں دبی ہوئی تھی اپنے اصل جوہر کے ساتھ بیدار ہونے لگتی ہے۔ بھوک

انسان کو اس کی کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے اور پیاس اسے یہ سبق پڑھاتی ہے کہ اصل سیرابی پانی سے نہیں بلکہ ذکرِ الٰہی سے نصیب ہوتی ہے۔ یہی وہ ساعتیں ہیں جب بندہ اپنی عاجزی، اپنی احتیاج اور اپنے رب کی بے پایاں رحمت کو پہچانتا ہے اور دل کے محلات میں شکر، صبر اور رضا کے چراغ روشن ہونے لگتے ہیں۔

اور پھر انہی لمحوں میں بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

روزہ روح کی تطہیر، اخلاق کی تعمیر اور جسم کی اصلاح کا وہ جامع نسخہ ہے جس میں دین و دنیا، ظاہر و باطن اور عبادت و صحت سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان کو محض ایک عبادت گذار نہیں بلکہ ایک باکردار، باخبر اور باوقار انسان بنانے کا عمل ہے۔ روزے کی حالت میں دل میں خشیت پیدا ہوتی ہے، زبان میں احتیاط آتی ہے اور نگاہوں میں حیا کی روشنی اترتی ہے۔ یوں انسان کی شخصیت کے بکھرے ہوئے زاویے ایک ربانی نظم میں ڈھلنے لگتے ہیں اور زندگی کا ہر پہلو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے تابع ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ روزہ صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کے مزاج کو بدل دیتا ہے، دلوں میں ہمدردی جگاتا ہے اور انسان کو انسان کے قریب لے آتا ہے۔

بھوک اور پیاس کا مشترک تجربہ امیر و غریب کے درمیان قائم فاصلے کو گھٹا دیتا ہے اور دلوں میں احساسِ ذمہ داری بیدار کرتا ہے۔ صدقہ و خیرات، ایثار اور خدمتِ خلق کا جذبہ محض ایک عمل نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ احساس بن کر معاشرتی رویّوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ یوں ماہ رمضان المبارک کی روح اجتماعی زندگی میں عدل، رحمت اور بھائی چارے کی ایسی فضا قائم کرتی ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کے لیے رحمت بنا دیتی ہے۔

اسی روحانی پس منظر میں جب ہم روزے کے روحانی، اخلاقی اور طبی فوائد پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت روشن سورج کی طرح دکھائی دیتی ہے کہ روزہ محض ایک فریضہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے رحمت، تربیت اور شفا کا حسین امتزاج ہے۔

روزہ اسلامی عبادات میں ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر فریضہ ہے جو محض چند ساعتوں کے بھوکے پیاسے رہنے کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کی پوری زندگی کو ربانی نظم میں ڈھال دینے کی عملی مشق ہے۔ اس عبادت کے ذریعے بندہ سیکھتا ہے کہ خواہشات، عادات اور معمولات سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، نہ کہ نفس کی خواہش کے۔ سحر سے افطار تک کا یہ ضبطِ نفس دراصل زندگی کے ہر لمحے کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی تربیت ہے۔ روزہ انسان کو یہ شعور عطا کرتا ہے کہ اصل آزادی خواہشات کی پیروی میں نہیں بلکہ اطاعتِ الٰہی میں پوشیدہ ہے اور یہی شعور اسے ایک باوقار، متوازن اور ذمہ دار انسان بناتا ہے۔

یہ عبادت بیک وقت روحانی ارتقا، اخلاقی تہذیب اور جسمانی صحت کی ضامن ہے۔ روزہ انسان کو اپنے رب سے جوڑتا، نفس کو قابو میں لاتا اور معاشرے میں ہمدردی، مساوات اور اخوت کے چراغ روشن کرتا ہے۔ یہ بندے کے دل میں احساسِ جواب دہی بیدار کرتا ہے اور اسے ہر لمحہ اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ نفس کی خواہشات جب لگام میں آتی ہیں تو دل میں نرمی، مزاج میں اعتدال اور رویّوں میں شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ یوں روزہ فرد کے باطن کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی فضا کو بھی محبت، رواداری اور باہمی احترام کی خوشبو سے معطر کر دیتا ہے۔

ماہِ رمضان المبارک کے روزے سن 2 ہجری میں فرض ہوئے۔ قرآنِ مجید نے نہایت بلیغ اور حکیمانہ اسلوب میں روزے کی فرضیت کے ساتھ اس کا مقصد بھی بیان فرما دیا:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔)

یہ آیتِ کریمہ واضح کر دیتی ہے کہ روزے کا اصل ہدف تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی حضوری کا وہ شعور جو انسان کے ظاہر و باطن، قول و

فعل اور خلوت وجلوت سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

روحانی فوائد

روزہ انسان کو معرفتِ الٰہی کے مدارج طے کراتا ہے۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں بندہ یہ عملاً سیکھتا ہے کہ خواہشات کو حکمِ الٰہی کے تابع کیسے کیا جاتا ہے۔ سامنے لذیذ غذائیں موجود ہوں مگر ہاتھ رک جائے، پانی قریب ہو مگر لب نہ چھوئیں--- یہی وہ لمحے ہیں جہاں اطاعت محض نظریہ نہیں رہتی بلکہ زندہ عمل بن جاتی ہے۔ اس مسلسل ضبط سے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت راسخ ہوتی ہے اور بندہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اصل قوت خواہشات کی تکمیل میں نہیں بلکہ ان پہ قابو پانے میں ہے۔ یوں روزہ انسان کو بندگی کے اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں وہ اپنے رب کے حکم پہ اپنی چاہت کو قربان کرنا سیکھ لیتا ہے۔

بھوک اور پیاس کی شدت ستا رہی ہے اشیائے خورد ونوش کی فراوانیاں بھی ہیں مگر محض اس احساس کے تحت کہ اس وقت میرے رب اور اس کے محبوب ﷺ نے اجازت نہیں دی، یہ ضبطِ نفس وہ روحانی سرمایہ ہے جو کسی اور عبادت سے اس درجے میں حاصل نہیں ہوتا۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه''

(جو شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور برے کام نہ چھوڑے، تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی حاجت نہیں۔)

یہ حدیث روزے کے روحانی جوہر کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کرتی ہے کہ روزہ دراصل کردار کی تطہیر کا نام ہے۔ یہ انسان کی زبان، نگاہ اور دل تینوں کو ایک ساتھ مہذب کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر بھوک اور پیاس کے باوجود اخلاق میں سختی، لہجے میں تلخی اور رویّوں میں آلودگی باقی رہے تو روزے کی اصل روح مجروح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے روزہ بندے کو محض کھانے پینے سے نہیں روکتا بلکہ اسے ہر اس قول وفعل سے باز رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بنے اور یوں انسان کی شخصیت کو باطن سے ظاہر تک پاکیزہ بنانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا:

''روزہ صرف کھانے پینے سے رک جانے کا نام نہیں بلکہ جھوٹ، گناہوں اور لغویات سے بچنے کا نام ہے۔''

روزہ بندے کو قربِ الٰہی کی وہ دولت عطا کرتا ہے جس کا مظہر قیامُ اللیل، دعا، تلاوت اور خشیتِ قلبی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اسی کیفیت پر بشارت دی گئی: ''من قام رمضان ايماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه''

اخلاقی فوائد

روزہ اخلاقی تربیت کا عملی مدرسہ ہے۔ یہاں انسان کو وعظ سے زیادہ عمل کے ذریعے سکھایا جاتا ہے کہ ضبط، حلم اور برداشت کیا ہوتی ہے۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں جب طبیعت میں تیزی پیدا ہو تو زبان روک لینا، غصے کے موقع پہ خموشی اختیار کرنا اور ایذا کے جواب میں صبر کا دامن تھامنا--- یہ سب روزے کے وہ اسباق ہیں جو کردار کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ یوں روزہ انسان کو ایک ایسے اخلاقی سانچے میں ڈھال دیتا ہے جس میں شائستگی، وقار اور رحم دلی فطری اوصاف بن جاتے ہیں۔

یہ انسان کو جھوٹ، غیبت، چغلی، بدکلامی اور بدنگاہی سے بچنے کی مشق کراتا ہے۔ روزہ دار جب اپنی زبان، آنکھ اور دل کو قابو میں رکھتا ہے تو اس کی شخصیت میں وقار، حلم اور بردباری پیدا ہوتی ہے۔ یوں روزہ فرد ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کے اخلاقی مزاج کو سنوارتا ہے۔

یہی نہیں، بھوک اور پیاس کا تجربہ انسان کو غریب، مفلس اور محروم طبقات کی کیفیت سے روشناس کراتا ہے۔ یہ احساس محض ایک وقتی جذبہ نہیں رہتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کے رویّوں کو بدل دیتا ہے۔ جب روزے دار اپنی اذیت محسوس کرتا ہے تو اسے اُن ہاتھوں کی لرزش اور اُن آنکھوں کی نمی کا اندازہ ہوتا ہے جو برسوں سے اسی کیفیت میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اس لمحے بھوک ایک ذاتی تکلیف نہیں رہتی بلکہ اجتماعی درد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دل کے اندر نرم گوشہ جاگ اٹھتا ہے اور انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کسی کی بھوک

مٹانا محض صدقہ نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کا تقاضا ہے۔ یوں دل میں ہمدردی جنم لیتی ہے، ایثار بیدار ہوتا ہے اور ضرورت مندوں کی خبر گیری محض نیکی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

اس تجربے کے نتیجے میں دل میں ہمدردی، ایثار اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور روزہ احساس کو عبادت اور ہمدردی کو اخلاقی فریضہ بنا دیتا ہے جو معاشرے میں عدل اور رحمت کی بنیاد مضبوط کرتا ہے۔

رمضان میں صدقہ و خیرات کی فراوانی، افطار کی مجالس اور اجتماعی عبادات سماجی ہم آہنگی اور بھائی چارے کو فروغ دیتی ہیں۔

افطار کے دسترخوان پر امیر و غریب، صاحبِ حیثیت اور محتاج ایک ہی صف میں بیٹھتے ہیں تو طبقاتی فاصلے خود بخود سمٹنے لگتے ہیں۔ مسجدوں کی قطاروں میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا دلوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔ یوں ماہ رمضان المبارک کا یہ اجتماعی ماحول افراد کو ایک وحدت میں پرو دیتا ہے اور معاشرے کو محبت، مساوات اور باہمی احترام کی روشن مثال عطا کرتا ہے۔

طبی فوائد

جدید طبی تحقیقات نے بھی روزے کے حیرت انگیز جسمانی فوائد کو تسلیم کیا ہے۔ سائنس اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ محدود اوقات میں غذا اور طویل وقفے کا فاقہ جسم کو خود احتسابی، اصلاح اور توازن کا موقع فراہم کرتا ہے۔ روزہ نظامِ ہاضمہ کو آرام دیتا ہے، معدے اور آنتوں کو درستگی کا موقع ملتا ہے جس سے ہاضمے کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔

اسی طرح روزہ جسم میں جمع شدہ اضافی چربی گھٹاتا، میٹابولزم کو متوازن کرتا اور وزن میں کمی کا سبب بنتا ہے۔ انسولین کی حساسیت میں اضافہ ہونے سے خون میں شوگر کی سطح قابو میں رہتی ہے جو ذیابیطس کے خطرات کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے (بشرطِ مشورۂ معالج)۔

مزید یہ کہ روزہ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کو متوازن رکھنے میں مدد دیتا ہے، دل کی بیماریوں کے امکانات گھٹاتا ہے، جسم سے فاضل اور زہریلے مادّوں کے اخراج کو تیز کرتا ہے، مدافعتی نظام مضبوط بناتا ہے اور خلیات کی درستگی و تجدید کے عمل کو فعال کرتا ہے۔ یوں جس عبادت کو دین نے روح کی بالیدگی کا ذریعہ قرار دیا، وہی عبادت جسمانی صحت، ذہنی سکون اور اعصابی توازن کے لیے بھی ایک قدرتی، مؤثر اور آزمودہ نسخہ بن کر سامنے آتی ہے۔

یوں روزہ محض بھوک و پیاس کا فریضہ نہیں بلکہ ایک جامع ربانی نسخہ ہے جو انسان کی زندگی کا ہر پہلو سنوارتا ہے۔ یہ نہ صرف روح کی روشنی بڑھاتا ہے بلکہ اخلاق کی چمک اور باطن کی پاکیزگی کا ضامن بھی ہے۔ جسمانی صحت، ذہنی سکون اور اجتماعی ہم آہنگی کے تمام عناصر اس میں شامل ہیں اور ہر انسان کو خود احتسابی، صبر اور ہمدردی کی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے۔ روزہ بندے کو یاد دلاتا ہے کہ اصل خوشی اور سکون اپنی خواہشات کی تکمیل میں نہیں بلکہ ان پہ قابو پانے اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں پوشیدہ ہے۔ یوں یہ فریضہ ہر لمحے، ہر احساس اور ہر عمل کو رب کے حکم کے مطابق ڈھال کر انسان کو کمال کی طرف گامزن کرتا ہے۔

یہ روح کو معرفتِ الٰہی کے مدارج تک پہنچاتا، اخلاق کو پاکیزگی عطا کرتا اور جسم کو صحت منداور متوازن بناتا ہے۔

یہ انسان کو اپنی خواہشات کی غلامی سے آزاد کرتا، صبر و ضبط کا درس دیتا اور دل میں ہمدردی، شکرگذاری اور تقوے کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ روزہ بندے کو نہ صرف اپنی ذات کے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی حساس اور ذمہ دار بناتا ہے اور یوں یہ عبادت فرد کی تربیت کے ساتھ معاشرتی فضا کو بھی رحمت، اخوت اور مساوات کی روشنی سے منور کر دیتی ہے۔ روزہ انسان کو اپنی ذاتی خواہشات اور مادّی آسائشوں کی قید سے آزاد کر کے اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کرتا ہے اور اسی اطاعت میں حقیقی سکون، توازن اور خوشی پنہاں ہے۔ روحانی روشنی، اخلاقی کمال اور جسمانی صحت کا یہ حسین امتزاج ثابت کرتا ہے کہ روزہ ایک زندہ عبادت ہے جو فرد کی ذات سے لے کر پورے معاشرے تک رحمت، ہمدردی اور قربانی کے بیج بوتا ہے۔

(باقی صفحہ 151 پر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔)

محمد ملک الظفر سہسرامی

اعتکاف: خلوتِ بندگی، حفاظتِ باطن اور قربِ الٰہی کی دعوت

جب ماہ رمضان المبارک اپنی آخری ساعتوں کی طرف بڑھتا ہے تو فضا میں ایک خاص طرح کی سنجیدگی، خموشی اور تقدیس اتر آتی ہے۔ گویا وقت خود آہستہ چلنے لگتا ہے اور لمحے ٹھہر کر دلوں سے گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ دنوں کی روشنی میں بھی ایک باطنی گہرائی محسوس ہونے لگتی ہے اور راتیں صرف تاریکیوں کی نمائندگی نہیں کرتیں بلکہ نور کی دبیز چادر اوڑھ لیتی ہیں۔ دنوں کی تمازت میں بھی ایک ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگتی ہے اور راتوں کی سیاہی نور میں نہا جاتی ہے۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب دل خود بخود دنیا کے شور سے اکتا کر کسی خموش گوشۂ بندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے، مسجدوں کی فضاؤں میں عجیب سی کشش پیدا ہو جاتی ہے، اذانوں کی آواز دل کے نہاں خانوں تک اترتی ہے اور سجدوں کی زمین بندے کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ دنیا کی مصروفیات مدھم پڑ جاتی ہیں اور روح کسی ایسی خلوت کی متلاشی ہو جاتی ہے جہاں وہ اپنے رب کے حضور بلاواسطہ حاضر ہو سکے، بے نام، بے نمود اور سراپا نیاز۔ ایسے میں مسجد کی دیواریں پکارتی ہیں، محرابیں اپنی آغوش کھول دیتی ہیں اور چراغوں کی مدھم لو دلوں کو یاد دلاتی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے خود کو خدا کے سپرد کر دینے کا۔

اعتکاف اسی سپردگی کا نام ہے۔ یہ زندگی کے بے نام ہجوم سے نکل کر خلوتِ الٰہی میں داخل ہونے کا عمل ہے، جہاں زبان کم اور دل زیادہ بولتا ہے، جہاں خواہشیں خاموش اور نیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ وہاں آنکھیں بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہیں اور آنسو دلیل بن کر بہنے لگتے ہیں۔ اس خلوت میں انسان اپنے آپ سے روبرو ہوتا ہے نہ کوئی پردہ باقی رہتا ہے اور نہ کوئی عذر کارگر ہوتا ہے۔ یہاں عبادت محض حرکات کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ احساس بن جاتی ہے اور دعا الفاظ کی محتاج نہیں رہتی بلکہ دل کی دھڑکنوں میں ڈھل جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اصل قرب آواز کی بلندی میں نہیں بلکہ گہرے احساس میں ہے اور حقیقی حضوری اسی خاموش سپردگی کا نام ہے جو دل کو رب کے سامنے بچھا دیتی ہے۔ یہاں بندہ نہ کچھ مانگنے آتا ہے، نہ کچھ جتانے بس خود کو رب کے حوالے کر دیتا ہے۔ گویا وہ کہہ رہا ہو اے میرے پروردگار! دنیا کے دروازے بہت دیکھ لیے، اب تیرے در کی خاک ہی میرا سرمایہ ہے۔ یہاں نہ منصب کی طلب ہے، نہ نام و نمود کی خواہش بس ٹوٹے ہوئے دل کی ایک سادہ سی التجا ہے کہ اسے قبول فرما لیا جائے۔ میں نے بہت سہارے آزمائے لیکن سب عارضی نکلے اب اگر کوئی دائمی آس ہے تو وہ تیری رحمت کی ہے۔ اس آستانے پر بیٹھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اصل دولت تیری رضا ہے اور اصل کامیابی یہی ہے کہ بندہ خود کو تیرے حوالے کر دے، بے دعویٰ، بے شکایت اور سراپا یقین۔

اعتکاف دراصل وقت کی رفتار تھام لینے کا نام ہے چند دن، چند راتیں، چند سجدے---مگر ان چند لمحوں میں عمر بھر کی تھکن اتر جاتی ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو انسان کو یاد دلاتی ہے کہ اصل سفر باہر کا نہیں اندر کا ہے اور اصل کامیابی لوگوں کے درمیان نمایاں ہونے میں نہیں اللہ تعالیٰ کے حضور گم ہو جانے میں ہے۔

ماہِ رمضان المبارک محض چند روز و شب کا مجموعہ نہیں بلکہ روح

کی تطہیر، دل کی بیداری اور باطن کی اصلاح کا مبارک موسم ہے جس میں انسان اپنے اندر جھانکنے کا حوصلہ پاتا ہے اور اپنے رب کی طرف لوٹنے کا سلیقہ سیکھتا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جہاں خواہشوں کو لگام ملتی ہے اور نیتوں کو سمت، جہاں خاموش بھوک پیاس بھی عبادت بن جاتی ہے اور ضبطِ نفس قربِ الٰہی کا زینہ۔ اس مبارک فضا میں دل نرم پڑ جاتے ہیں، آنکھیں نم ہوتی ہیں اور ضمیر جاگ اٹھتا ہے، جیسے برسوں کی گرد یکا یک جھڑ گئی ہو اور آئینۂ باطن شفاف ہو گیا ہو۔ انسان اپنے بھولے ہوئے عہد یاد کرنے لگتا ہے، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اس پر آسان ہو جاتا ہے اور رجوع وانابت کی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ ایسے لمحوں میں تو بہ محض الفاظ نہیں رہتی بلکہ دل کی ایک گہری آہ بن جاتی ہے اور یہی آہ رحمت کے دروازوں پہ خموشی کے ساتھ دستک دیتی ہے جہاں سے مغفرت اور قرب کے چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یوں بندہ رفتہ رفتہ اس مقام تک پہنچنے لگتا ہے جہاں دنیا پیچھے رہ جاتی ہے اور وہ خدا کے سامنے ہوتا ہے، نہ کسی پردے کے ساتھ اور نہ کسی واسطے کی ضرورت کے ساتھ۔ وہاں حسابِ نفع ونقصان مٹ جاتا ہے اور بس ایک نسبت باقی رہ جاتی ہے عبد اور معبود کی نسبت۔ اس لمحے میں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اصل حقیقت وہی ہے جو اس کے سامنے ہے باقی سب عارضی سائے تھے جو روشنی کے ساتھ بدلتے رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دل کو سکون نصیب ہوتا ہے، روح کو قرار ملتا ہے اور بندگی اپنے کامل مفہوم کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

اس ماہِ مقدس میں جہاں روزہ، تراویح، تلاوت اور صدقات بندۂ مومن کو رب سے جوڑتے ہیں، وہیں اعتکاف ایک ایسی جامع عبادت ہے جو انسان کو دنیا کے ہنگاموں سے نکال کر خدا کے در پہ لا بٹھاتی ہے۔ یہ عبادت خموشی میں گفتگو، تنہائی میں قرب اور بے نیازی میں سرور عطا کرتی ہے۔

جہاں لفظ پیچھے رہ جاتے ہیں اور احساس آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں بندہ نہ کچھ دکھانے آتا ہے نہ کچھ جتانے بس اپنے رب کے حضور ٹوٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس خلوت میں دل کی دھڑکن بھی ذکر بن جاتی ہے اور سانسوں کی آمد و رفت عبادت کا حصہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے پورا وجود ایک خموش تسبیح میں ڈھل گیا ہو۔ وقت کی رفتار بے معنیٰ ہو جاتی ہے اور لمحے محض گذرنے کی بجائے دل پر اترنے لگتے ہیں۔ یہاں بندہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی جگہ سپرد کر دیتا ہے اور اسی سپردگی میں وہ راحت پالیتا ہے جس کی تلاش میں وہ عمر بھر بھٹکتا رہا۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں مانگنا بھی عبادت ہے اور خاموش رہنا بھی قبولیت کا قرینہ۔

یوں انسان جان لیتا ہے کہ اصل لذت ہجوم میں نہیں بلکہ اس خلوت میں ہے جہاں صرف وہ ہوتا ہے اور اس کا پروردگار باقی ساری آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ نہ زمانے کی آواز باقی رہتی ہے اور نہ خواہشوں کا شور بس دل کی زمین پر سجدے اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بندہ یہ پہچان لیتا ہے کہ جس سکون کی تلاش میں وہ دنیا میں در بدری کے مرحلے سے گذرتے ہوئے بھٹکتا رہا وہ تو اسی خاموش تعلق میں پوشیدہ تھا۔ یہاں انسان خود کو پالیتا ہے، اس لیے کہ وہ خود کو خدا کے حوالے کر چکا ہوتا ہے۔

اعتکاف کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بندہ چند ایا م کے لیے اپنی مرضی، مصروفیات اور علائق کو چھوڑ کر مسجد کی چوکھٹ سے وابستہ ہو جائے، گویا اعلان کر دے: یا رب! اب میں تیرے در کا فقیر ہوں۔ یہاں وہ اپنے اختیار کی دستک واپس لے لیتا ہے اور اپنی خواہشوں کی کنجیاں رب کے حضور رکھ دیتا ہے۔ نہ وقت اس کا رہتا ہے، نہ دل کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں، سب کچھ اسی کے سپرد ہو جاتا ہے جس کے نام پر یہ خلوت اختیار کی گئی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندگی محض ایک فریضہ نہیں رہتی بلکہ فقر بن جاتی ہے اور فقر ہی وہ دولت ہے جو انسان کو رب کے قریب ترین کر دیتی ہے۔

اعتکاف کی فضیلت: احادیث کی روشنی میں

احادیثِ نبویہ ﷺ میں اعتکاف کے فضائل نہایت عظیم اور ایمان افروز انداز میں وارد ہوئے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ

اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اللہ کی رضا کے لیے ایک دن اعتکاف کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور دوزخ کے درمیان تین خندقیں حائل فرما دیتا ہے، ہر خندق مشرق و مغرب کے فاصلے سے زیادہ وسیع ہوتی ہے۔''

(شعب الایمان، ج3، حدیث: 3965)

یہ حدیث اعتکاف کو محض ایک وقتی عبادت نہیں بلکہ جہنم سے نجات کا مضبوط حصار قرار دیتی ہے۔

اسی طرح حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے رمضان میں دس دن کا اعتکاف کیا، اسے دو حج اور دو عمرے کا ثواب عطا کیا جاتا ہے۔'' (شعب الایمان، ج3، حدیث: 3966)

اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے: ''جس شخص نے ایمان اور ثواب کی نیت سے اعتکاف کیا، اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔'' (جامع الصغیر، حدیث: 8480)

یہ روایات واضح کرتی ہیں کہ اعتکاف نہ صرف قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے بلکہ مغفرت، حفاظت اور اجرِ عظیم کی بشارت بھی ہے۔

اعتکاف کی اقسام اور ان کے احکام

فقہاءِ کرام کے مطابق اعتکاف کی تین بنیادی قسمیں ہیں:

(۱) اعتکافِ واجب

یہ وہ اعتکاف ہے جو منت ماننے سے واجب ہوتا ہے۔ محض دل میں ارادہ کافی نہیں بلکہ زبان سے منت کہنا شرط ہے۔ منت پوری کرنا شرعاً لازم ہے۔

(۲) اعتکافِ سنتِ مؤکدہ

یہ رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف ہے، جو سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔

اگر کسی محلے یا شہر میں کوئی بھی اس سنت کو ادا نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے اور اگر ایک شخص بھی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو سب بری الذمہ ہو جائیں گے۔

اس اعتکاف کے لیے ضروری ہے کہ بیسویں رمضان کو غروبِ آفتاب سے پہلے مسجد میں نیت کے ساتھ داخل ہو جائے۔ اگر سورج غروب ہونے کے بعد داخل ہوا تو سنتِ مؤکدہ ادا نہ ہوگی۔

(۳) اعتکافِ مستحب

یہ اعتکاف کسی خاص وقت یا روزے کے ساتھ مشروط نہیں۔ جب بھی کوئی شخص مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہو، وہ معتکف ہے اور مسجد سے نکلنے پر اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔

خواتین اور اعتکاف

عورت اگر شادی شدہ ہو تو اس کے لیے شوہر کی اجازت شرط ہے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر اعتکاف کرنا جائز نہیں۔ تاہم شوہروں کو چاہیے کہ بلا وجہ اس عظیم عبادت سے خواتین کو محروم نہ کریں۔

خواتین مسجد میں اعتکاف نہیں کریں گی بلکہ اپنے گھر میں اس جگہ اعتکاف کریں گی جو نماز کے لیے مخصوص ہو۔ (تفصیل: بہارِ شریعت، جلد 5)

اعتکاف: محض قیام نہیں، قیامِ دل ہے

اعتکاف چند دن مسجد میں بیٹھ جانے کا نام نہیں، بلکہ یہ دل کو دنیا سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کا نام ہے۔ یہ عبادت ہمیں سکھاتی ہے کہ اصل آزادی خواہشات سے نجات میں ہے، اور اصل سکون رب کے در پر جھکنے میں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو رمضان کے آخری عشرے میں دنیا کی آوازوں سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ یہی خاموشی دراصل قبولیت کی سب سے بلند صدا ہوتی ہے۔



مفتی اطہر حسن ضیائی
صدر المدرسین دار العلوم رحمت عالم شری رامپور، احمد نگر

زکوٰۃ: روح کی تطہیر، معاشرے کی تعمیر

دین اسلام کی عمارت جن ستونوں پہ قائم ہے ان میں کچھ ستون روح کی تربیت کرتے ہیں اور کچھ معاشرے کی تشکیل--- اور زکوٰۃ وہ واحد ستون ہے جو روح اور معاشرہ، دونوں کو ایک ہی سانس میں سنوار دیتا ہے۔ یہ عبادت محض اعداد و حساب کا نام نہیں، بلکہ دل کی دنیا میں اترنے والی وہ روشنی ہے جو مال کی محبت کو بندگی کی حرارت میں بدل دیتی ہے۔ یہ انسان کو یاد دلاتی ہے کہ دولت کی اصل قدر اس کے جمع ہونے میں نہیں بلکہ اس کے بہنے میں ہے اور یہ کہ وہ ہاتھ جو دیتے ہیں دراصل اپنے باطن کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لمحے میں خودغرضی کی گرہیں کھلتی ہیں، دل کی تنگنائیاں کشادہ ہوتی ہیں اور انسان اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ یوں مال صرف ضرورتِ دنیا نہیں رہتا، وسیلۂ قربِ الٰہی بن جاتا ہے اور عبادت کا یہ عمل فرد کی تطہیر کے ساتھ ساتھ معاشرے کے زخموں پہ شفقت کی دستک بن کر اترتا ہے۔

زکوٰۃ دینے والا جب اپنے مال سے اللہ تعالیٰ کا حق جدا کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے باطن کی گرہیں کھولتا ہے، اپنے رزق کو برکت کی امانت سونپتا ہے اور معاشرے کے زخموں پر خاموش مرہم رکھتا ہے۔ اس لمحے اسے احساس ہوتا ہے کہ اصل دولت محفوظ کھاتوں میں نہیں بلکہ اس دعا میں ہے جو کسی محتاج کے لبوں سے بے ساختہ نکلتی ہے۔ وہ دعا جو خموشی سے عرش کی دہلیز پر دستک دیتی ہے اور دینے والے کے رزق، عمر اور دل----- سب پر برکت بن کر اترتی ہے۔ یہی وہ ساعت ہے جب مال کی سرد چمک ماند پڑ جاتی ہے اور انسان کے عمل میں اخلاص کی حرارت روشن ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ لمسِ رحمت معاشرے کے سرد چہروں پر امید کی روشنی بکھیرتا اور دلوں کے درمیان اعتماد کے پل تعمیر کرتا ہے جہاں محرومی کی دھند چھٹنے لگتی ہے اور احساسِ شرکت جنم لیتا ہے۔ یہ پل دولت اور ضرورت، صاحبِ نصاب اور مستحق، قوت اور کمزوری کے درمیان ایسی خموش رفاقت قائم کرتے ہیں جو شور کے بغیر انقلاب برپا کرتی ہے۔ زکوٰۃ کے سائے میں نفرت کی دیواریں گھلتی ہیں، بے بسی کو سہارا ملتا ہے اور معاشرہ محض افراد کا ہجوم نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ، باہم ذمہ دار وحدت میں ڈھل جاتا ہے۔ یوں یہ عبادت خاموشی سے اجتماعی زندگی کی نبض میں حرارت بھر دیتی ہے اور انسان کو انسان کے لیے رحمت بنا دیتی ہے۔

یوں ایک خاموش عطا ایک بلند دعا میں ڈھل کر فرد کے باطن کو سکون اور اجتماع کے وجود کو وقار عطا کر دیتی ہے اور یہی سکون انسان کو حرص کی بے قراری سے نجات دے کر قناعت کی دولت سے ہم کنار کرتا ہے۔ اس وقار کے سائے میں معاشرہ محض ضرورتوں کا مجموعہ نہیں رہتا بلکہ اقدار کی ایک باوقار ترتیب بن جاتا ہے جہاں دینے اور لینے--- دونوں میں عزت محفوظ رہتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ خاموش اثر دلوں میں ایسی نرمی پیدا کرتا ہے جو اختلاف کو برداشت میں اور بے حسی کو احساسِ ذمہ داری میں بدل دیتی ہے۔ یوں عبادت کا یہ عمل فرد کی تطہیر سے آگے بڑھ کر اجتماعی اخلاق کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا یہ عمل دل کو قناعت سکھاتا ہے، نظر کو انکسار عطا کرتا ہے اور ہاتھوں کو سخاوت کی لذت سے آشنا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان

کے اندر کا غرور پگھل کر شکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنے پاس موجود نعمتوں کو حقِ ملکیت نہیں بلکہ امانت سمجھنے لگتا ہے اور اسی شعور سے اس کے عمل میں ٹھہراؤ اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ زکوٰۃ انسان کو یہ سلیقہ بھی سکھاتی ہے کہ دینا محض بوجھ نہیں بلکہ روح کی وسعت کا اعلان ہے۔ یوں یہ عبادت فرد کے باطن میں توازن اور معاشرے کے ظاہر میں اعتدال کی فضا قائم کر دیتی ہے۔

یوں دینے والا محض مال سے سبکدوش نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے اندر ایک نئی روحانی زندگی کی شروعات بھی کرتا ہے، جس میں بندگی، ہمدردی اور ذمہ داری ایک دوسرے میں گھل کر انسان کو انسان کے قریب لے آتی ہیں۔ اس نئی زندگی میں عبادت صرف سجدے تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ضرورت مند کے آنسو پونچھنا بھی بندگی کی ایک صورت بن جاتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والی یہ قربت معاشرے کے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑتی اور احساسِ بے نیازی کو احساسِ جواب دہی میں بدل دیتی ہے۔ یوں زکوٰۃ انسان کو خود سے بلند کر کے اجتماع کے درد سے آشنا کرتی اور اسے خاموش خدمت کے راستے پر ثابت قدم کر دیتی ہے۔

زکوٰۃ کا تصور ہمیں یہ یاد دہانی کراتا ہے کہ دولت اگر تنہا رہ جائے تو غرور بن جاتی ہے اور جب راہِ خدا میں چل پڑے تو رحمت کا سرچشمہ۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں مال کی پرستش ٹوٹتی اور امانت کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ راہِ خدا میں چلنے والی دولت محتاج کے چہرے پر مسکراہٹ، مقروض کے دل میں آسودگی اور معاشرے کے مزاج میں نرمی پیدا کرتی ہے اور یہی نرمی سختیوں کے بند دروازے آہستہ آہستہ کھول دیتی ہے۔ اس بہاؤ میں دولت کا بوجھ ہلکا اور اس کا اثر گہرا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ محض ضرورت پوری نہیں کرتی بلکہ عزتِ نفس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے گردش میں آنے والا مال دلوں کے درمیان فاصلے کم کرتا اور اعتماد کی فضا قائم کرتا ہے۔ یوں یہ عمل خموشی سے معاشرتی توازن بحال کر کے اجتماع کو باہمی رحمت کی صورت عطا کر دیتا ہے۔

اس طرح زکوٰۃ دولت کو سرد مادّہ نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے اخلاق، خدمت اور بندگی کی حرارت عطا کر کے انسانی فلاح کا وسیلہ بنا دیتی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں عبادت، اخلاق اور سماجی ذمہ داری ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک ہمہ گیر نظام بن جاتے ہیں۔

جس میں فرد کی نجات اور معاشرے کی اصلاح ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہاں بندگی محض ذاتی تقوے تک محدود نہیں رہتی بلکہ اجتماعی خیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس نظام میں دینے والا بھی سنورتا ہے اور پانے والا بھی سنبھلتا ہے اور یوں معاشرہ محرومی اور بے حسی کے دائرے سے نکل کر باہمی کفالت کی راہ پہ گامزن ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ اسی ہمہ گیری کے ساتھ دین کو زندگی اور زندگی کو دین سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

اس تمہید کے دریچے سے ہم زکوٰۃ کی اسی روحانی حقیقت، اس کی ناگزیر ضرورت اور اس کے عملی تقاضوں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں----- تاکہ سمجھ سکیں کہ زکوٰۃ محض دین کا حکم نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کا ضمانت دار اصول ہے

اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ محض ایک مالی فریضہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اخلاقی، روحانی اور سماجی نظم کا ستون ہے۔ یہ وہ عبادت ہے جو بندۂ مومن کے دل کو مال کی محبت سے آزاد کرتی، معاشرے کے رگ و پے میں عدل، ہمدردی اور کفالتِ عامہ کی روح پھونکتی اور دولت کی گردش کو چند ہاتھوں میں منجمد ہونے سے بچاتی ہے۔ زکوٰۃ عبادت بھی ہے، تطہیر بھی اور معاشرتی توازن کی ضامن بھی---اسی جامعیت نے اسے دینِ اسلام کی بنیادوں میں شامل کیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہاں نماز کا ذکر آیا ہے، وہیں زکوٰۃ کا حکم بھی ساتھ ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ رفاقت محض لفظی نہیں بلکہ مفہومی ہے نماز فرد کو خدا سے جوڑتی ہے، زکوٰۃ فرد کو بندوں سے۔ نماز روح کی تربیت کرتی ہے، زکوٰۃ مال کی تطہیر۔ اسی لیے زکوٰۃ ایمان کی صداقت کی عملی علامت ہے--- کہ انسان اپنے رزق میں اللہ تعالیٰ کے حق کو خوش دلی

سے ادا کرے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے زکوٰۃ کو اسلام کی بنیادوں میں شمار فرما کر واضح کر دیا کہ جس دین میں عبادت ہو مگر سماجی انصاف نہ ہو، وہ ادھورا ہے۔

زکوٰۃ ''تزکیہ'' سے نکلی ہے--- یعنی پاکیزگی اور نمو۔ زکوٰۃ دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ برکت پاتا ہے، دل کی تنگی کشادہ ہوتی ہے، خودغرضی سخاوت میں ڈھلتی ہے۔ اور انسان کے باطن میں ایک خوشگوار سکون اتر آتا ہے جو نہ صرف اسے اپنے رب کے قریب کرتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی رحمت کا سبب بنتا ہے۔ یہ عمل فرد کی روحانی ترقی اور معاشرتی ہم آہنگی دونوں کا ضامن بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے مال کا حصول اور خرچ صرف ذاتی فائدے کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی بھلائی کی راہ میں منظم ہو جاتا ہے اور یوں ہر عطا شدہ روپیہ ایک خیر کی لہر بن کر دلوں اور معاشرے میں پھیل جاتا

یہ عبادت انسان کو یاد دلاتی ہے کہ وہ محض مالک نہیں، امین ہے جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ امانت ہے اور ہر نعمت کا ایک حق اللہ تعالیٰ اور ایک حق محتاج پر ہے۔ اسی شعور سے انسان اپنے مال کو غرور یا ہوس کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ اس کی قدر و قیمت کو ذمہ داری اور شکر کے ساتھ جانچتا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے وہ امانت کو تقسیم کا ذریعہ بناتا ہے، دل کو سخاوت کی تربیت دیتا ہے اور معاشرے میں عدل و رحمت کے بیج بوتا ہے۔ یوں یہ عبادت فرد کے نفس کی تطہیر اور معاشرتی توازن دونوں کی ضامن بن کر انسانیت کی بقا میں حصہ ڈالتی ہے۔

اس شعور سے غرور ٹوٹتا ہے، شکر جنم لیتا ہے، اور بندہ اپنے رب کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں غربت، محرومی اور عدمِ مساوات اگر بڑھ جائے تو امن، وقار اور باہمی اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے کیونکہ دلوں میں حسد، ناامیدی اور بے حسی کے بیج بوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں انسانیت کی بنیادیں ہلکی پڑ جاتی ہیں اور معاشرتی رشتے تناؤ اور کشمکش کے شکنجوں میں جکڑ جاتے ہیں۔ زکوٰۃ کا نظام انہی ٹوٹتے ہوئے تعلقات کو جوڑنے، محروموں کو سہارا دینے اور دولت کی منصفانہ گردش کو یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن رہنمائی ہے۔ یہ نہ صرف معاشرتی خلا کو پر کرتا ہے بلکہ فرد کے دل میں ہمدردی، شکر اور اعتدال کے جذبات بھی فروغ دیتا ہے۔

اسلام نے زکوٰۃ کے ذریعے اس بگاڑ کا بروقت علاج پیش کیا۔ زکوٰۃ محتاج کی حاجت روائی، مقروض کی دستگیری، مسافر کی اعانت اور کمزور طبقوں کی کفالت کا منظم نظام ہے یہ صرف وقتی امداد نہیں بلکہ ایک مستقل سماجی توازن کا ضامن ہے، جو معاشرے میں عدل، ہمدردی اور باہمی اعتماد کو فروغ دیتا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے دولت کے بہاؤ کو منظم کر کے یہ یقینی بنایا جاتا ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو اور ہر محتاج اپنی عزت کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر سکے۔ یوں یہ نظام صرف مالی مدد نہیں بلکہ دلوں کے درمیان رفاقت، معاشرت میں یکجہتی اور اجتماع میں وقار قائم کرنے کا ایک عملی ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ خیراتِ موسمی نہیں، بلکہ مستقل ذمہ داری ہے۔ جو معاشرے میں دولت کی گردش کو یقینی بناتی اور طبقاتی خلیج کو پاٹتی ہے۔

زکوٰۃ سرمایے کو جمود سے نکال کر حرکت دیتی ہے۔ جب دولت گردش میں آتی ہے تو پیداوار بڑھتی ہے، روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور معاشی زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کے مصرف متعین ہیں ان کی پابندی سے وسائل درست جگہ پہنچتے ہیں اور معاشی انصاف عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ یوں زکوٰۃ ایک ایسا معاشی ضابطہ ہے جو اخلاق سے خالی نہیں، اور ایک ایسا اخلاقی نظام ہے جو معاشی حقائق سے کٹا ہوا نہیں۔

زکوٰۃ کے تقاضوں میں سب سے پہلا تقاضا شعور ہے--- کہ زکوٰۃ کو محض سالانہ ادائیگی نہ سمجھا جائے بلکہ ایک زندہ ذمہ داری مانا جائے۔ دوسرا تقاضا دیانت ہے--- مال کی درست تعیین، نصاب کی صحیح رعایت اور مستحقین کی باوقار اعانت۔ تیسرا تقاضا نظم ہے--- زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم میں شفافیت، امانت اور اجتماعی حکمت۔ اور چوتھا تقاضا اخلاص ہے---نمود و نمائش سے پاک نیت، کہ دینے والا خود کو محسن نہیں، مکلف سمجھے۔

آج کے دور میں جب سرمایہ چند ہاتھوں میں سمٹ رہا ہے اور

غربت نئے روپ دھار رہی ہے، زکوٰۃ کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زکوٰۃ کو محض انفرادی فریضہ نہیں بلکہ اجتماعی اصلاح کا مؤثر ذریعہ بنایا جائے تعلیمی، طبی اور معاشی منصوبوں میں اس کے درست مصرف کو یقینی بنایا جائے اور مستحقین کو محض وقتی سہارا نہیں بلکہ خود کفالت کی راہ دکھائی جائے۔

زکوٰۃ دینِ اسلام کا وہ زندہ ضمیر ہے جو فرد کے باطن کو پاک کرتا اور معاشرے کے ظاہر کو متوازن بناتا ہے۔ یہ عبادت انسان کو انسان سے جوڑتی، دولت کو خدمت میں ڈھالتی اور ایمان کو عمل کی روشنی عطا کرتی ہے۔ جب زکوٰۃ شعور، دیانت اور اخلاص کے ساتھ ادا کی جائے تو وہ محض مال کی تقسیم نہیں رہتی--- وہ معاشرے کی تقدیر سنوارنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ صرف ایک مالی فریضہ نہیں بلکہ روح کی تطہیر اور معاشرت کی تجدید کا روشن چراغ ہے۔ یہ وہ نرمی ہے جو دلوں کو سختیوں سے آزاد کرتی، وہ روشنی ہے جو اندھیروں میں امید جگاتی اور وہ حرکت ہے جو جمع شدہ دولت کو خدمت اور رحمت کی راہ پہ ڈال دیتی ہے۔ زکوٰۃ دینے والا محض مال سے سبکدوش نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے باطن کو کشادہ، اپنے دل کو نرم اور اپنے عمل کو معنویت عطا کرتا ہے۔ اسی عمل میں خدا کی خوشنودی اور انسانیت کی بھلائی ایک ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

یہ عبادت یاد دلاتی ہے کہ حقیقی کامیابی صرف مال و دولت میں نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی، شعور کی وسعت اور معاشرے میں عدل و ہمدردی کے قیام میں ہے۔ جب زکوٰۃ شعور، دیانت اور اخلاص کے ساتھ ادا کی جائے تو یہ محض رزق کی تقسیم نہیں رہتی--- یہ بندگی، سخاوت اور انسانیت کا ایک ایسا سنگم بن جاتی ہے جو فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے سکون، وقار اور نور کی نوید لے کر آتا ہے۔

□□□□

(صفحہ 144 کا باقی۔۔۔)

یہی عبادت انسان کے دل و دماغ میں شعور کی روشنی جگاتی ہے، اسے اپنی غلطیوں کا ادراک کراتی ہے اور اعمالِ صالحہ کی طرف راغب کرتی ہے۔ روزہ نہ صرف عبادت گذار کے باطن کو نکھارتا ہے بلکہ معاشرے میں عدل، مساوات اور اخوت کی فضا قائم کر کے ہر فرد کے لیے رحمت و برکت کا ذریعہ بنتا ہے۔ یوں روزہ ایک کامل نظامِ حیات ہے جو روح، اخلاق اور جسم کی اصلاح کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب لے جاتا ہے اور زندگی کے ہر لمحے کو ربانی نظم میں پرو دیتا ہے۔

روزہ وہ بلند منزل ہے جہاں انسان اپنی ذات کے ہر گوشے کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ڈھالتا ہے اور زندگی کے ہر لمحے کو ربانی نظم میں پرو دیتا ہے۔

روزہ محض ایک مذہبی فریضہ نہیں بلکہ ایک مکمل ربانی نظامِ حیات ہے۔ یہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرتا ہے اس کی معرفت کے آداب وسلیقے سکھاتا ہے، اس کے اخلاق سنوارتا، اس کے جسم کو شفا بخشتا اور اس کے معاشرے کو عدل، ہمدردی اور اخوت کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ اگر روزہ ہمیں تقویٰ، صبر، شکر اور گناہوں سے اجتناب کی دولت عطا کر دے تو یہی اس کی حقیقی قبولیت ہے اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے روزہ فرض کیا گیا۔

یہ عبادت انسان کو اپنی خواہشات کی غلامی سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع کرتی ہے اور دل و دماغ میں شعور کی روشنی بکھیرتی ہے۔ بھوک و پیاس کے لمحات میں حاصل ہونے والا ضبطِ نفس، ہمدردی اور اخلاقی پاکیزگی کا سبق زندگی کے ہر گوشے میں اثر انداز ہوتا ہے۔ یوں روزہ صرف جسمانی فاقے کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل روحانی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا ذریعہ بن جاتا ہے جو انسان کو اپنے رب کے قریب اور معاشرے میں رحمت و انصاف کے قابلِ عمل نمونہ میں ڈھالتا ہے۔

□□□□

مفتی خورشید احمد رضوی

ایصالِ ثواب: عبادت سے رحمت تک کا سفر

کا مزاج محض فرد کی نجات تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر روحانی تہذیب ہے جو زندوں اور مردوں، حال اور ماضی، دنیا اور آخرت--- سب کو ایک ہی رشتۂ ایمان میں پرو دیتی ہے۔ یہاں عبادت کسی گوشۂ تنہائی کی ریاضت نہیں بلکہ رحمت کے اس بہتے ہوئے دریا کا نام ہے جس کے کنارے صرف ایک فرد نہیں بلکہ پوری امت سیراب ہوتی ہے۔ یہی وہ امتیازی وصف ہے جو اسلامی عبادات کو محض ذاتی اعمال کے دائرے سے نکال کر اجتماعی خیر اور باہمی نفع کے آفاقی تصور تک پہنچا دیتا ہے۔

اسلام نے انسان کو یہ شعور عطا کیا ہے کہ وہ اپنے رب سے جو کچھ پاتا ہے اسے دوسروں کے لیے بھی وسیلۂ رحمت بنا سکتا ہے۔ دعا ہو یا صدقہ، تلاوت ہو یا ذکر، نماز ہو یا حج --- یہ عبادات اپنی اصل میں بندے کو خدا سے جوڑتی ہیں مگر اپنے ثمرات میں بندوں کو بندوں سے جوڑ دیتی ہیں۔ اسی باہمی ربط اور روحانی تسلسل کا ایک روشن عنوان ایصالِ ثواب ہے جس کے ذریعے زندوں کی عبادت کی خوشبو قبروں تک پہنچتی ہے اور مردوں کی بے بسی میں امید کی ایک کرن بن جاتی ہے۔

بدقسمتی سے بعض ادوار میں اس حقیقت کو محض عقلی موشگافیوں یا نام نہاد تحقیق کے نام پہ مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی حالانکہ ایصالِ ثواب نہ کسی جذباتی وابستگی کا نتیجہ ہے اور نہ ہی عوامی روایت کا پیدا کردہ تصور بلکہ یہ قرآنِ حکیم کی نصوص، سنتِ نبوی ﷺ کی تصریحات اور امتِ مسلمہ کے مسلسل تعامل سے ثابت ایک مستحکم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایمان ہمیشہ اپنے مرحومین کو دعا، استغفار اور صدقات کے تحفے پیش کرتے آئے ہیں اور اسے اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے رہے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون اسی فکری اور روحانی پس منظر میں ایصالِ ثواب کے تصور کا جائزہ لیتا ہے۔ اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عبادت کا اجر محض ادا کرنے والے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ان بندوں تک بھی پہنچتا ہے جن کے لیے اسے نیتاً ہدیہ کیا جائے۔ یہ تمہید دراصل اس حقیقت کی طرف دعوتِ فکر ہے کہ اسلام میں رحمت کا دائرہ موت پہ ختم نہیں ہوتا بلکہ ایمان کے رشتے میں بندھی ہوئی دعائیں قبروں کی خاموشی کو بھی معنیٰ عطا کر دیتی ہیں۔

اسلامی شریعت میں عبادت محض ایک انفرادی ریاضت نہیں بلکہ ایک جامع، ہمہ گیر اور باہمی ربط رکھنے والا نظامِ رحمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت کی تقسیم بدنی، مالی اور مرکب کی صورت میں کی گئی تاکہ انسان پر واضح ہو جائے کہ بندگی کے یہ تمام رنگ دراصل ایک ہی مقصد کی تکمیل کرتے ہیں: رضائے الٰہی اور بندگانِ خدا کے لیے خیر و نفع۔

بدنی عبادات--- جیسے نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن، ذکر و تسبیح اور دعا--- انسان کے جسم و جان کو بندگی کے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ مالی عبادات--- زکوٰۃ، صدقات اور خیرات--- دل کو مال کی محبت سے پاک کر کے سماجی توازن قائم کرتی ہیں۔ جب کہ مرکب عبادات، یعنی حج، بدن کی مشقت اور مال کی قربانی دونوں کو یکجا کر کے

بندے کو مکمل سپردگی کا درس دیتی ہے۔

یہ عبادات اگر اخلاص کے ساتھ ادا کی جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بقدر اخلاص ان پر اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ اجر ملتا ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا اس اجر و ثواب کو کسی دوسرے، بالخصوص کسی متوفی مسلمان کو پہنچایا جا سکتا ہے؟

یہاں اہلِ علم کی تاریخ دو واضح موقف پیش کرتی ہے۔ معتزلہ کا نظریہ یہ رہا ہے کہ کسی کی عبادت کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچتا، نہ زندے کو اور نہ مردے کو۔ اس کے برخلاف جمہور اہلِ سنّت و جماعت کا متفقہ اور مضبوط موقف یہ ہے کہ ایصالِ ثواب حق ہے، ثابت ہے اور قرآن و حدیث سے مدلل ہے اور اس سے میت کو حقیقی نفع پہنچتا ہے۔

یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ معتزلہ تو تاریخ کے صفحات میں دفن ہو چکے مگر ان کے افکار کی بازگشت آج بعض حلقوں میں نئے عنوانات کے ساتھ سنائی دینے لگی ہے۔ قرآن و حدیث پر ایمان کا دعویٰ اور ایصالِ ثواب کا انکار--- یہ دو باتیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اگر ایصالِ ثواب کا انکار درست مان لیا جائے تو پھر قرآنِ کریم میں مذکور دعائیں، انبیاء و ملائکہ کی استغفاری عبادات، اور خود رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات سب بے معنیٰ ٹھہریں گی اور یہ بات کسی صاحبِ ایمان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

ایصالِ ثواب کی بنیاد سب سے پہلے دعا پر قائم ہے اور دعا بذاتِ خود عبادت ہے بلکہ حدیثِ نبوی کے مطابق عبادت کا مغز ہے۔ قرآنِ کریم سورۂ حشر میں اہلِ ایمان کی اس جماعت کی تحسین فرماتا ہے جو اپنے لیے بھی اور اپنے ان بھائیوں کے لیے بھی دعائے مغفرت کرتی ہے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو چکے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ

(الحشر: 10) وہ جو ان کے بعد آئے وہ یوں دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گذر چکے ہیں۔

اگر دعا سے میت کو نفع نہ پہنچتا ہو تو پھر اس قرآنی تعلیم کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے؟

ثابت ہوا کہ زندہ مسلمان کا مردہ مسلمانوں کے لیے دعائے بخشش کرنا مردوں کے عفو بخشش اور رفع درجات کا موجب ہے۔ چنانچہ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔

وَقَدْ نَقَلَ غَيْرُ وَاحِدٍ الْإِجْمَاعَ عَلَى أَنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ الْمَيِّتَ وَ دَلِيلُهُ مِنَ الْقُرْآنِ قَوْلُهُ تَعَالَى وَ الَّذِينَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ

(شرح الصدور صفحہ 127 مطبوعہ مصر 1339)

ترجمہ: اور اس امر پر بہت سے علماء نے اجماع نقل کیا ہے کہ بے شک دعا میت کو نفع دیتی ہے اور اس کی دلیل قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔

وَ الَّذِينَ جَاءُو مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ (الخ)

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کا ذکر بھی بطور تعریف بیان فرماتا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (ابراہیم)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور مومنین کو بخش دے جس دن حساب قائم ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا--- رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ۝

اس حقیقت پہ ایک اور روشن دلیل ہے۔ خلیلُ اللہ جیسے جلیل القدر نبی کا اپنے والدین اور تمام مومنین کے لیے دعائے مغفرت کرنا اس بات کا واضح اعلان ہے کہ زندوں کی عبادت، یعنی دعا، مردوں کے لیے باعثِ نفع ہے۔ ورنہ نعوذ باللہ یہ ماننا پڑے گا کہ ایک نبی نے بے فائدہ کام کیا اور قرآن مجید نے اسے بطورِ تحسین نقل کیا--- جو عقل و ایمان دونوں کے خلاف ہے۔

اسی طرح قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ عرشِ الٰہی کے حامل اور اس کے گرد فرشتے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں بلکہ اہلِ ایمان

کے لیے استغفار بھی کرتے ہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (غافر 7)

فرشتے معصوم ہیں، مامور من اللہ تعالیٰ ہیں، ان کا کوئی عمل بے مقصد نہیں ہوسکتا۔ پس جب وہ مومنین کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں تو لازماً اس دعا کا اثر اور نفع اہلِ ایمان، خواہ زندہ ہوں یا قبر میں، ان تک پہنچتا ہے۔

احادیثِ نبویہ اس حقیقت کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میت کی کیفیت کو ایک ایسے ڈوبتے ہوئے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کی دعا کا منتظر ہوتا ہے۔ جب اسے دعا پہنچتی ہے تو وہ دعا اسے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اہلِ زمین کی دعا کے سبب اہلِ قبور پر پہاڑوں کے برابر اجر و رحمت نازل فرماتا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

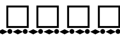
أَلْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْغَرِيقِ الْمُتَغَوِّثِ، يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ أَبٍ، أَوْ أُمٍّ أَوْ أَخٍ، أَوْ صَدِيقٍ، فَإِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، وَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَيُدْخِلُ عَلَى أَهْلِ الْقُبُورِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ وَإِنَّ هَدِيَّةَ الْأَحْيَاءِ إِلَى الْأَمْوَاتِ الْإِسْتِغْفَارُ لَهُمْ (مشکوٰۃ 2355 بیہقی شعب الایمان 9295)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مردے کی حالت قبر میں ڈوبتے ہوئے فریاد کرنے والے کی طرح ہوتی ہے وہ انتظار کرتا ہے کہ اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے اسے دعا پہنچے اور جب اسے کسی کی دعا پہنچتی ہے تو وہ دعا کا پہنچنا اس کو دنیا و مافیہا سے محبوب تر ہوتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کی دعا سے اہل قبور کو پہاڑوں کی مثل اجر و رحمت عطا کرتا ہے اور بے شک زندوں کا تحفہ مردوں کی طرف یہی ہے کہ ان کے لیے بخشش (کی دعا) مانگی جائے۔

اس حدیث میں نہ صرف دعا کے پہنچنے کا ثبوت ہے بلکہ یہ بھی واضح ہے کہ زندوں کا سب سے قیمتی تحفہ مردوں کے لیے استغفار ہے۔

یہ تمام دلائل اس حقیقت کو ناقابلِ تردید بنا دیتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کوئی بعد کی ایجاد نہیں بلکہ قرآن، سنت، انبیاء، فرشتوں اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ یہ دراصل امت کے اندر رحمت کے تسلسل کا نام ہے--- ایسا تسلسل جس میں زندہ اور مردہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہیں بلکہ دعا، محبت اور ایثار کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

ایصالِ ثواب کا انکار دراصل اس روحانی ربط کا انکار ہے جو اسلام نے زندوں اور مردوں کے درمیان قائم کیا ہے۔ اور ایصالِ ثواب کا اقرار اس بات کا اعلان ہے کہ اسلام میں موت اختتام نہیں بلکہ ایک مرحلہ ہے اور دعا و عبادت کی روشنی قبر کی تاریکیوں تک پہنچتی ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو دلوں کو جوڑتا ہے، قبروں کو منور کرتا ہے اور امت کو اس کے علمی و روحانی ورثے سے وابستہ رکھتا ہے۔ **(جاری)**



اخلاقیات محض سماجی آداب کا نام نہیں، یہ باطن کی تہذیب اور روح کی طہارت کا عنوان ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو علم کو وقار، عبادت کو قبولیت اور منصب کو عزت بخشتا ہے۔ انسان کی اصل پہچان اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے اخلاق سے ہوتی ہے، نرم خوئی، درگذر، امانت داری اور عدل-- یہی وہ اوصاف ہیں جو دلوں کو مسخر کرتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ ایمان کی عملی تفسیر ہیں۔ جس کے لہجے میں شفقت، معاملات میں دیانت اور رویّے میں انکسار ہو، وہی دراصل اخلاق کی خوشبو سے معطر ہے۔ معاشرہ قانون سے نہیں، کردار سے سنورتا ہے اور کردار اُس وقت نکھرتا ہے جب انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور دوسروں کے حقوق کو اپنی خواہشات پہ ترجیح دے۔

آیئے! ہم اپنے اخلاق کو اپنی دعوت بنائیں، اپنے کردار کو اپنا تعارف تاکہ ہماری ذات سے خیر کی روشنی پھوٹے اور ہمارے گرد و پیش میں محبت، احترام اور اخوت کی فضا قائم ہو۔

محمد ملک الظفر سہسرامی
malikuzzafar786@gmail.com

لمحے جولوٹتے نہیں: سفرِ آخرت

زندگی کی راہوں میں قدم قدم پہ ایسی خموش لہروں کی صدائیں بکھری ہوئی ہیں جو انسان کو اس کی اصل منزل کی طرف بلاتی رہتی ہیں--مگر خواہشوں کا شور تمناؤں اور آرزوؤں کی پکاران آوازوں کو دھندلا دیتی ہے اور دل دنیا کی چکاچوند میں اپنی سمت بھول جاتا ہے۔

ہر دن جب آفتاب غروب ہوتا ہے تو دراصل یہ ایک اعلان ہے کہ روشنی عارضی ہے اور سایہ مستقل---ہر گذرتا لمحہ یہ یاددہانی ہے کہ وقت ٹھہرتا نہیں، صرف ہم ٹھہر جانے کا گمان کرتے ہیں۔

ہوا کی سرسراہٹ میں بھی ایک پیغام ہے، بکھرتے پتوں میں بھی ایک اشارہ ہے اور بدلتے موسموں میں بھی ایک سبق پوشیدہ ہے، چمکتے ستاروں میں بھی ایک راز چھپا ہے، سنسان راستوں میں بھی اسی منزل کے اشارے ملتے ہیں، وقت کے ہر لمحے میں عبرت کی عبارت نمایاں ہے۔ یادوں کے ہر گوشے میں یہی سبق پوشیدہ ہے اور زندگی کے ہر موڑ پہ حکمت کی یہی جھلک ہے کہ جو آیا ہے، اسے لوٹنا ہے۔ انسان اپنے منصوبوں کے جال بنتا رہتا ہے مگر تقدیر خموشی سے اس کے قدموں کے نیچے زمین سمیٹتی رہتی ہے۔ وہ مستقبل کے خواب سجاتا ہے اور موت اس کے آج کے دروازے پہ دستک دے رہی ہوتی ہے۔

کاش! ہم یہ خموش صدائیں سن لیں--- کاش! ہم اپنی دھڑکنوں میں چھپی یہ پکار پہچان لیں جو ہر سانس کے ساتھ کہتی ہے: "یہ راستہ عارضی ہے......اصل منزل آگے ہے......" لیکن ہم......دنیا کے شور اور خواہشات کے ہنگاموں میں ڈوبے ہوئے وہ آوازیں سن نہیں پاتے۔ ایک دن گذرتا ہے، دوسرا دن آتا ہے، موسم بدلتے ہیں، چہروں پہ نئی مسکراہٹیں اور نئے غم اترتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ زندگی ہمیشہ اسی انداز میں ہی چلتی رہے گی۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک سفر ہے، قیام نہیں--- یہ کارواں ہے جو رکتا نہیں، چاہے مسافر خود کو ٹھہرا ہوا کیوں نہ سمجھے۔

یہ راستہ ہے جس پہ قدم تو ہمارے ہوتے ہیں مگر منزل کا تعین کسی کے دست قدرت میں ہے۔ ہم سایوں کو گھر سمجھ بیٹھتے ہیں، حالاں کہ وہ صرف چند لمحوں کی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔

زندگی ایک امانت ہے، ملکیت نہیں، سانسوں کا ایک تسلسل ہے، دائمی سکون نہیں۔ ہم اسے ہمیشہ کا بسیرا سمجھ لیتے ہیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو محض ایک پل بھر کا پڑاؤ ہے، یہ اس مسافر کی مانند ہے جو طویل سفر میں کسی درخت کے سائے تلے کچھ دیر دم لے کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ اس پیاسے کی طرح ہے جسے لمبی مسافت کے بعد پانی کی جھلک دکھائی دے اور دل کو عارضی سکون مل جائے۔ یہ اس اندھیری رات کی طرح ہے جس کے بعد پہلی کرن افق پہ نمودار ہو کر امید جگا دے۔

یہ اس کشتی کی مثل ہے جو طوفانی دریا میں بھٹکتی رہے اور اچانک کسی ساحل کی نرم ریت پہ ٹکرائے تو مسافر کا دل خوشی سے بھر جائے۔ یہ اس پرندے کی طرح ہے جو بھٹکتا پھرے اور اچانک اپنے گھونسلے کی پناہ پالے۔ یہ اس گم کردہ راہ مسافر کی مانند ہے جسے تاریکی میں چراغ کی روشنی راستہ دکھادے اور دل کو یقین کی دولت نصیب ہو جائے۔

یہ اس تھکے ہوئے راہی کی طرح ہے جسے جھلستی دھوپ میں

چھاؤں کا سایہ مل جائے اور روح کو تازگی حاصل ہو۔ اور یہ اس مسافر کی طرح ہے جو طویل مسافت کے بعد اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھے تو مضطرب دل کو لمحاتی قرار میسر آ جائے، لیکن یاد رہے--- یہ سب سکون عارضی ہیں، اصل قرار اُس منزل میں ہے جہاں سفر ختم ہوتا ہے اور امانت لوٹا دی جاتی ہے۔

لیکن پیارے یہاں کی مسکراہٹیں عارضی ہیں، یہاں کے غم بھی مستقل نہیں، مستقل اگر کچھ ہے تو وہ واپسی کا وعدہ ہے--

وہ ساعت جس میں ہر قدم کا حساب اور ہر نیت کا وزن ہوگا۔

پس دانا وہی ہے جو سفر میں رہتے ہوئے منزل نہ بھولے اور عاقل وہی ہے جو عارضی قیام میں ابدی تیاری کرے۔

اس سفر کا آخری پڑاؤ وہ ہے جہاں ہر انسان کو خموشی کے ایک ایسے دروازے سے گذرنا ہے جس کے بعد نہ دنیا کی دوڑ باقی رہتی ہے، نہ حرص و ہوس کی پرچھائیاں۔

موت...... جسے لوگ خوف کہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہی ہر انسان کی سب سے بڑی ملاقات ہے--- اپنے رب سے، اپنی حقیقت سے، اپنے انجام سے، یہ ایک لمحہ نہیں، ایک کیفیت ہے، ایک صدا ہے جو ہر دھڑکن میں چھپی رہتی ہے، ایک دروازہ ہے جو ہر آنکھ کے سامنے کھلا ہے مگر نظر نہیں آتا۔

موت وہ صداقت ہے جسے ہم بھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی وہ دھوکہ ہے جو ہمیں اس بھول میں رکھتا ہے۔

ہم کل کے منصوبے بناتے ہیں، برسوں کے خواب سجاتے ہیں اور یوں گمان کرتے ہیں جیسے وقت ہمارے اختیار میں ہو--- حالاں کہ وقت ہماری مٹھی سے ریت کی طرح پھسل رہا ہوتا ہے۔ ہم دیواروں کو مضبوط کرتے ہیں، مگر اساسِ حیات کی کمزوری نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم نام و نمود کے چراغ جلاتے ہیں مگر دل کے اندھیرے بجھانے کی فرصت نہیں پاتے۔ زندگی ہمیں مصروف رکھتی ہے، اس قدر مصروف کہ ہم اصل سوال پوچھنا بھول جاتے ہیں: ''ہم کہاں سے آئے تھے......اور کہاں لوٹ کر جانا ہے؟''

یہ دنیا ہمیں آسائش کے خواب ضرور دکھاتی ہے مگر ہر آسائش کے پیچھے زوال کی تحریر بھی ساتھ لکھ دیتی ہے۔ یہ ہمیں بقا کا وہم دیتی ہے، حالاں کہ اس کے ہر منظر پہ فنا کی مہر ثبت ہے۔ موت کی یاد کو ہم منحوس سمجھ کر دل سے دور کر دیتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی یاد دل کو زندہ رکھتی ہے۔

جو موت کو یاد رکھتا ہے، وہ زندگی سنوار لیتا ہے اور جو زندگی کے فریب میں کھو جاتا ہے، وہ موت کے سامنے خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ پس دانائی یہ نہیں کہ ہم موت سے بھاگیں، دانائی یہ ہے کہ ہم اسے اپنی اصلاح کا آئینہ بنا لیں--- کیوں کہ جو انجام دیکھ کر جیتا ہے، وہی حقیقت میں کامیاب زندگی گذارنے کا ہنر جانتا ہے۔

جب پردے اٹھتے ہیں، تب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل حیات تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں دنیا ختم ہوتی ہے۔

یہ تحریر انہی لمحوں کا بیان ہے-- ان لمحوں کا جو ہر انسان کے مقدر میں لکھے ہوئے ہیں مگر ہر انسان انہیں مختلف کیفیتوں میں جیتا ہے۔

موت کے یہ چھ مراحل ہیں......

بلکہ انسانی روح کے چھ سفر ہیں--- دنیا سے رب تک، خوف سے سکون تک، پردے سے حقیقت تک۔

آیئے اپنے دلوں کو نرمی عطا کریں، اپنی آنکھوں کو فکر بخشیں اور اپنی روح کو اس سفر کی حقیقت کے لیے تیار کریں--- کیونکہ سخت دل آخرت کی آواز نہیں سن پاتے اور غافل آنکھیں نشانیاں دیکھ کر بھی اندھی رہتی ہیں۔ اپنے باطن کی گرد جھاڑیں تاکہ ضمیر کی روشنی پھر سے چمک اٹھے۔ اپنی خواہشوں کے شور کو کچھ دیر کے لیے خموش کریں، تاکہ ربّ کی پکار صاف سنائی دے۔ اپنے دنوں کو محاسبے کا ذوق دیں اور اپنی راتوں کو مناجات کی نمی کہ ایک آنسو جو اخلاص سے گرے، وہ برسوں کی غفلت دھو سکتا ہے۔ اپنے قدموں کو سنبھالیں، کیونکہ ہر قدم ایک گواہی ہے، اپنی زبان قابو میں رکھیں، کیونکہ ہر لفظ امانت ہے اور اپنے ارادے درست کریں، کیونکہ اعمال کی قدر نیتوں سے بڑھتی

ہے۔

یہ سفر اچانک شروع نہیں ہوگا--- یہ تو جاری ہے، ہر سانس کے ساتھ، پس تیاری بھی آج ہی سے ہو، اسی لمحے سے ہو، کہ کون جانے اگلا لمحہ ہمیں میسر ہو یا نہ ہو۔

ہم سب اپنے اپنے راستوں پہ چلتے ہوئے اس بات سے بے خبر رہتے ہیں کہ جس منزل تک سب کو پہنچنا ہے، وہ ہماری ہر دھڑکن کے قریب ہے مگر ہماری ہر خواہش کی پہنچ سے دور۔

موت...... وہ لفظ جسے زبان بولنے سے جھجکتی ہے مگر وہ حقیقت جسے جسم کی ہر رگ جانتی ہے۔ یہ وہ راز ہے جو ہر دھڑکن کے ساتھ ہمارے اندر لکھا جا رہا ہے مگر ہم اسے پڑھنے سے گریزاں رہتے ہیں، یہ وہ صداقت ہے جسے ہم مجلسوں میں ٹال دیتے ہیں لیکن تنہائیوں میں دل بے اختیار اسی کی طرف لوٹتا ہے، یہ وہ دروازہ ہے جس پہ سب کو دستک دینی ہے، چاہے کوئی مان لے یا انکار کرتا رہے۔

موت خوف کا نام نہیں، بیداری کا نام ہے، یہ فنا کی نہیں، اصل بقا کی ابتدا ہے، یہ دنیا کی نیند سے جگانے والی صدا ہے، جو کہتی ہے: ''جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، سب عارضی ہے، جو تم سے چھپا ہوا ہے، وہی دائمی ہے۔''

انسان اسے انجام سمجھ بیٹھتا ہے، حالاں کہ یہ تو ایک نئے آغاز کا پہلا قدم ہے۔ یہ پردہ گرنے کا لمحہ نہیں بلکہ پردہ اٹھنے کی ساعت ہے--- جہاں حقیقت اپنی پوری روشنی کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

کاش! ہم اس لفظ سے خوفزدہ ہونے کی جگہ اس کی حکمت سمجھ لیں اور اس کی یاد کو اپنے دلوں کی اصلاح کا ذریعہ بنا لیں--- کہ جو موت کو یاد رکھتا ہے، وہ زندگی ضائع نہیں کرتا۔

انسان کی پوری زندگی ایک سفر ہے--- روشنی اور سایوں کا سفر، امید اور خوف کا سفر، آزمائش اور ربّ کی طرف لوٹنے کا سفر اور اس سفر کی سب سے آخری منزل وہ ساعت ہے جسے ہم موت کہتے ہیں، وہ لمحہ جسے قرآن کریم نے کہا اور حق کہا ''كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ'' موت کا مزہ ہر ذی روح کو چکھنا ہے۔ مگر قلبِ انسانی کا عجیب معاملہ ہے کہ جس چیز کا یقین سب سے زیادہ ہے، اسی کے بارے میں غفلت سب سے شدید ہے۔

موت کے قریب آنے کی وہ نشانیاں جو احادیث و آثار میں بیان ہوئی ہیں، دراصل صرف طبی علامات نہیں بلکہ روحانی پردوں کے اٹھنے کا سلسلہ ہے--- ایک ایسا سلسلہ جس میں ہر سانس انسان کو اپنے رب کے قریب اور دنیا سے دور کرتی چلی جاتی ہے۔

پہلا لمحہ--- وہ دن جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

انسان صبح بیدار ہوتا ہے، روزمرہ کے معمولات نبھاتا ہے، زندگی کے رنگوں میں گھرا رہتا ہے مگر تقدیر کے دفتر میں اس کے نام کے آگے ایک خموش تاریخ لکھی جا چکی ہوتی ہے۔

یہ وہ دن ہے جب فرشتوں کو حکم ملتا ہے: ''زمین پر اتر جاؤ، میرا بندہ آج مجھ سے ملاقات کرے گا......'' کتنا عجیب منظر ہے: فرشتے اتر رہے ہیں، شیطان کھسک رہے ہیں مگر انسان اپنی بے خبری میں وہی روزمرہ کے کام کرتا ہے۔ دل ضرور کوئی اشارہ دیتا ہے-- مؤمن کے سینے میں ایک لطیف سکون......

اور گناہ گار کے دل میں بے نام سا بوجھ۔ قرآن کی صدا اسی حقیقت کی طرف بلاتی ہے:

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ○

اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر جان کو اس کے کیے کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (سورۃ البقرۃ:۲۸۱)

اور ہم...... دنیا کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔

جب موت کی گھڑی آتی ہے، آسمانی فیصلے زمین کے دروازے کھولتے ہیں۔ انسان کو کچھ اندازہ تک نہیں ہوتا کہ اس کے نصیب کا دن آ پہنچا ہے مگر دل کے نہاں خانوں میں کہیں کوئی بے نام سی کیفیت اترتی ہے--- مؤمن کے سینے میں سکون کی نرم روشنی اور گناہ گار کے دل میں ایک بے سبب گھبراہٹ...... روح آہستہ آہستہ جسم سے

رخصت کا سفر شروع کرتی ہے۔

پہلے پاؤں بے جان ہوتے ہیں، پھر گھٹنے، پھر کمر اور انسان یہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ یہ کمزوری نہیں...... یہ واپسی ہے۔

کھڑے ہونے کی طاقت جاتی رہتی ہے، ہونٹ خشک ہونے لگتے ہیں، سانس بے ترتیب ہوتی ہے۔ گھر والے کہتے ہیں ''گھبراہٹ ہے......تھکن ہے...... کچھ دیر آرام کر لیجیے......'' لیکن فرشتوں کے قدم قریب آ چکے ہوتے ہیں۔

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾

ہاں ہاں جب جان گلے کو پہنچ جائے گی، اور کہیں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرے، سمجھ لے گا کہ یہ جدائی کی گھڑی ہے اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ (سورہ القیامہ: آیت: 29,28,27,26)

جب روح حلق تک آ پہنچتی ہے تو اس وقت انسان پوری شدت سے اپنے اندر کی آواز سنتا ہے۔

اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی رشتہ چھوٹ رہا ہے، کوئی پردہ اٹھ رہا ہے...... کوئی دروازہ کھل رہا ہے...... لوگ اس کے آس پاس بے بسی سے کھڑے ہوتے ہیں ''کوئی دم کر دے......''

''دعا پڑھو......'' ''ڈاکٹر کو بلاؤ......''

مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا دروازہ بند ہو رہا ہوتا ہے اور آخرت کا دروازہ کھلنے لگا ہوتا ہے۔ پنڈلی پنڈلی میں لپٹ رہی ہے، گویا دنیا سے ناتا ٹوٹ رہا ہے اور آخرت بلانے لگی ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے جہاں انسان دنیا کے تمام رنگوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو زندگی بھر نہ دیکھ سکیں- فرشتوں کے چہرے، نور کے آسمانی دروازے یا پھر غضب کے سیاہ بادل--- جسے اللہ تعالیٰ چاہے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: بیشک تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھایا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ (سورۃ: ق آیت: 22)

شیطان آخری حملہ کرتا ہے---مگر مؤمن کی زبان بے اختیار پکار اٹھتی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ﴿٩٧﴾ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ﴿٩٨﴾

ترجمہ: اور تم عرض کرو کہ اے میرے رب تیری پناہ شیاطین کے وسوسوں سے اور اے میرے رب تیری پناہ کہ وہ میرے پاس آئیں۔ (سورۃ المؤمنون؛ آیت: 97،98)

یہ وہ پناہ ہے جسے قبولیت کا سب سے قریب لمحہ کہا جاتا ہے۔

پھر اچانک ملک الموت انسان کے سامنے ہوتے ہیں۔ مؤمن کے لیے وہ نور، مسکراہٹ اور سلام کے ساتھ آتے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

ترجمہ: اے اطمینان والی جان، اپنے رب کی طرف واپس ہو یوں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر میرے خاص بندوں میں داخل ہو اور میری جنت میں آ۔ (سورۃ الفجر: آیت: 27،28،29،30)

اس وقت کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی تھکے ہوئے مسافر کو گھر کی دہلیز دکھا رہے ہوں، جیسے طویل صحرا کی مسافت کے بعد دور کہیں پانی کی جھلک نظر آ جائے، جیسے برسوں کی جدائی کے بعد ماں کی آغوش سامنے کھل جائے، جیسے اندھیری رات کے بعد اذان کی پہلی آواز فضا میں اتر آئے، جیسے طوفان میں بھٹکتی کشتی کو ساحل کی روشنی راستہ دکھانے لگے، جیسے قید کی گھٹن کے بعد کھلی ہوا کا پہلا جھونکا چہرے کو چھو لے، جیسے گرد آلود پیشانی کو سجدے کی ٹھنڈی مٹی نصیب ہو جائے، جیسے بے قرار دل کو اچانک اپنے محبوب کی قربت میسر آ جائے، جیسے لمبی مسافت کے بعد مسافر اپنے نام کی تختی دروازے پر دیکھ لے اور اسے یقین ہو جائے کہ اب بھٹکنا ختم، اب ٹھہرنا نصیب کا حصہ بن گیا۔

لیکن گناہ گار کے لیے......ان کی آمد سختیوں کی صورت میں ہوتی ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾

ترجمہ: تو کیسا ہو گا جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے ان کے منھ اوران کی پیٹھیں مارتے ہوئے۔(سورہ محمد، آیت: 27)

چہرے پہ ضرب، پیٹھ پہ ضرب، روح کانٹوں کی طرح کھینچ کر نکالی جاتی ہے، جیسے کسی خشک شاخ میں الجھی روئی کو بے دردی سے نوچا جارہا ہو، جیسے تنگ غار سے زبردستی نکالے جانے والا پرندہ اپنے پر زخمی کر بیٹھے، جیسے لوہے کی کنگھی ریشم کے تاروں کو چیرتی ہوئی گذر جائے، جیسے صدیوں کی پیاس کو نمکین پانی سے بجھانے کی کوشش کی جائے، جیسے ٹوٹے ہوئے شیشے کے کناروں سے کپڑا کھینچا جائے اور ہر سمت سے چاک ہو جائے، جیسے اندھیری آندھی میں چراغ کو جھٹکوں سے بجھایا جارہا ہو، جیسے زخم پر مرہم کی بجائے نمک رکھا جائے اور درد کئی گنا بڑھ جائے۔

وہ ساعت سختی کی ساعت ہے، جب غفلت کی نیند ٹوٹتی ہے اور انسان کو اپنے اعمال کی کھردری حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

وہی انسان جو دنیا میں موت سے بھاگتا تھا، اب موت اسے اپنی طرف بلا رہی ہوتی ہے۔

روح جسم سے نکل کر ایک نئے جہان میں قدم رکھتی ہے۔ دنیا کا ہجوم پیچھے رہ جاتا ہے۔ منصب، دولت، گھر، خاندان......سب کچھ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اب صرف عمل ساتھ رہ جاتا ہے، وہ عمل جسے کبھی ہم نے حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا اور وہ گناہ جسے معمولی سمجھ کر ہم اس کا ارتکاب کرتے رہے۔ گناہ گار چیختا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ ﴿١٠٠﴾:

ترجمہ: یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آئے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے واپس پھیر دیجئے۔ شاید اب میں کچھ بھلائی کماؤں اس میں جو چھوڑ آیا ہوں۔(سورۃ المؤمنون)

لیکن جواب آتا ہے:

كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (100)

ہشت، یہ تو ایک بات ہے جو وہ اپنے منہ سے کہتا ہے اوران کے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جس میں اٹھائے جائیں گے۔

ایک مفسر سے پوچھا گیا:

''لوگ موت سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا: ''کیونکہ انہوں نے دنیا آباد کی اور آخرت ویران چھوڑ دی۔''

یہی وہ جملہ ہے جو پوری زندگی کا خلاصہ ہے۔

ایسا انجام جو دل میں لرزش بھی پیدا کرے اور روح میں روشنی بھی، جو خوف کی سنجیدگی بھی عطا کرے اور امید کی حرارت بھی، ایسا اختتام جو آنکھوں کو نم کر دے مگر دل کو مایوس نہ ہونے دے، جو حساب کی یاد بھی دلائے اور رحمت کے دروازے بھی وا رکھے، ایسی ساعت جو انسان کو اپنی کمزوری کا احساس بھی دے اور اپنے رب کی قربت کا یقین بھی، جو نفس کی سرکشی توڑ دے اور یقین کی شمع روشن کر دے، ایسا لمحہ جو گناہوں پہ ندامت کی چادر ڈال دے اور توبہ کی روشنی جگا دے، جو دل کو جھنجھوڑ بھی دے اور سنوار بھی دے، ایسا بیان جو انجام کی ہیبت دکھائے مگر انجام کی رحمت بھی سمجھائے کہ خوف اگر حد میں ہو تو ہدایت بنتا ہے اور امید اگر صداقت کے ریشمی غلاف میں لپٹی ہوئی ہو تو نجات کا راستہ کھول دیتی ہے۔

آخر کار انسان اس سفر میں تنہا رہ جاتا ہے، وہ سفر جس میں نہ رشتہ ساتھ چلتا ہے، نہ دولت، نہ عزت کے تمغے......

صرف اعمال کا سایہ ہم سفر بنتا ہے اور نیت کی روشنی راستہ دکھاتی ہے، وہ راہ جس میں آوازیں خموش ہو جاتی ہیں اور ہر لمحہ دل کی دھڑکن کی بازگشت سنائی دیتی ہے، جہاں فریب کی دنیا پیچھے رہ جاتی ہے اور

حقیقت کے آئینے سامنے کھل جاتے ہیں، وہ راہ جس میں وقت کی زنجیریں بکھر جاتی ہیں اور ہر قدم کی گواہی صرف ضمیر دیتا ہے، جہاں مسکراہٹیں، رتبے اور مال و دولت اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں اور صرف عمل کی گہرائی باقی رہتی ہے۔ وہ نور یا اندھیرا جو ہم نے اپنی زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں سے بویا تھا۔

یہ سفر تنہائی کا نہیں، بلکہ روح کی آزادی کا ہے، جہاں ہر قدم سچائی کی طرف، ہر سانس رحمت کی طرف اور ہر آنکھ آنسوؤں کے ساتھ روشنی کی طرف لے جاتی ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے جب انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ صرف وہ اعمال ہیں جو دل سے کیے گئے ہوں۔

موت کا یہ بیان محض ایک تذکرہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر مسافر کے لیے وہ آئینہ ہے جس میں وہ اپنا آج بھی دیکھ سکتا ہے اور کل بھی۔

اگر دل میں خوف ابھرا ہے تو یہ خوف رحمت کی علامت ہے، اگر آنکھوں میں نمی اتری ہے تو یہ نمی دل کے زندہ و بیدار ہونے کی نشانی ہے، اگر سانس رکی ہوئی محسوس ہوئی تو یہ توقف زندگی کی اہمیت یاد دلانے کا پیغام ہے اور اگر دل دھڑکنے لگا تو یہ دھڑکن انسان کے اندر بیداری اور نیت کی روشنی کا اشارہ ہے، اگر کانوں میں خاموشی چھا گئی تو یہ سکوت ربّ کی قربت کا احساس دیتا ہے اور اگر لبوں پر کلمہ بے اختیار آیا تو یہ زبان کی صداقت اور ایمان کی تاثیر کی نشانی ہے، اگر ہاتھوں نے کانپنا شروع کیا تو یہ عمل کی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور اگر آنکھوں نے منظر غور سے دیکھا تو یہ بصیرتِ باطن کی روشنی ہے۔

یہ ساری علامات، لمحوں کی سفیر ہیں، جو انسان کے دل کو نرم کرتی ہیں، روح کو سنبھالتی ہیں اور اسے اس سفر کی حقیقت کے لیے تیار کرتی ہیں جہاں صرف اعمال اور نیتیں ہمسفر ہوں گی۔

یہی وہ لمحے ہیں جب انسان اپنے اندر کے شور کو خاموش کر کے اپنے رب کی پکار سن سکتا ہے، وہ پکار جو ہر روح کو محبت سے بلاتی ہے:

"لوٹ آؤ......میرے بندے!

دنیا تمہیں تھکاتی رہے گی، میرے سوا کہیں قرار نہیں......

زندگی کے اس ناپیدا کنار ساحل پہ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں مگر ہر ایک کی منزل اس کے عمل کے مطابق ہے۔

یہ کشتی خموش پانیوں میں آگے بڑھ رہی ہے، جہاں لہریں سب کو ایک طرح نہیں سنبھالتیں اور ہوا ہر مسافر کو اپنے انداز سے آزما رہی ہے۔

سب کے ہاتھوں میں ایک ہی سہارا ہے مگر کچھ کے دل مضبوط ہیں اور کچھ کے دل لرزتے ہیں، چنانچہ منزل کی روشنی ہر کسی کے لیے الگ ہے۔ یہ راستہ ایک ہی ہے مگر جو شخص صبر، نیت اور ایمان کے بادبان لگائے، وہ طوفان سے گذرتے ہوئے بھی نور کی طرف پہنچتا ہے۔

یاد رکھیے! یہ سفر مشترک ہے مگر ہر قدم کا حساب اور ہر سانس کی قیمت صرف آپ کے اعمال کے مطابق لگائی جائے گی۔ اور جس نے دنیا کے بوجھ کم اور آخرت کے لیے تیاری زیادہ کی، اس کی کشتی آرام و سکون کے کنارے پہ پہلے رکے گی۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہم دنیا کی دوڑ میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے سفر میں ہمیں وہ پہلا قدم بھی اٹھانا ابھی باقی ہے جو توبہ اور اصلاحِ حال پہ قائم ہوتا ہے۔

لگتا ہے کہ ہم نے زمانے کی مسابقت میں سب کچھ حاصل کر لیا مگر وہ سکون، وہ اطمینان اور وہ روشنی ابھی بھی منتظر ہے، جو صرف دل کی پاکیزگی سے ملتی ہے، ہم نے شہرت کے مینار بلند کیے مگر وہ مقامِ قرب جو رب کے حضور حاصل ہوتا ہے، ابھی ہم سے فاصلے پر ہے۔

ہم نے مال و دولت کے خزانے جمع کیے، مگر اعمال کی وہ شمع، جو قبر کے اندھیروں کو روشن کرتی ہے، ابھی اس کا انتظام باقی ہے۔

ہماری ہر کامیابی دنیا کی روشنی ہے، مگر آخرت کی روشنی وہی ہے جو دل کے اندر اتر جائے اور روح کو منزل کی طرف کھینچ لے۔

پس فکر کیجئے! دنیا کے سفر میں آگے بڑھنا کافی نہیں، آخرت کے سفر کا پہلا قدم---توبہ، نیت کی صفائی، اور اعمال کی اصلاح کے لیے ابھی قدم اٹھانا باقی ہے۔

آیئے! اپنی زندگی کو اس دن کے لیے تیار کریں جس دن زمین کی مٹی ہماری زیست کی آخری پناہ بنے گی اور آسمان کی خموشی ہماری ہر

گفتگو کا جواب دے گی۔

آیئے! اپنے دلوں میں وہ روشنی جگائیں جو قبر کے اندھیروں کو چیر کر جنت کی طرف لے جاتی ہے، اپنے اعمال کی شفافیت کا نظم کریں، اپنے ارادے درست کریں تا کہ ہر سانس ہمیں رب کی قربت کی طرف کھینچے۔

اپنے دلوں کے پردے اتاریں، اپنی آنکھوں کو بصیرت دیں اور اس عظیم سفر کے لیے اپنی روح کی تربیت کا سامان کریں، اپنی خواہشات کے بھڑکتے ہوئے شعلے کم کریں اور تقوے کی روشنی بڑھائیں، تا کہ ہر قدم امن اور اطمینان کی طرف لے جائے، اپنی زبانوں میں کلامِ حق جگائیں، اپنے ہاتھوں میں صدقہ وخیرات کا سامان رکھیں اور اپنے دلوں میں عاجزی وخشوع کا درس پیدا کریں، زندگی کی اس عارضی روشنی کو آخرت کی دائمی روشنی میں بدلنے کا عہد کریں، تا کہ جب موت کا لمحہ آئے، ہم ڈر کے اندھیروں میں نہ بھٹکیں بلکہ ایمان اور رحمت کے نور میں منزل کی طرف رواں ہوں، اپنے ہر عمل کو اپنے رب کی رضا کے لیے وقف کریں اور ہر لمحہ آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنائیں، کیونکہ یہی وہ وقت ہے جس کے لیے ہر انسان کا اصل امتحان ہے اور یہی وہ روشنی ہے جو ہر اندھیری گلی میں امید کی کرن بن کر چمکتی ہے۔

اپنے اعمال کو اس رحمت سے جوڑ دیں جس کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہے، اگر وہ لمحہ اخلاص سے بھر جائے۔

اور آخر میں...... اپنے رب سے وہی دعا کریں جس سے بڑھ کر کوئی دعا نہیں:

اے اللہ تعالیٰ! جب ہماری روح تیرے حضور آئے تو شرمندگی نہیں، مسکراہٹ ہمارے چہرے پر ہو، خوف نہیں، یقین ہمارے دل میں ہو، اندھیرا نہیں، نور ہماری پیشانی پر ہو، جب ہماری زندگی کے اعمال کے حساب کا لمحہ آئے، تو ہمارے دل مطمئن ہوں، آنکھیں روشن ہوں، اور ضمیر خود کو سکون کے سمندر میں تیرتا ہوا محسوس کرے۔

اے رب! جب موت کی ساعت دستک دے، تو ہمیں بے بسی کا احساس نہ ہو بلکہ تیرا قرب ہمارے دل کو پُرسکون کر دے اور ہماری روح کو شمع کی طرح روشنی دے، اے مہربان! جب ہم قبر کی تنہائی میں ہوں، تو خوف کے سائے نہ ہوں، تنہائی میں سکون ہو اور ہماری ہر سانس رحمت کی خوشبو سے مہک رہی ہو۔

اے مالک! ہمیں اپنی رحمت کی چھاؤں میں رکھ، گناہوں کی وزنی اور مضبوط زنجیریں توڑ دے اور ہماری روح کو جنت کی روشنی کی طرف اُٹھا لے، تا کہ ہم تیرے حضور اطمینان اور رضا کے ساتھ پہنچیں۔

اے اللہ! ہمیں دنیا کی فریب کاریوں سے محفوظ فرما، آخرت کے سفر کے لیے مضبوط کر اور جب ہم تیرے حضور آئیں، تو صرف حمد و شکر اور طاعت کے جذبے ہمارے دل وجان پر چھائے ہوں۔

ہمارا خاتمہ ایمان پر، محبت مصطفیٰ ﷺ پر اور تیری رحمت کے سائے میں ہو۔ آمین یارب العالمین بجاہ النبی الامین ﷺ



حصولِ علمِ دین وہ سعادت ہے جو دل کو نور اور فکر کو وقار عطا کرتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو انسان کو اپنے رب کی معرفت، اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے معاشرے کی رہنمائی کا شعور بخشتا ہے۔ عبادت کی روح، معاملات کی درستگی اور کردار کی پختگی--- سب علمِ دین ہی کے فیض سے سنورتے ہیں۔ جس دل میں علمِ دین کی روشنی اتر جائے، وہاں شکوک کی تاریکیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہی علم انسان کو ذمہ داری کا احساس دیتا اور زندگی کو مقصدیت عطا کرتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اسے حاصل کر کے خود بھی منور ہوں اور دوسروں کے لیے بھی چراغِ ہدایت بن جائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
فیصل آباد، پاکستان

درود شریف -- پیغام سرمدی

محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ ایسا قلبی تعلق اور ذہنی جھکاؤ ہے جو روابط کی متضادات حیثیت کے حوالے سے مختلف افراد کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ نسبی تعلق، معاشرتی اخوت، ذہنی ہم آہنگی اور مقاصد کا اشتراک اس کے محرک بنتے ہیں۔ اسلام ان محبتوں کی نفی نہیں کرتا بلکہ انہیں اپنے محدود دائروں میں نشو ونما دینا چاہتا ہے مگر یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ یہ اپنے حدود سے متجاوز نہ ہوں۔ اسلام کے نزدیک محبتوں کا مرکز اصلی اور نقطۂ عروج اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے۔ اسلام اصرار کرتا ہے کہ اس محبت کو فوقیت اور برتری حاصل رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہر صاحب ایمان پر فرض ہے۔ محبت اطاعت کی روح بھی ہے اور محرک بھی۔ جذبات محبت ہی اطاعت کو وقار بخشتے ہیں۔ یہ بھی کہ اطاعت ایمان کا ثمر ہے اور ایمان بغیر محبت متحقق ہی نہیں ہوتا۔ ارشاد نبوی ہے:

لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس أجمعين۔

ترجمہ: تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہے جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الایمان عن انس رضی اللہ عنہ بن مالک، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن انس رضی اللہ عنہ بن مالک)

حلاوت ایمان کی حدیث میں "مما سواهما" ارشاد فرما کر دیگر ممکن مراکز محبت کا بھی ذکر فرما دیا تا کہ فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں اس مطلق حکم سے کوئی جواز کی صورت نہ نکال لی جائے اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوتاہی سرزد نہ ہو جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اظہار کے ذریعے اس کا ازالہ کر لیا۔ عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے ہر شے سے سوائے اپنی جان کے محبوب ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لا والذي نفسي بيده حتى أكون أحب إليك من نفسك" نہیں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے حتی کہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی محبوب تر نہ ہو جاؤں۔"

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوری عرض کیا: "والله لأنت أحب إلي من نفسي" اللہ تعالیٰ کی قسم! آپ تو مجھے میری جان سے بھی محبوب تر ہیں۔ اس پر تصدیق ہوئی: "الآن يا عمر" اب بات بنی اے عمر! (رضی اللہ عنہ۔)

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب یف ان حبّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عن عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ)

اس واضح ارشاد نے ثابت کر دیا کہ محبت شراکت برداشت نہیں کرتی۔ محبت جذبۂ صادق ہے اور صدق دوئی پسند نہیں۔ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ایسی یک سوئی چاہتی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ قرآن مجید نے محبت کو ایمان کی بنیاد قرار دیا اور ایمان شرک سے منزہ ہے۔ اس لیے محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ کوئی شراکت برداشت کرتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مداہنت۔ محبت اپنے مظاہر میں پوری زندگی کو محیط ہوتی ہے۔ ہر لحہ اور ہر رو یہ محبت کی مہکار سے فروزاں ہوتا ہے۔ اگر دل محبت سے مخمور ہے تو زبان انہی کے ترانے گانے میں لذت پاتی

۔ یہ محبت کی پرانی ریت ہے کہ وہ دل میں مسکن بناتی ہے تو زبان اس کے اظہار کے لیے عمدہ سے عمدہ انداز مدح اختیار کرنے کو بے تاب رہتی ہے۔ مولانا آزاد نے کہا تھا: ''یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو نام دل کو محبوب ومحترم ہو وہ زبان پر گزرے اور احترام سے خالی ہو۔''
(الہلال، ۱۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۱)

ایک محدث سے جب حدیث نبوی ﷺ سے لگاؤ کا سبب پوچھا تو کہنے لگے: اس لیے کہ اس میں بار بار ''قال رسول اللہ ﷺ'' کا جملہ آتا ہے اور اس طرح اس کے ذکر اور اس پر درود وصلوٰۃ عرض کرنے کی تقریب ہاتھ آجاتی ہے۔ (حوالہ مذکورہ)

درود ایک فریضہ بھی ہے کہ اس کا حکم دیا گیا ہے اور اظہار محبت کا محفوظ تر ذریعہ بھی۔ دربار سید والا ﷺ میں اگر حاضری کی سعادت نصیب ہو، جذبات مچل رہے ہوں زبان کو عرضداشت کے کوائف نہ مل رہے ہوں مگر اظہار پر پہرہ بیٹھا ہو تو ایسے لمحوں میں درود وسلام کی پناہ ہی کام آتی ہے کہ ایسے لمحوں میں جذبات کو پابند آداب رکھنے کا یہی ذریعہ ہے۔ درود وسلام کا فیضان ہی سکون عطا کرتا ہے۔ یہ سکون انسانی زندگی کو ہر آن حاصل رہنا چاہیے کہ اس سے برکات کا نزول ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا زبان صدیقین سے: ''قال: الصلوة على النبي أمحق للخطايا من الماء للنار، والسلام على النبي ﷺ أفضل من عتق الرقاب'' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: نبی اکرم ﷺ پر دورود گناہوں کو مٹادیتا ہے اس پانی سے بڑھ کر جو آگ بجھاتا ہے اور نبی ﷺ پر سلام قیدی آزاد کرنے سے افضل ہے۔
(طبقات الشافعیہ، علامہ السبکی، الجزء الاول، ص ۹۲)

اسی لیے درود پڑھنے کے مواقع تلاش کیے جاتے ہیں کہ انسانی زندگی کی ہما ہمی اس سے غافل نہ کردے۔ نام مبارک (محمد ﷺ) آئے تو درود ضرور پڑھا جائے کہ یہ ساعتوں کا خراج بھی ہے اور نطق کی طہارت بھی۔ ''رغم أنف امرء ذكرت عنده فلم يصل علي'' ذلیل ہوا وہ انسان جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ پڑھا۔ (الترمذی، جلد ثانی، ابواب الدعوات، ص ۶۱۲)

یہی نہیں، خود کلام کرنا ہو، گفتگو کی ابتداء کرنا ہو، نقل افکار کی منزل ہو یا ربط باہم کا کوئی مرحلہ ابتداء درود ہی سے ہونا لازم ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی رحمت ﷺ کا یہ ارشاد بیان فرمایا: ''كل كلام لا يبدأ فيه بحمد الله والصلاة علي فهو أقطع أبتر ممحوق من كل بركة'' ترجمہ: ہر کلام جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور مجھ پہ درود سے شروع نہ کیا جائے وہ غیر متصل، بے نشان اور ہر برکت سے بے توفیق ہوتا ہے۔

معلوم ہوا حمد وصلوٰۃ سے ابتداء ہو تو اتصال معنیٰ، ربط کلام اور برکات کے نزول کی حمیت قائم ہوگی اور رحمتوں کا ہالہ ایسے کلام کی پناہ ہوگا۔ اس لیے یہ سلیقہ سمجھایا گیا کہ: ''اذا صلى احدكم فليبدأ بتحميد ربه والثناء عليه ثم يصلي على النبي ثم يدعو بعد بما شاء'' یعنی جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو رب کی حمد و ثناء سے ابتدا کرے، پھر نبی اکرم ﷺ پہ درود پڑھے، پھر اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔ (جلاء الافہام، حافظ ابن قیم، ص ۲۳)

صرف کلام پہ کیا موقوف، اہل قلم جب کسی مضمون یا کتاب کی ابتداء کریں ان کو بھی اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ دائمی برکات کا ذریعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''من صلى علي في كتاب لم تزل صلاته جارية له ما دام اسمي في ذلك الكتاب''، جس نے کسی تحریر میں مجھ پہ درود لکھا، اس کا درود اس وقت تک لگاتار ادا ہوتا رہے گا جب تک میرا نام اس تحریر میں موجود ہوگا۔ (طبقات الشافعیۃ الکبری، الجزء الاول، ص ۹۳)

''جلاء الافہام'' میں یہ خوشخبری بھی موجود ہے کہ جب تک تحریر یا کتاب میں میرا نام رہے گا، فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے رہیں گے۔ (ص ۳۵)

یہ بھی یاد رہے کہ اگر یہ برکت حاصل کرنے میں کوتاہی ہوئی تو نقصان بہت ہے اور اس پہ تنبیہ بھی روایت ہوئی ہے، ارشاد ہے: ''من نسي الصلاة علي خطئ طريق الجنة'' ترجمہ: جو مجھ پہ درود پڑھنا بھول گیا، وہ جنت کا راستہ بھول گیا۔ (جلاء الافہام، ص ۶۵)

علمائے امت نے ہر دور میں درود پاک کی کثرت کا درس دیا

ہے کہ یہ پیغام سرمدی ہے زبانوں کو ہم سخنی، بینائی کو ہم نظری اور قلوب و اذہان کو ہم مشربی کی دعوت دیتا۔ جس سے امت کا اتحاد اور ملت کی وحدت نمو پاتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تلقین فرمائی کہ:

'' واحضر فی قلبك النبی وشخصه الكریم وقل: السلام علیك أیها النبی ورحمة الله وبركاته''

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ اور آپ کی کریم شخصیت کو دل میں حاضر پاؤ اور کہو: اے نبی: ﷺ! آپ پر سلام اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکات ہوں ۔ (احیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۹۹) ان تعلیمات کے اثرات ہی تھے کہ حضرت میاں میر قدس سرہٗ (۱۰۴۵ھ) نے حیات مستعار کے آخری لمحے میں فرمایا: '' الصلوة والسلام علیك یا رسول الله الصلوة والسلام علیك یا رسول الله '' یہاں تک کہ دم چھوٹ گیا۔ (مآثر لاہور منشی محمد دین فوق، نقوش، لاہور، ص ۲۸۷)

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مناسب یہ ہے کہ ہر خطبہ، ہر کام شروع ہو تو حمد و ثناء کے ساتھ درود پڑھا جائے۔

(مطالعہ المسرات، ص ۹)

اس لیے مسلمان مصنفین میں یہ عادت راسخ ہوگئی کہ وہ نثر یا نظم ہر ایک کی ابتداء حمد وصلوٰۃ یا نعت سے کرتے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''کثرت درود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدی ﷺ سے ایک آدمی کو کتنا لگاؤ ہے اور نعمت ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ (ماہنامہ شام وسحر، نعت نمبر، ص ۳۱۶)

صوفیائے کرام کے ہاں درود کی کثرت معمول ہے۔ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت پہ یقین رکھتے ہیں جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''من صلی علی واحدة صلی الله علیه عشرا'' جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھا، اللہ تعالیٰ اس پہ دس مرتبہ رحمت نازل فرماتا ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ص ۱۷۵ - الترمذی، ابواب الثواب، ص ۲۲۴)

حضرت امام ابو محمد عبداللہ بن محمد بن سلیمان الجزولی السملالی الشریف الحسینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ''دلائل الخیرات'' کے مصنف ہیں۔ ہمہ وقت درود وسلام میں محویت ان کا معمول تھا۔ ۸۷۰ کے قریب انتقال ہوا مگر مدت تک دفن نہ کیے گئے، لاش تابوت میں رہی۔ ۸۹۰ھ کے بعد دفن کیے گئے، پھر ستر سال بعد وہاں سے نکال کر مراکش لے جائے گئے اور ''ریاض العروس'' میں دفن ہوئے۔ اس قدر طویل عرصے کے باوجود لاش پہ کوئی تغیر نہ آیا تھا، لوگ سمجھتے تھے کہ ابھی ابھی وصال ہوا ہے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۷، ص ۲۲۸)۔

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ جسم بالکل سالم تھا حتی کہ:

''اثر حلق از موی سرو ریش ظاہر شد گویا امروز اصلاح خط کردہ است''

ترجمہ: سر و داڑھی کے بال اس امر پہ شہادت پیش کر رہے تھے کہ آج ہی تازہ تازہ خط درست کروا کر آئے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ: ''گویند از مزار او رائحہ مشک می آید بسبب کثرت صلوٰۃ برآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''

ترجمہ: روایت ہے کہ ان کے مزار اقدس سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور یہ سب حضور اکرم ﷺ پہ کثرت سے درود شریف بھیجنے کی برکت ہے۔ (انحاف السنبلاء ص ۲۸۲)

درود پاک کی فرضیت، استحباب اور خوش آئند اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ صوفیاء، علماء، فقہاء حتی کہ عوام الناس کے ہاں درود کی محافل کا اہتمام کیا جاتا رہا اور حسب استطاعت درود پیش کرنے کے انداز کلمات اور طرز ادا میں اضافے ہوتے رہے۔ ہر صاحب علم اور ہر صاحب منزلت نے درود کے زمرے قالب بدل کر دربار خواجۂ عالم ﷺ میں پیش کیے۔ محبت کی یہ پرانی رسم ہے کہ محبوب کو خوبصورت الفاظ اور عمدہ کلمات سے یاد کیا جاتا ہے۔ عموماً اظہار محبت میں مروجہ اسماء والقاب ہی کا سہارا لیا جاتا ہے مگر بعض اوقات جذبے کی شدت اور اس کی خصوصی کیفیت نئے اسماء والقاب اور جدید تر پیرہن تراشنے پہ مجبور کرتی ہے تا کہ اظہار میں اپنائیت کا عنصر نمایاں ہو جائے۔ درود کی عبارات کا تنوع اسی جذبۂ اپنائیت کا مظہر ہے۔ ''حزب البحر'' یا ''دلائل الخیرات'' اسی جذبے کے روشن حوالے ہیں۔

''درود تاج'' بھی محبت کا ایک رواں دواں آبشار ہے جس میں جذبے اور پیرہن میں پیوستگی کی بہار ہے۔ لفظ رواں، معانی گل بداماں اور اسلوب دریائے نور کا عکس جمیل۔ جب سے درود کا یہ آہنگ سامنے آیا ہے اہل محبت سے خراج وصول کر رہا ہے۔



محمد ملک الظفر سہسرامی
malikuzzafar786@gmail.com

خموش چراغ کی روشنی

حضرت علامہ مفتی نعیم اللہ خان رضوی بستوی: ایک عہد، ایک روایت، ایک فکری امانت

علم و عمل کی تاریخ میں کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو تعارف کی محتاج نہیں ہوتیں، اس لیے کہ ان کا تعارف خود ان کا کردار و عمل بن جاتا ہے۔ وہ خود کو منظر پہ لانے کے ہنر سے واقف نہیں مگر پس منظر میں رہ کر تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں، وہ لفظوں کے ہجوم میں اپنی آواز تلاش کرتی ہیں اور نہ ہی شہرت کے چراغ جلانے کی خواہش رکھتی ہیں مگر ان کی موجودگی ایک ایسی خاموش دلیل ہوتی ہے جو بلند ترین خطبوں سے زیادہ اثر رکھتی ہے ان کے سکوت میں بھی ایک گہرا پیغام پوشیدہ ہوتا ہے- ان کی خموشی میں ایک تہذیبی وقار، ایک فکری استقامت اور ایک ایسا پیغام مضمر ہوتا ہے جو سننے کے لیے کان نہیں، سمجھنے کے لیے دل مانگتا ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو زمانے کے شور میں بھی اپنی خموش نسبت سے پہچانی جاتی ہیں اور جن کی زندگی اعلان نہیں بلکہ دلیل بن جاتی ہے۔

ان کا وجود محض جسمانی موجودگی نہیں بلکہ ایک فکری تسلسل، ایک اخلاقی روایت اور ایک زندہ ضمیر کی علامت ہوتا ہے۔ وہ اپنے کردار سے زمانے کو آئینہ دکھاتے ہیں، اپنے عمل سے قدروں کو جلا بخشتے ہیں اور اپنی استقامت سے آنے والی نسلوں کے لیے فکری سمت متعین کر دیتے ہیں۔ ایسی ہستیاں جب دنیا سے رخصت ہوتی ہیں تو محض ایک فرد کا خلا نہیں چھوڑتیں بلکہ ایک پورا عہد سوال بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات پہ اصل نقوش وہی چھوڑتے ہیں جو خود کو تاریخ بنانے کی بجائے تاریخ کو سنبھالنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ جو علم کو زینتِ مجلس نہیں بلکہ ذمہ داریوں کا زندہ احساس سمجھتے ہیں جو قیادت کو اقتدار نہیں بلکہ خدمت کا استعارہ جانتے ہیں اور جو دعوت کو شہرت نہیں بلکہ ذمہ داری کا تقاضا مانتے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو وقت کے شور میں گم نہیں ہوتا بلکہ وقت خود ان کے نام سے معنیٰ اخذ کرتا ہے۔

ایسے ہی رجالِ حق کی مبارک و مسعود فہرست میں حضرت علامہ مفتی نعیم اللہ خان رضوی بستوی علیہ الرحمہ کی ذات ایک روشن، متوازن اور باوقار مثال تھی۔ ان کی حیاتِ مستعار علم و عمل کے اس حسین امتزاج کا مظہر تھی جہاں الفاظ خاموش رہتے ہیں اور مفہوم ہم کلام ہوتا ہے اور کردار ایسا ہوتا جو کسی اعلان کے بغیر دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ ان کا وصال محض ایک عالمِ دین کی رحلت نہیں بلکہ اخلاص، استقامت اور بے لوث خدمت سے عبارت ایک فکری روایت کے اٹھ جانے کا نام ہے، وہ روایت جس میں علم نمود نہیں بلکہ ہدایت تھا، جس میں منصب وقار کا ذریعہ نہیں بلکہ ذمہ داری کی علامت تھا اور جس میں خدمت کا مفہوم صلہ یا ستائش نہیں بلکہ خاموش قربانی تھا۔ ان کی زندگی ایک چلتا پھرتا درس تھی---جس کے ہر جملے میں اخلاص، ہر بات میں شرافت اور ہر مشورے میں حکمت کا خزانہ پوشیدہ ہوتا تھا۔

آج المیہ یہ ہے کہ ہم سے خلوص رخصت ہو چکا ہے، مذہبی جذبات کے نعرے تو بلند ہیں لیکن جذبات خود معدوم ہو چکے ہیں۔ شور بہت ہے لیکن شعور کا فقدان ہے۔ سوشل میڈیا کے چرچے اور ہر محفل میں بلند ہوتے دعوے بتاتے ہیں کہ ہم زندہ دل ہیں لیکن حقیقت میں

عمل اور اخلاص کی کمی نے دلوں کو ویران کر دیا ہے۔

ہمارے اجتماعی رویے میں وہ توازن، وہ وقار اور وہ صبر کہیں نظر نہیں آتا جو ہمارے پیش رووں کی پہچان تھا۔ تقریبات میں رنگ و جلوہ، نعروں اور تصویروں کی برسات ہے مگر روح کی نمی، دل کی خلوص بھری پکار اور ایک دوسرے کے لیے سچی ہمدردی اور ذمہدار فکر غائب ہے۔ ہم صرف الفاظ کے تماشے دیکھتے ہیں، عمل کی حقیقت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر بلند نعرے کے پیچھے خالی پن، ہر پر جوش تقریر میں ادراک کی کمیابی اور ہر مظاہرے میں فکر کی کمی جھلکتی ہے۔ تعلیم اور شعور کی وہ تابانی جو ہماری شناخت تھی رفتہ رفتہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور ہم صرف ریاکاری اور دکھاوے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب امت کا معیار عمل اور اخلاص سے پرکھا جاتا تھا لیکن آج معیار صرف دکھاوے، شہرت اور وقتی فائدے کا ہے۔

اگر ہم نے خود کو اس خالی پن سے باہر نہیں نکالا تو یہ شور اور نعرے صرف فضول کی گونج بن کر رہ جائیں گے اور خلوص اور شعور کی کمی کا المیہ نسل در نسل بڑھتا جائے گا۔ ایسے میں وہ شخصیات جن کے کردار میں توازن، گفتار میں وقار اور عمل میں خلوص کا حسین امتزاج تھا ہمیں نہ صرف یاد آتی ہیں بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے نقوش کو اپنانا ہماری فکری و اخلاقی ذمہداری بھی بن جاتا ہے ان کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے وہ صرف شخصی نہیں، فکری اور اخلاقی بھی ہے مگر یہی خلا ہمیں یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے نقوش پہ چلنا ہی ان کی یاد کا سب سے معتبر تسلسل اور ان کے مشن کا سچا تحفظ ہے۔

یہ الفاظ ایک ادھورے پن کے کرب، ایک امانت دار احساس اور ایک فکری ذمہ داری کے تحت سپرد قرطاس ہو رہے ہیں--- کہ کل کے مسافر جان لیں کہ ہم نے روشنی کہاں سے مستعار لی، کن سایہ دار درختوں کے سائے میں علم و وقار کی تربیت پائی اور اب کن روشن نقوش کو دلوں میں محفوظ رکھ کر آگے بڑھانا ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے۔

علم و عمل کی دنیا میں بعض شخصیات محض افراد نہیں ہوتیں بلکہ وہ عہد کی علامت، روایت کی امین اور فکری تسلسل کی ضامن ہوتی ہیں۔

وہ اپنے زمانے کی فکری بے سمتی میں سمت نما کا کام دیتی ہیں، اقدار کے بکھراؤ میں میزانِ اعتدال بن کر کھڑی رہتی ہیں اور روایت و تجدد کے سنگم پہ اس حکمت کے ساتھ قدم رکھتی ہیں کہ نہ ماضی مجروح ہو اور نہ حال بے مہر۔ ایسی ہستیاں اپنے قول سے زیادہ اپنے عمل سے بولتی ہیں وہ خاموش رہیں تب بھی ان کی خاموشی معنیٰ سکھاتی ہے اور ان کی موجودگی تاریخ کے لہجے کو یقین بخشتی ہے۔ وہ چراغ نہیں ہوتیں جو صرف ایک کمرے کو روشن کریں بلکہ ایسی قندیل ہوتی ہیں جن کی لو سے نسلیں اپنی راہ پہچانتی اور اپنی شناخت محفوظ رکھتی ہیں ان کی خاموشی میں بھی درس ہوتا ہے اور ان کے وجود سے تاریخ کو اعتماد ملتا ہے وہ اپنی ذات سے تاریخ کو سانسیں عطا کرتی ہیں، اپنے کردار سے اقدار کو زندگی بخشتی ہیں اور اپنی خاموش محنت سے آنے والی نسلوں کے لیے سمتِ سفر کا تعین کرتی ہیں۔

وہ اس چراغ کی مانند ہوتی ہیں جو خود جل کر اجالے تقسیم کرتا ہے، شور و نمود سے بے نیاز رہ کر زمانے کے ضمیر کو بیدار کرتی ہیں اور اپنے صبر، استقامت اور وفا سے معاشروں کی اخلاقی بنیادوں کو مضبوط کرتی چلی جاتی ہیں یقیناً ان کے قدموں کی آہٹ تاریخ کے اوراق میں کم سنائی دیتی ہے مگر انہی کی نسبت سے عہد پہچانے جاتے ہیں اور انہی کی دعاؤں سے مستقبل کی راہیں محفوظ ہوتی ہیں ایسی ہستیاں وقت کے شور میں تحلیل نہیں ہوتیں، وقت خود ان کے حضور معنیٰ کی جستجو میں ٹھہر جاتا ہے۔ ان کی گفتار کم مگر وزن دار، ان کی تحریر مختصر مگر اثر آفریں اور ان کی سیرت ایسی ہوتی ہے جو بغیر اعلان دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ وہ چراغ کی مانند ہوتی ہیں--- خود جل کر علم و یقین کی راہیں روشن کرتی ہیں اور پیچھے اندھیرا نہیں بلکہ امید، اعتماد اور فکری تسلسل چھوڑ جاتی ہیں۔

حضرت علامہ مفتی نعیم اللہ خان رضوی بستوی علیہ الرحمہ کی شخصیت بھی یقیناً ایسے ہی شجرِ سایہ دار کی مانند تھی جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں تھکے ہوئے اذہان کو سکون، بھٹکتے ہوئے دلوں کو سمت اور علم کے

متلاشیوں کو اعتماد نصیب ہوتا تھا۔ ان کی مجلس علم و وقار کی آماجگاہ تھی، جہاں گفتگو میں شائستگی، اختلاف میں تہذیب اور فیصلوں میں تقویٰ جھلکتا تھا۔ وہ اپنے علم سے مرعوب نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اخلاق سے قائل کرتے تھے اور یہی ان کی عظمت کا اصل عنوان تھا۔ ان کی حیاتِ مستعار نے ثابت کیا کہ اصل بڑائی وسعتِ علم میں نہیں بلکہ وسعتِ قلب میں ہے--اور یہی وہ ورثہ ہے جو ان کے بعد بھی دلوں کو سیراب کرتا رہے گا۔

ان کا وصال محض ایک فرد کی رحلت نہیں بلکہ جماعتِ اہلِ سنّت کے علمی و روحانی افق پہ ایک عظیم سانحہ ہے، ایسا سانحہ جس نے ایک بھرپور عہد کے اختتام کا اعلان کر دیا، ایسا سانحہ جس نے درسگاہوں کی فضا کو سوگوار، مساجد کے منبر و محراب کو خاموش اور اہلِ علم کے دلوں کو اشکبار کر دیا۔ آپ علم کے امین ہی نہیں، اس کے وقار کے پاسبان بھی تھے آپ کی موجودگی میں اختلاف بھی شائستگی کے دائرے میں رہتا اور رہنمائی میں بھی شفقت کی حرارت محسوس ہوتی تھی۔ آج یہ خلا صرف تعداد کا نہیں، معیار کا ہے---اور یہی اس سانحے کی اصل شدت ہے کہ ایک ایسا چراغ رخصت ہوا ہے جس کی روشنی سمت بھی دیتی تھی اور حوصلہ بھی۔ یہ محض ایک عالمِ دین کا اٹھ جانا نہیں بلکہ اخلاص، استقامت اور بے لوث خدمت پر قائم ایک پورے مزاجِ حیات کا رخصت ہو جانا ہے۔

وہ عہد جس کی نمائندگی حضرت علامہ مفتی نعیم اللہ خان رضوی کرتے تھے، ایسا عہد تھا جہاں علم منصب نہیں بلکہ امانت سمجھا جاتا تھا، دعوت شہرت کا وسیلہ نہیں بلکہ ذمہ داری کا بولتا ہوا احساس ہوتی تھی اور قیادت غلبہ یا اقتدار کا نام نہیں بلکہ خدمت اور جواب دہی کا استعارہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کہیں تصنع نظر نہیں آتا، کہیں خودنمائی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی--- ہر قدم، ہر قول اور ہر فیصلہ اخلاص کی بنیاد پہ استوار نظر آتا ہے۔

ان کی رحلت دراصل اس خاموش مجاہد کا رخصت ہونا ہے جس نے ہنگامہ خیز ادوار میں بھی وقار کی بالادستی قائم رکھی، اختلافات کی آندھیوں میں اعتدال کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور اپنی پوری حیات سے اس حقیقت کی گواہی پیش کی کہ دین کا سب سے مؤثر پیغام زبان کے شور سے نہیں بلکہ کردار کے سکون سے ادا ہوتا ہے۔

حضرت علامہ مفتی نعیم اللہ خان رضوی اس عہد کی ایک معتبر اور مستند آواز تھے۔ وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے حقیقی ترجمان، حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے معتمد خلیفہ اور شمس العلماء حضرت علامہ مفتی نظام الدین بلیاوی قدس سرہٗ العزیز کے شاگرد رشید استاذُ الاساتذہ اور مذہب و ملت کے سچے پاسبان تھے۔ ان کی پوری زندگی مسلکی استقامت، علمی صلابت اور دعوتی وقار کی روشن مثال بن کر ہمارے سامنے ہے۔ اختلاف کے مواقع پہ ان کا لہجہ متوازن، استدلال مضبوط اور نیت شفاف رہی۔ وہ نہ نعرہ باز تھے، نہ شہرت کے اسیر--- بلکہ ان نفوسِ قدسیہ میں سے تھے جو خاموشی سے دین کی شمع جلاتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنیوں کی ایک قطار چھوڑ جاتے ہیں۔

منظرِ اسلام بریلی شریف کی مسندِ صدارت پہ طویل عرصہ فائز رہتے ہوئے انہوں نے درس و تدریس کو محض پیشہ نہیں بلکہ عبادت سمجھ کر نبھایا، علم کی شمع ان کے ہاتھ میں صرف روشنی نہیں، رہنمائی تھی، وہ طلبہ کے اذہان ہی نہیں، دلوں کی تربیت بھی کرتے تھے۔ درسگاہ ان کے لیے محض عمارت نہ تھی بلکہ ایک روحانی فکر و عمل کا میدان تھی جہاں فکر سنورتی، کردار نکھرتا اور شعور کو تقویٰ و پرہیزگاری کی سان پر تیز کیا جاتا۔ ان کی مجلسِ درس میں علم کے ساتھ حلم، استدلال کے ساتھ اخلاص اور روایت کے ساتھ بصیرت ہم قدم رہتی تھی اسی لیے ان کے تلامذہ علم کے امین ہی نہیں، اقدار کے علم بردار بن کر اٹھے۔ ان کے نزدیک علم کا مقصد محض معلومات کی ترسیل نہ تھا بلکہ کردار کی تعمیر اور فکر کی تہذیب تھا۔ اسی لیے ہر سبق میں اخلاق کی روشنی اور تقوے کی خوشبو شامل ہوتی اور ہر بحث میں ذہنوں کو بصیرت کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش رہتی۔ علم کے ساتھ وہ عاجزی اور خدمت کا سلیقہ بھی عطا کرتے تا کہ طلبہ نہ صرف سیکھیں بلکہ اپنے اعمال سے دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔ ان کی نگاہ میں تعلیم کا اصل معیار وہی تھا جو انسان کو فہم و فراست

کے ساتھ ساتھ ایمان وعمل میں بھی کامل بنائے۔

علمی جلال کے ساتھ ساتھ انکساران کی پہچان تھا۔ بلند علمی مقام کے باوجود انہوں نے سادہ طرزِ زندگی اختیار کیے رکھی، منصبی تفوق کا احساس کبھی کسی پر طاری نہ ہونے دیا اور ہر خاص وعام سے بے تکلفی، شفقت اور احترام کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔

ان کی شخصیت میں یہی توازن تھا کہ علمی عظمت اور روحانی وقار کے ساتھ ساتھ انسانی نزاکت اور سادگی ہمیشہ موجزن رہی۔ طلبہ اور شاگردوں کے ساتھ ان کی گفتگو صرف تعلیم نہیں بلکہ دلوں کی تربیت اور روحانی رہنمائی کا ذریعہ بنتی۔ ہر ملاقات میں محبت اور اخلاق کی ایسی خوشبو ہوتی کہ لوگ علم کے ساتھ ساتھ حسنِ خلق کی روشنی بھی لے کر جاتے۔ ان کے یہ اوصاف انہیں محض استاذ نہیں بلکہ ایک کامل مربی اور رہبر کی حیثیت عطا کرتے تھے۔

یہی ان کی شخصیت کا وہ پہلو تھا جو دلوں کو مسخر کر لیتا تھا اور شاگردوں کو محض طالبِ علم نہیں بلکہ وارثِ علم بنا دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ محفلِ درس میں ہر لفظ، ہر بات گویا ایک نورانی اثر چھوڑ جاتی تھی اور شاگردوں کے دلوں میں علم کے ساتھ اخلاق اور معرفت کا جذبہ بھی پروان چڑھتا تھا۔

ان کی تربیت میں صرف معلومات منتقل نہیں ہوتیں بلکہ شخصیت سازی کا ایک ایسا راز چھپا ہوتا تھا جو وقت کے ساتھ اور بھی واضح ہوتا جاتا۔

شاگرد جب زندگی کی راہوں پہ قدم رکھتے تو محسوس کرتے کہ استاذ کی تعلیمات نہ صرف علم بلکہ عمل کی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہیں۔

یہ خصوصیت انہیں محض ایک استاذ نہیں بلکہ دلوں کو چھو لینے والا رہنما اور فکری مشعلِ راہ بنا دیتی تھی۔

ان کی رحلت سے اہلِ سنّت ایک ایسے مربی، ایک ایسے راہ نما اور ایک ایسے محافظِ روایت سے محروم ہوگئی ہے جس کی گفتار میں ٹھہراؤ، تحریر میں وقار اور کردار میں استقامت تھی۔ ایسے نازک وقت میں جب امت فکری انتشار، اخلاقی ابتری اور قیادت کے بحران سے دوچار ہے ایسی متوازن اور باوقار شخصیت کا اٹھ جانا دل کو مزید بوجھل کر دیتا ہے اور احساسِ فقدان کو اور گہرا کر جاتا ہے۔

بلاشبہ اہلِ حق کی صفوں میں ایسے رجالِ کار کم پیدا ہوتے ہیں---مگر ان کی یاد، ان کی محنت، ان کی خاموش خدمت اور ان کی سادگی آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ بنی رہتی ہے وہ اپنے پیچھے شور نہیں، شعور چھوڑ جاتے ہیں، دعوے نہیں بلکہ کردار وعمل کی مضبوط دلیل رکھ جاتے ہیں اور اقتدار وشہرت کے ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر حق کی شمع آندھیوں میں بھی روشن رکھتے ہیں۔

زمانہ بدل جاتا ہے، نام مٹ جاتے ہیں مگر ان کے اثرات قلوب میں زندہ رہتے ہیں اور انہی کے نقشِ قدم سے تاریخ اپنی سمت درست کرتی رہتی ہے۔

یہ تعزیتی مضمون کسی رسمی الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ دل کے زخموں سے پھوٹنے والی وہ صدا ہے جو ایک درخشاں چراغ کے بجھ جانے پہ خود بہ خود قلم کی نوک پہ آجاتی ہے۔

یہ وہ تحریر ہے جس میں آنکھوں کی نمی سطروں میں ڈھل گئی ہے جہاں ہر لفظ کے پیچھے ایک خموش آہ، ایک ٹوٹا ہوا لمحہ اور ایک گہرا احساسِ محرومی سانس لے رہا ہے۔ قلم یہاں تعارف کا محتاج نہیں وہ خود اشکوں کی زبان بول رہا ہے اور یہ سطریں محض پڑھنے کے لیے نہیں دل پہ اترنے کے لیے وجود میں آئی ہیں--- اس یقین کے ساتھ کہ بعض ہستیاں رخصت ہو کر بھی یادوں، دعاؤں اور دلوں کے چراغ روشن رکھتی ہیں۔

جب علم کی محفلیں ویران ہونے لگیں، جب درس وتدریس کی فضا میں خاموشی اتر آئے اور جب اخلاص واستقامت کی علامت ہستیاں رخصت ہوں---تو قلم محض لکھتا نہیں، گواہی دیتا ہے وہ گواہی جو عہدوں اور القاب سے ماورا ہوتی ہے جو اس چراغ کی روشنی کو محفوظ کر لیتی ہے جسے وقت کی تیز ہوائیں بھی بجھا نہ سکیں۔ یہ سطریں اس خلا کا نوحہ ہیں جو لفظوں سے پُر نہیں ہوسکتا مگر یادوں کی خوشبو سے آج بھی معطر ہے۔ **(باقی صفحہ 191 پر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔)**

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی
siddiquirahmat92@gmail.com

حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور ہماری عقیدتیں

اسلام کی ترویج و تبلیغ میں صوفیا کا اہم رول رہا ہے، جماعتِ صوفیا کے یہاں دنیا نہیں ہوتی، امیر وغریب، کالے گورے کا امتیاز نہیں ہوتا ان کے ہاں زمینی تعصب بھی نہیں ہوتا، ان کے شب وروز یادِ الٰہی میں گذرتے ہیں، ان کے پیشِ نگاہ ہر وقت رضائے الٰہی ہوتی ہے، انہیں معاش کی بھی فکر نہیں ہوتی ہفتوں فاقوں پہ گذر جاتے ہیں۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا وہ اپنے عشق کی توہین سمجھتے ہیں، انہیں دینے کی عادت ہوتی ہے، لینا ان کے عمل کا حصہ نہیں ہوتا، ان کا دربار ہر وقت کھلا رہتا ہے، ان کی زبان میں سحر آفریں قوت ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں ان کی زبان میں کُن کے اثرات ہوتے ہیں اس بات کی شہادت قرآن واحادیث سے ملتی ہے، انہیں قیام کے لیے محلوں کی تلاش نہیں ہوتی، زمینوں کا مزاج انہیں معلوم ہوتا ہے اور زمینوں کی ضرورت بھی انہیں معلوم ہوتی ہے، جہاں ضرورت کو مضطرب اور قلوب کو بے قرار دیکھا وہیں اپنی خانقاہ کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، انہیں کسی کا خوف بھی نہیں ہوتا، بڑی بڑی ظالم وجابر طاقتیں ان کے عزم سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں، قوت واقتدار ان کے قدموں میں سجدہ ریز ہوتے ہیں، زمین پہ فساد دیکھنا وہ اپنی فطرت کے خلاف سمجھتے ہیں، جبر وظلم اور ناانصافی کے خلاف ان کی تلواریں ہر وقت نیام سے باہر رہتی ہیں، جماعت صوفیا کو شاعر نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

بدل ڈالے نظام ہر دو عالم آنِ واحد میں
اگر ضد پر کوئی آجائے دیوانہ محمد کا

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جماعت صوفیا کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہوتا اشارۂ غیبی پا کر سمت سفر متعین کرتے ہیں، خلقِ خدا کو ان کے قرب میں تسکین کی دولت ملتی ہے بھوکے، پیاسے اور ستم رسیدہ افراد کا ان کے پاس ہر وقت ہجوم ہوتا ہے، غربت انہیں عزیز ہوتی ہے اور ثروت سے انہیں نفرت ہوتی ہے، ان کی نگاہ ہر وقت اقتدارِ اعلیٰ یعنی خالقِ کائنات کی طرف لگی رہتی ہے، مشیت ان کی پرورش کرتی ہے اور خوف وخشیت ان کی حیات کا پیش لفظ ہوتی ہے، ایسے ہی بندگانِ خدا میں حضور سیّدنا خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز کا شمار ہوتا ہے۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی سیرت وسوانح پہ کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی، مختلف کتب ورسائل میں آپ کے اجمالی تذکار بکھرے ہوئے ہیں، آپ کی سیرت وسوانح کے حوالے سے جن کتابوں پہ اعتماد کیا جاتا ہے ان میں ''طبقاتِ ناصری''، ''سیر الاولیاء''، ''سیر العارفین''، ''رہ آورد'' اور ''فوائدُ الفواد'' ہیں۔ آپ کے عرس کے ایام میں ایک زمانے سے مختلف اخبار ورسائل کے نمبرات نکلتے آرہے ہیں ان میں جو مقالات شامل ہوتے ہیں وہ مذکورہ کتب ورسائل ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مقالات لفظوں کے لبادے میں عقیدت کا بے تابانہ اظہار ہوتے ہیں۔ آپ کے حالات وملفوظات کا سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ ''سرور الصدور والنور

البدور'' ہے جو آج تک زیورِ اشاعت سے آراستہ نہیں ہوئی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنواں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل ۱۳۰۱ھ میں تیار کی گئی اور وہ حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے جو اب مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ نسخہ ۳۶۹ر صفحات پہ مشتمل ہے۔

محدث علی الاطلاق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''اخبار الاخیار'' شریف ہے اس میں بھی حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر انتہائی اختصار کے ساتھ ملتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور سیدنا خواجہ غریب نواز کے درمیان تین صدیوں سے زائد کا فاصلہ ہے، ''سیر الالیاء'' حضور سیدنا خواجہ غریب نواز کے وصال کے ۱۲۵ر سال بعد ترتیب دی گئی، اس میں جو معلومات درج ہیں ان پر کچھ اضافہ شیخ جمال دہلوی مؤلف ''سیر العارفین'' نے کیا ہے شیخ جمال دہلوی اور حضور سیدنا خواجہ غریب نواز کے درمیان قریب قریب تین صدیاں حائل ہیں حضرت سیّدنا خواجہ غریب نواز کی حیات یا آپ کے وصال سے زیادہ قریب آپ کی حیات و خدمات پہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جو لوگ آپ کے قرب کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے انہوں نے بھی اس پہلو پہ کبھی غور نہیں کیا۔ انہیں یادِ حق و ذکر حق سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اگر فرصت ہوتی تو اس سمت ضرور توجہ دیتے۔

برصغیر ہند و پاک کی اسلامی تاریخ میں حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں آپ اسلامی تہذیب و ثقافت کے معمارِ اوّل سمجھے جاتے ہیں، آپ نے اسلامی قدروں کے فروغ میں قائدانہ، مجاہدانہ اور سرفروشانہ رول بھی ادا کیا اور اسلامی قدروں کے فروغ کی راہیں بھی کشادہ کی ہیں۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندستان کی فصیلوں پہ کئی سو سال تک اسلامی پرچم لہراتا رہا۔ آپ جانتے تھے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس لیے سرکش بادشاہوں کی سرکوبی کے لیے آپ نے شہاب الدین غوری کو ہندستان آنے کی روحانی دعوت دی۔ اگر ہندستان کے مسلم حکمراں حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے اصولوں کو پیشِ نگاہ رکھتے تو ہندستان پہ کبھی غیروں کا تسلط نہ ہوتا۔ آج مسلمانوں کی خواری و زاری کا بھی یہی سبب ہے، بزرگوں سے جو انہیں وراثت ملی تھی اس کی دل سے قدر جاتی رہی، جو قوم قیادت و امامت کے لیے پیدا ہوئی تھی اس نے اپنے طرزِ عمل سے مقتدی ہونے کا حق بھی کھو دیا۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز الٰہی آواز اور نبوی طرزِ زندگی لے کر رونق افزائے ہند ہوئے تھے۔ ان کی آواز میں بڑی قوت، توانائی اور تاثیر تھی، ان کے اشارے پہ ہواؤں کا رُخ بدل جاتا تھا، ان کے فرامین قرآن و احادیث کا افشردہ اور عصارہ ہوا کرتے تھے، ان کی ہر سانس کو محفوظ کرنے کی سخت ضرورت تھی، ان کی حیات کے بکھرے ہوئے اوراق سمیٹنے کی ضرورت تھی اور ان کے ارشادات و فرمودات کو نصابِ زندگی بنانے کی ضرورت تھی، لیکن کل کی دنیا سے ایسا نہ ہو سکا اور آج کی دنیا سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے جو کامیاب زندگی کا تصور دیا تھا ہماری زندگی میں اس تصور کے نشانات بھی نہیں ملتے، ان سے وابستہ عقیدتیں ہمارا مذاق اڑاتی ہیں، ہم ان کی بارگاہ میں تسلسل کے ساتھ حاضری دیتے ہیں، ہماری حاضری صرف لینے کے جذبے کے تحت ہوتی ہے، ہماری عقیدتیں کھوکھلی ہیں، ہمارے نعروں میں صداقت نہیں ہے، ان کی نگاہ صرف ہماری عقیدت ہی پہ نہیں ہوتی بلکہ عقیدے پہ بھی ہوتی ہے، وہ عمل کے صرف ظاہری خد و خال ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ ہمارے احساسات و خیالات کی زیریں لہروں کو بھی دیکھتے ہیں، انہوں نے ہمارے لیے اپنا کردار چھوڑا ہے اور وہی کردار ہمارے لیے سب سے قیمتی دولت ہے اگر ہم ان کے کردار کو اپنی زندگی کا ترجیحی حصہ بنا لیتے تو فتح و نصرت کی کلید کبھی ہمارے ہاتھوں سے نہیں جاتی۔

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مناقب عقیدت کے پاکیزہ اظہار کا نام ہے اور سیرت و سوانح

صداقت کی بکھری ہوئی کڑیوں کو سمیٹنے کا نام ہے۔ مناقب میں آپ اپنی عقیدت کو شرعی حدود میں رہ کر جس انداز میں چاہیں پیش کر سکتے ہیں، آپ سوالات کی زد میں نہیں آسکتے، لیکن سوانح میں صداقتوں سے کہیں بھی آپ کا رشتہ ٹوٹتا ہے تو آپ سوالات کے گھیرے میں آجائیں گے۔ حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی کتابِ حیات کا ہر ورق چاند کی چاندنی سے زیادہ صاف و شفاف ہے۔ ان کی حیات کی شفافیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی ذات بارگاہِ خدا و رسول میں مقبول ہے۔ ہندستان میں ان کی آمد حکمِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بنیاد پہ ہوئی تھی۔ ان کا جسم ہندستان میں تھا لیکن ان کی روح ہر وقت دیارِ حبیب کا طواف کرتی تھی ان کی ولایت و کرامت پہ بارگاہِ رسالت کی مہر لگی ہوئی ہے اس لیے انہیں ''عطائے رسول'' بھی کہا جاتا ہے اور ''ہند الولی'' بھی کہا جاتا ہے۔ وہ سرتاجِ اولیاء بھی ہیں اور سرگروہِ اولیاء بھی ہیں ان کی حیات کی صحیح تصویر لفظوں سے نہیں بنائی جاسکتی ہم جیسے لوگ جب بھی ان کی شخصیت کو لفظوں کے حصار میں لانا چاہتے ہیں وہ حصار ٹوٹ جاتا ہے ان کا ہر عمل عقلِ انسانی کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتا ہے انہوں نے ایسے ملک میں سکونت اختیار کی جہاں قدم قدم پہ مخالفتوں کا آتش فشاں تھا لیکن انہوں نے اہلِ ہند کے سامنے ایسا کردار پیش کیا کہ مخالفتوں کے تمام آتش فشاں دیکھتے ہی دیکھتے ''باغِ خلیل'' کا نظارہ پیش کرنے لگے، ان کی ذات عزم و استقلال کی اس منزل پہ نظر آتی ہے جہاں کے تصور ہی سے اچھے اچھوں کے بال و پر جلنے لگتے ہیں، ان کے عزم کو دیکھ کر فولاد کا جگر بھی پانی پانی ہونے لگتا ہے، ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اپنے اندر ایک جادوئی اثر رکھتا تھا، ان کے قدموں سے لگی ہوئی جوتیوں میں یہ قوت و توانائی تھی کہ فضاؤں میں محوِ پرواز مجرم کو لمحوں میں قید کر کے بارگاہ میں پیش کر دیتی تھی ان کے قدموں سے نسبت کا جب یہ کمال ہے تو ان کے حصارِ محبت میں رہنے والوں میں کتنا کمال رہا ہوگا۔ انہوں نے ایسی حکومت کے خلاف محاذِ جنگ کھولا تھا جو طاقت و قوت میں غیر منقسم ہندستان کے تمام فرمانرواؤں سے ممتاز اور منفرد تھی، جس کے خلاف زبان کھولنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، حکومت ہر طرح کے دفاعی ساز و سامان سے لیس تھی اور آپ بظاہر ہر طرح سے بے سرو سامانی کے شکار تھے، آپ حکومت کی سرحد پہ نہیں تھے کہ شکست و ریخت کی صورت میں جان بچا کر نکلنے کی راہ آسان ہو بلکہ آپ حکومت کے قلب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر وقت حکومت کے کارندوں کی آپ پہ نظر تھی، ایک دستہ جاتا تو دوسرا دستہ اس کی جگہ لے لیتا، حکومت کے پاس تمام متبادلات تھے، لیکن آپ کے پاس جان دینے کے علاوہ کوئی متبادل نہیں تھا، حکومت کے پاس زندگی کی تمام تر سہولتیں تھیں اور قلّت کی صورت میں راہیں کھلی ہوئی تھیں، آپ بظاہر تمام تر سہولتوں سے محروم تھے پھر بھی حکومت مضطرب تھی اور آپ مطمئن تھے۔

حق و باطل کے درمیان ایسی معرکہ آرائی دنیا کی نگاہوں نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھی ہو حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز مسلسل سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے آئے تھے، ان کے پاس فوج بھی نہیں تھی، سامانِ حرب و ضرب بھی نہیں تھا، سر چھپانے کے لیے مکان بھی نہیں تھا، کھانے پینے کا کوئی ذخیرہ بھی نہیں تھا اور باہر کی دنیا سے آپ کا کوئی رابطہ بھی نہیں تھا اس کے باوجود حکومت کی پریشانی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا ایک مومنِ کامل کے اعتقاد کے سامنے کفر ہر محاذ پہ زیر و زبر ہو رہا تھا آپ کو شہر بدر کرنے کی حکومت کی تمام تر کوششیں ناکام ہو چکی تھی، مجبوراً اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کیا یعنی ''اناساگر'' پہ پہرا لگا دیا، فوجیوں کو سخت تاکید کر دی گئی کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اس فقیر کی کٹیا میں نہ جانے پائے، یہ اناساگر پورے اجمیر کے باشندوں کی پانی کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، چونکہ پانی انسانی زندگی کا اہم حصہ ہے، پانی کے بغیر کسی بھی انسان کا زیادہ دنوں تک زندہ رہنا بہت مشکل ہے حکومت کو یقین ہو چلا تھا کہ پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں فقیر شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا ادھر حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے رفقاء کی تشویش بڑھنے لگی آپ نے اپنے احباب کی تشویش محسوس کی آپ نے اپنے ایک خادم کو اپنا کوزہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ اناساگر سے کہنا کہ تمہیں معین الدین نے بلایا ہے، آج کا خادم ہوتا تو پوچھتا کہ حضور

کہاں انا ساگر اور کہاں آپ کا یہ کوزہ؟ آپ ہماری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن وہ خادم بھی غریب نواز کا تھا حکم پاتے ہی انا ساگر کے قریب پہنچ گیا اور انا ساگر کو غریب نواز کا حکم سنایا، حکم سنتے ہی پورا انا ساگر کوزے میں سمٹ آیا بلکہ انا ساگر ہی نہیں پورے اجمیر بلکہ ایک روایت کے مطابق پورے ہندستان کا پانی اس کوزے میں سمٹ آیا جس تیر کا استعمال حکومت نے حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے خلاف کیا تھا وہ تیر حکومت ہی کے قلب میں جا کر پیوست ہوگیا۔ پیاسوں کی چیخ و پکار سن کر حکومت کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی پورا اجمیر پیاس کی شدت سے تڑپنے لگا، شہر کے حالات دیکھ کر حکومت مجبور ہوگئی اور اس نے اپنے نمائندوں کو حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی خدمت میں بھیجا، نمائندوں کی روداد سننے کے بعد آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ کوزہ انا ساگر میں جا کر الٹ دے، کوزے کا الٹنا تھا کہ پھر حسبِ سابق انا ساگر جل تھل ہوگیا، پھر پورا شہر انا ساگر کی طرف دوڑ پڑا، انسانی عقل کو حیران کر دینے والے اس واقعے کے بعد خلقِ خدا کی عقیدتیں آپ کی طرف متوجہ ہوگئیں اور لوگ تیزی کے ساتھ دامن اسلام میں پناہ لینے لگے۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی طرف سے یہ پہلا دفاعی حملہ تھا اس حملے سے حکومت کی کمر ٹوٹ گئی اور اس نے محسوس کر لیا کہ اس فقیر سے نپٹنا آسان نہیں ہے۔ یہ ایک نفسیاتی جنگ تھی، ایک طرف کفر کی ریشہ دوانیاں تھیں، دوسری طرف ایمان و یقیں کا اجالا تھا، کفر کانپ رہا تھا اور ایمان و یقین کی چاندنی سے دلوں کی وادیاں روشن و منور ہو رہی تھیں، انسانی تاریخ کی یہ اولین جنگ تھی ایک طرف کفر تمام تر دفاعی آلات سے لیس تھا اور دوسری طرف چند نفوسِ قدسیہ تھے جن کے پاس بظاہر سر چھپانے کی کوئی مستقل جگہ بھی نہیں تھی۔ جب سینوں میں براہیمی ایمان کا چراغ روشن ہوتا ہے تو جبر و ظلم کے شرارے باغِ خلیل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نمرودی سازشوں کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز نے کفر کے خلاف جو محاذ کھولا تھا تا حیات اسی محاذ پر کھڑے رہے۔ ان کی کتابِ حیات کا ہر ورق استعجابی ہے ہم ان کی بے پناہ عظمتوں کا تو اعتراف کرتے ہیں لیکن ان کی سیرت کے آئینے میں خود کو نہیں ڈھالتے، ان کی ذات ہم سے چادر کا مطالبہ نہیں کرتی، پھول کا مطالبہ نہیں کرتی، اگر بتیوں کا مطالبہ نہیں کرتی، انواع و اقسام کے کھانوں کا مطالبہ نہیں کرتی اور نہ مال و زر کا مطالبہ کرتی ہے بلکہ ان کی ذات ہم سے اس عمل کا مطالبہ کرتی ہے جس کی سند قرآن و احادیث سے ملتی ہو، جس کی سند اقوالِ صحابہ سے ملتی ہو اور جس کی سند پاکانِ امّت سے ملتی ہو اگر ہم نے ان کے مطالبات پورے کیے ہوتے تو آج عالمی پیمانے پہ عموماً اور ملکی سطح پہ خصوصاً ہمارا خون اتنا ارزاں نہ ہوتا، جانوروں کے تحفظ کے لیے سخت سے سخت تر قانون بنائے جا رہے ہیں، جانوروں کو دیوتا کا روپ دیا جا رہا ہے لیکن ہمارے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے، ہمارے ناموس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جاتا ہے، ہمارے خون سے دیواریں رنگین کی جا رہی ہیں، ہمارے ساتھ وہ سلوک ہو رہا ہے جس سے انسانیت شرم سے پانی پانی ہو جا رہی ہے، ہم پہ جو مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں ہم اس کے خلاف آواز بھی بلند نہیں کر سکتے اگر ہم ان مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو دنیا کی کوئی عدالت ہماری آواز سننے کے لیے تیار نہیں ہے ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ ہم نے حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی ذات کو تو قبول کر لیا اور ان کی تعلیمات، ان کے پیغامات اور ان کے ارشادات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ انہوں نے اسلام کی جو تصویر پیش کی ہے، انہوں نے جو اسلامی زندگی کا پاکیزہ تصور دیا ہے وہ تصور ہماری کتابِ حیات میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر اقبال نے پوری اسلامی برادری کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں اور ہم برصغیر کی مسلم برادری کو پیشِ نگاہ رکھ کر ان کے یہ اشعار نقل کرتے ہیں۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار
مصلحت وقت ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں
واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں وہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز اصولِ شریعت سے زندگی کے کسی موڑ پہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوئے انہوں نے تاحیات دین و شریعت کے لیے جدو جہد جاری رکھی۔ ان کی حیات کا ہر ورق ریاضت ومجاہدے سے عبارت ہے۔ دین اسلام اپنے ماننے والوں سے قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، دین اسلام کا قبول کرنا بہت آسان ہے لیکن اس کے اصولوں کو برتنا ''شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا'' ہے، حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی زندگی جہادی زندگی تھی چونکہ ان سے ایک عالم کو فیضیاب ہونا تھا اس لیے رحمت الٰہی ہمیشہ ان کی طرف متوجہ رہی، ان کے مجاہدات کی جو تصویریں کتابوں میں ملتی ہیں ہر تصویر اپنے اندر جہانِ حیرت لیے ہوئے ہے ان کا تعلق حسنی حسینی سادات گھرانے سے تھا، باغِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول ہونے کے باعث ان کے جینے کا انداز بھی اور لوگوں سے مختلف تھا، ان کے والد ماجد اپنے وقت کے صاحبِ ثروت، صاحبِ علم اور صاحبِ زہد وتقویٰ تھے ان کی والدہ ماجدہ کو اگر مریم ثانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کچھ لوگ اپنی عبادت پہ نازاں ہوتے ہیں لیکن ان پہ عبادت کو ناز تھا حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی پرورش والدین کی دعاؤں اور تمناؤں کی آغوش میں ہوئی تھی جب آپ کی عمر شریف پندرہ سال کی ہوئی تو والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، یعنی گلشن حیات کی دہلیز پہ خزاں کی یہ اوّلین دستک تھی بابِ حیات پہ خزاں اس قدر جلد دستک دے گی آپ کو اس کی امید نہ تھی لیکن قدرت کا اپنا نظام ہے جو ازل سے چل رہا ہے اور ابد تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

والد ماجد کے وصال کے بعد حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے والد ماجد کی وراثت سے آپ کو ایک باغ اور ایک پن چکی ملی تھی اب آپ کے زیادہ تر اوقات انہیں کی دیکھ ریکھ میں صرف ہونے لگے چونکہ انہی دونوں چیزوں پہ بظاہر آپ کی روزی روٹی کا دارومدار تھا، روزی روٹی تو ایک بہانہ تھا درحقیقت یہیں سے حیات کا ایک نیا باب کھلنا تھا ایک روز آپ باغ کی آبیاری میں مصروف تھے کہ اس زمانے کے مشہور مجذوب صفت بزرگ حضرت ابراہیم قندوزی باغ میں تشریف فرما ہوئے آپ کی ان سے پہلے سے کوئی آشنائی نہیں تھی لیکن دل میں بزرگوں کے احترام کا چراغ ابتدا ہی سے روشن تھا، دیکھتے ہی آپ ان کے قریب پہنچے اور انھیں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بٹھایا اور میٹھے انگور کا خوشہ توڑ کر ان کی خدمت میں پیش کیا حضرت ابراہیم قندوزی آپ کے اس حسنِ سلوک سے بہت متأثر ہوئے آپ نے انگور تو نہیں کھایا اپنی جھولی سے ایک کھلی کا ٹکڑا نکالا اور اپنے دانتوں سے چبا کر غریب نواز کے دہنِ مبارک میں ڈال دیا، کھلی کا کھانا تھا کہ غریب نواز کے دل کی دنیا بدل گئی، حجابات نگاہوں سے اٹھ گئے، دل سے دنیا کی محبت جو تھوڑی تھی نکل گئی، تھوڑے دنوں کے بعد باغ اور پن چکی فروخت کی اور ان سے جو رقم حاصل ہوئی اسے غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیا، والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور یہ عریضہ پیش کیا ''ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے یہاں تعلیم وتربیت کا معقول انتظام نہیں ہے ہم دین مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور دین کی خدمت بغیر علم کے نہیں ہوسکتی اس سلسلے میں ہم آپ سے دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔'' والدہ ماجدہ کی پیشانی نورِ مسرت سے چمک اٹھی انہوں نے آپ کے چہرے کو بغور دیکھا اور خدمت دین کے لیے حصولِ علم کی اجازت دے دی والدہ ماجدہ سے اجازت لینے کے بعد آپ نے سامانِ سفر تیار کیا اور حصولِ علمِ دین کے لیے نکل پڑے۔ آپ نے حصولِ علمِ دین کی غرض

سے ان تمام شہروں کا سفر کیا جو اس زمانے میں علوم وفنون کے مراکز سمجھے جاتے تھے، ذوقِ علم بھی تھا اور ذہانت وفطانت بھی وراثت میں ملی تھی پانچ سال کی قلیل مدت میں تمام علومِ عقلیہ ونقلیہ میں کمال حاصل کرلیا۔ کتب تاریخ وسیر میں حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے اساتذہ کی کوئی فہرست نہیں ملتی ہاں جن شہروں کا آپ نے سفر فرمایا ان کی فہرست ملتی ہے، جن اولیائے زمانہ سے آپ نے ملاقاتیں کیں ان میں مشاہیر زمانہ کی فہرست بھی ملتی ہے اساتذہ میں صرف دو نام آتے ہیں ایک نام حضرت شیخ شرف الدین اور دوسرا نام حضرت شیخ حسام الدین بخاری علیہا الرحمہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے ان کی براہِ راست ملاقاتیں ہوتی ہیں اگر ہماری ملاقات کبھی ان سے ہوجاتی تو ہم ان سے بہت کچھ معلوم کرلیتے کیونکہ ان کی حیات کا کوئی باب گردآلود نہیں ہے بارگاہِ خدا اور سول میں ان کی ہر سانس مقبول ہے آج پورے ایشیا میں جو دین اسلام روشن ہے یہ ان کے قدموں کا فیضان ہے تاریخ ان کی حیات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوئی اس کی کچھ وجوہات ہیں، ان کی ولادت ۵۲۷ھ میں ہوئی، ۵۴۲ھ میں انہوں نے اپنے وطن سیستان قصبہ سنجر سے برائے حصولِ علم سفر کا آغاز کیا، ۵۸۶ھ اور ۵۸۷ھ کے درمیان ہندستان کی سرزمین کو اپنے قدموں کی برکتوں سے سرفراز فرمایا ۵۸۷ھ ہی میں آپ نے اجمیر معلیٰ کو اپنی دعوت وتبلیغ کا مرکز بنایا جس وقت آپ اجمیر تشریف فرما ہوئے اس وقت آپ کی عمر شریف قریب قریب ساٹھ سال کی ہوچکی تھی یعنی آپ مسلسل ۴۵ رسال تک سفر کرتے رہے ذکر خدا وذکر حبیبِ خدا اور خدمت خلق سے کبھی فرصت نہیں ملی اس لیے اپنی حیات سے وابستہ واقعات کے جمع وترتیب کا کبھی دل میں خیال بھی نہیں آیا رفیقانِ سفر ہمیشہ بدلتے رہے اس لیے احبابِ سفر نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی ہندستان میں آپ کے قیام کی مدت ۴۵ / ۴۶ رسال ہوتی ہے یہاں عمر نے شوریدگی میں غیر معمولی اضافہ کردیا تھا ہر وقت خلق خدا کی فکر تھی، بندوں کی پیشانیاں سجدوں کے نور سے روشن ہوجائیں ہر آنے والا وقت اسی خیال کی شدت میں اضافہ کردیتا یہاں احباب وخدام کی جو جماعت آپ کے ساتھ تھی ان میں بھی خوف وخشیت کا غلبہ تھا اس لیے انہیں بھی آپ کے حال واحوال قلم بند کرنے کا خیال نہیں آیا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی کتابِ حیات کے بکھرے ہوئے اوراق سمیٹنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی یہ ہمارا قصور ہے ان کی ذات اور ان کا کام ہر طرح کے شبہات سے بالاتر ہے ان کی شخصیت کے حوالے سے کتب ورسائل میں جو شہادتیں ملتی ہیں اگر وہ شہادتیں نہ بھی ہوتیں پھر بھی ان کی شخصیت کی مرکزیت میں کوئی فرق نہ آتا تاحیات مدینے سے ان کا رشتہ مربوط رہا انہوں نے وہی کیا جس میں مدینے کی رضا شامل تھی، مدینے کی رضا سے ہٹ کر سوچنا بھی ان کے مکتبِ عشق کے منافی تھا ہر ملک کا ہر ملک میں سفارت خانہ ہوتا ہے جو اپنے ملک کی مثبت نمائندگی کرتا ہے، اسلامی مملکت کی رجدھانی مدینہ ہے آپ کو مدینے سے بھیجا گیا تھا اور بااختیار بنا کر بھیجا گیا تھا آپ کی ذمہ داریوں میں صرف خلق خدا کو سجدوں کی لذت سے آشنا کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اسلامی مملکت کی سرحدوں میں اضافہ کرنا بھی شامل تھا اور آپ نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا تاریخ کے سینے میں اس کے روشن شواہد موجود ہیں۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی کتابِ حیات کا ہر ورق مدینے سے وفاداری کے نور سے روشن منور ہے مدینے سے وفاداری مقصودِ زندگی بھی ہے اور معراجِ بندگی بھی حضرت سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بعد الانبیاء انسانوں میں سب سے افضل واعلیٰ ہیں اس کی بنیادی وجہ مدینے سے سچی وفاداری ہے حضرت صدیق اکبر نے محبت رسول ﷺ کا جو معیار اہلِ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ان کے بعد وہ معیار دنیا نے پھر کہیں نہیں دیکھا وہ اپنی ہر ادا میں طاق تھے مدینے سے وفاداری فتح وظفر کی کلید ہے آقائے کریم ﷺ سے بے غبار محبت انسان کو یہ بشارتیں دیتی ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

لیکن خود مدینے کے وفاداری کی آواز یہ ہوتی ہے۔

ہمارے دردِ جگر کی کوئی دوا نہ کرے
کمی ہو عشقِ نبی میں کبھی خدا نہ کرے
جان ہے عشقِ مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اُٹھائے کیوں
سنگِ درِ حضور سے ہم کو خدا نہ صبر دے
جانا ہے سر کو جا چکے دل کو قرار آئے کیوں

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کا جسم ہندستان میں تھا مگر ان کا دل مدینے میں روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طواف میں مصروف رہا کرتا تھا ان کی زندگی کی ہر سانس مدینے کے نام اور کام سے عبارت ہے، مدینے والے کی رضا سے ہٹ کر انہوں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا ان کی خلوت و جلوت سے یہی صدا بلند ہوتی تھی کہ ’’کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے‘‘ ہم ان کا نام تو بہت لیتے ہیں لیکن ہم وہ نہیں کرتے جو انہوں نے ہمیں کرنے کا حکم دیا ہے اور نام بھی لیتے ہیں تو اپنے کام کے لیے ہمارے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے سائل کو محروم نہیں کرتے جب وہ نوازنے پر آتے ہیں تو اتنا نوازتے ہیں کہ سائل کا دامن تنگ ہو جاتا ہے یہ بات مبنی برصداقت ہے مگر ہم نے کبھی سنجیدگی سے سوچا کہ جب ان کا نام لینے میں اتنی برکتیں ملتی ہیں کہ دامن تنگ ہو جاتا ہے تو ان کے مطالبات، ارشادات وفرمودات اور ان کی پاکیزہ سیرت کے آئینے میں خود کو ڈھالا ہوتا تو کتنی برکتیں ملتیں ان کی ذات حقیقت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا ہے، وہ سر سے پاؤں تک عطائے رسول ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے دربار میں جو بھی حاضر ہوتا ہے بامراد لوٹتا ہے آقا اور غلام، امیر اور غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ کا ان کے ہاں کوئی امتیاز نہیں ہے چہرہ دیکھ کر نوازنا ان کے مشرب و مسلک کے خلاف ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جن کی زندگی شریعت کے حدود میں گذرتی ہے ان کے ساتھ ان کی عطاؤں کا انداز جدا ہوتا ہے وہ ہم سے شریعت پہ استقامت چاہتے ہیں لیکن ہم ہر کام کرتے ہیں یہی نہیں کرتے اس لیے ہماری عقیدتیں بے سند ہیں ہم ان کے نام پہ خزانے کا منھ کھول دیتے ہیں، بے حساب مال و زر خرچ کرتے ہیں لیکن ہماری عقیدتیں خود ہم سے سراپا سوال بنی ہوئی ہیں کہ کیا ہم نے ان کے نام پہ کوئی ادارہ، کوئی یونیورسٹی، کوئی جامعہ، کوئی ملکی سطح کا اسپتال اور غریبوں کی فلاح کے لیے کسی بڑے کارخانے کی بنیاد رکھی؟ آج اجمیر شریف میں جا کر دیکھیے بڑے بڑے ہوٹل، بڑے بڑے گیسٹ ہاؤس اور بڑے بڑے محلات بنے ہوئے ہیں یہ سب حصولِ دنیا کے ذرائع ہیں ان سے عقیدتوں کا کوئی رشتہ نہیں ہے زائرین کی جتنی کثرت ہوگی دولت میں اسی قدر اضافہ ہوگا ان کی درگاہ سے وابستہ افراد کی نگاہیں زائرین کی جیب پہ ہوتی ہیں، عقیدتیں ہر جائز اور ناجائز مطالبات کے آگے خمیدہ سر ہو جاتی ہیں اگر ہم حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے ارشادات و پیغامات کو اپنی زندگی کا حصہ بناتے تو ایسی صورت میں گھر بیٹھ کر ان کے روحانی فیضان سے سرشار ہو سکتے تھے سچی عقیدتیں گھر اور در دونوں سے بے نیاز ہوتی ہیں ان کی بارگاہ میں حاضری کے ہم قطعی مخالف نہیں ہیں حاضری ہو اور بار بار ہو لیکن آدابِ شریعت کا دامن ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے آج کا خانقاہی نظام بدعات و منکرات سے بوجھل ہو چکا ہے، اس کی تجدید نو کی شدید ضرورت ہے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے جس خانقاہی نظام کی حمایت کی ہے وہ ان کی کتابوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔

آج ہند و پاک کی اکثر خانقاہیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔ اعلیٰ حضرت ہر کام میں شریعت کی بالادستی چاہتے ہیں۔ ان کی ولادت اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ہوئی تھی۔ انہوں نے قدم قدم پہ شرعی اصولوں کو اعتبار بخشا ہے۔ ان کی کتابِ حیات کے کسی ورق میں نفسانیت نہیں ملتی۔ پاسدارانِ شریعت کی تاریخ میں کئی صدیاں ان کی نظیر سے خالی ہیں۔ خانقاہیں ان سے اپنے غیر شرعی اصولوں کی سند چاہتی ہیں اور وہ سند دینے کے لیے کسی بھی صورت میں آمادہ نہیں ہیں۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ سراپا سوال بنا ہوا ہے کہ خانقاہوں میں جو غیر شرعی معمولات و مراسم انجام دیے جاتے ہیں علما ان کے خلاف آواز کیوں بلند نہیں کرتے۔ عوام کا یہ مطالبہ درست ہے اور علما بھی اپنی مذہبی ذمہ داریوں سے

غافل نہیں ہیں وہ اپنی تحریر وتقریر میں گاہے بگاہے شدید مذمت کرتے ہیں یہاں جمہوریت ہے اور خانقاہوں کو قانونی جواز حاصل ہے مخالفتوں کا ان پہ کوئی اثر نہیں ہوتا، خانقاہیں معاش میں تبدیل ہو چکی ہیں بہت کم خانقاہیں شرعی حدود میں آتی ہیں ہمارا مخالف خانقاہوں کے منفی رویے کی روشنی میں ہماری تصویریں بناتا ہے اور عالمی برادری کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسی منفی رویے کو بریلویت کا نام دیتا ہے جبکہ بریلویت اسلام سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز توحید ورسالت کے نور سے سینوں کو روشن ومنور کرنے کے لیے ہندستان تشریف لائے تھے۔ بارگاہِ رسالت سے انہیں جو ذمہ داری سونپی گئی تھی اسے انجام دینے میں ان کا قدم کسی بھی مقام پر صراطِ مستیم سے بال برابر الگ نہیں ہوا۔ انہوں نے اس انداز میں شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری کی کہ ان کی کتابِ حیات کا ہر ورق قیامت تک آنے والے مصلحین اُمت کے لیے نشانِ منزل بن گیا۔ ہم ان سے مانگنے کا ہر اعتبار سے جواز رکھتے ہیں اور وہ دینے کے لیے بھی ہر وقت آمادہ ہیں بلکہ ان کے خزانے کا منھ ہر وقت سائلین کے لیے کھلا رہتا ہے آنے والے آتے ہیں اور اپنے ظرف کے مطابق لے کر جاتے ہیں ہم ان سے مانگیں اور ضرور مانگیں لیکن مانگتے وقت ہماری نگاہ ان کے کردار وعمل پہ بھی ہونی چاہیے ہمارے لیے سب سے بڑا سرمایہ ان کا کردار وعمل ہے، ان کے کردار وعمل کی پیروی میں کائنات کی سعادتیں سمٹی ہوئی ہیں، دعوت وتبلیغ کے لیے انہیں جو زمین دی گئی تھی وہ کفر وشرک کی تاریکیوں میں ہر سمت سے گھری ہوئی تھی انہوں نے کفر وشرک کی تاریکیوں کو عشق وعرفان کے نور میں تبدیل کر دیا، انہوں نے اپنے کردار وعمل کی تلوار سے کفر وشرک کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں دنیا کی کوئی طاقت ان کے مشن کو پھیلنے سے روک نہیں سکی، ان کا مشن توحید ورسالت کے نور سے سینوں کو منور کرنا تھا جب تک ہماری نگاہیں ان کے مشن پر رہیں فتح وظفر کی کلید ہمارے ہاتھوں میں رہی وہ قدم قدم پر کامیاب تھے اور ہم قدم قدم پر ناکام ہیں جس وقت وہ واردِ ہند ہوئے تھے ان کے رفقا کی مجموعی تعداد چالیس افراد پہ مشتمل تھی، چالیس افراد سے پورا غیر منقسم ہندستان خوف زدہ تھا آج ان کے اہلِ عقیدت چالیس کروڑ سے بھی زائد ہیں وہ چالیس ہو کر بھی دنیا پہ غالب تھے اور ہم چالیس کروڑ ہو کر بھی مغلوب ہیں۔

سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں، اس میں شخصیاتی اعتبار سے کچھ مہینے ایسے ہیں جو مسلمانوں کے لیے عید سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ان میں رجب المرجب بھی ہے رجب المرجب کا چاند طلوع ہوتے ہی پورے برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں میں خوشی ومسرت کی ایک عجیب سی لہر پھیل جاتی ہے حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے ذکر وفکر سے گلیاں مسکرانے لگتی ہیں، ٹولیاں بنتی ہیں، جماعتیں بنتی ہیں، قافلے تیار ہوتے ہیں اور سب کا رُخ اجمیر معلی کی سمت ہوتا ہے روکنے والے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، فتوے دیے جاتے ہیں اور انہیں اشتہار کی شکل میں پھیلایا جاتا ہے، پوسٹر دیواروں پہ چسپاں کیے جاتے ہیں لیکن کاروانِ عقیدت اس طرح کی رکاوٹوں کو اپنے قدموں سے روندتے ہوئے حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے حضور حاضر ہوتے ہیں، عقیدت کا یہ اظہار یہ قابلِ صد تکریم ہے اگر اس عقیدت میں قدم قدم پہ اصولِ شریعت کا احترام بھی شامل ہو تو یہ عقیدت ہمارے لیے دارین کی سعادتوں کے ابواب کھول دے گی حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کا ہم سے یہی مطالبہ ہے کہ عقیدت میں شریعت کا التزام نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے ہمارے عمل کی ہر تصویر پر دنیا نگاہ جمائے ہوئے ہے ہماری ہر تصویر کیمرے میں محفوظ کی جارہی ہے اس لیے ہمیں اپنے آقاؤں کے دربار میں حاضری کے وقت بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے آقاؤں کی بارگاہوں میں حاضری کے جو اصول بتائے ہیں ہمیں ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو عمل کی زمین پہ اتارنا ہوگا اعلیٰ حضرت وارثِ انبیا بھی ہیں اور وارثِ اولیا بھی آقاؤں سے جڑے رہنے کی تحریک کے وہ سب سے بڑے محرک ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو آج برصغیر ہندو پاک میں آقاؤں کی کوئی چوکھٹ سلامت نہ رہتی انہوں نے عقیدتوں کو دلائل کی زبان عطا کر دی ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آقاؤں سے الگ

ہو کر مسلمان اپنا دین بچا نہ پائے گا جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کے گنبد و مینار کی ضرورت نہیں ہے ہمارے لیے خواجہ غریب نواز کا گنبد کافی ہے وہ لوگ تعصب و تنگ نظری اور گروہی عصبیت کے مہلک مرض میں مبتلا ہیں انہیں کسی روحانی طبیب حاذق کی صحبت میں بیٹھنے کی شدید ضرورت ہے جس وقت ہماری عقیدتوں سے بزرگوں کی بارگاہوں میں حاضری کے جواز کی سندیں مانگی جارہی تھیں اس وقت وہ کہاں تھے؟ اور آج بھی ان کے اندر اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ جواز کی سندیں فراہم کرسکیں انہیں جواز کے لیے اعلیٰ حضرت ہی سے رجوع کرنا ہوگا اعلیٰ حضرت سے ہٹ کر حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز سے محبت کا ہر دعویٰ جھوٹا ہوگا وہ شخص فیضانِ غریب نواز سے شادکام ہو ہی نہیں سکتا جس کے دل میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے عداوت ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نے عظمت رسالت اور ناموسِ اولیائے اُمت کی اس انداز میں محافظت کی ہے کہ جو ان کی مخالفت کرتا ہے وہ آقائے کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کرم سے محروم ہو جاتا ہے چاہے اس کا رشتہ کسی بھی خاندان سے ہو ہم نسبتوں کا احترام کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے یہ احترام کا سبق بھی ہمیں اعلیٰ حضرت ہی نے دیا ہے جنہیں اپنا دین پسند ہوگا، جنہیں نبی کی محبت عزیز ہوگی وہ یقیناً اعلیٰ حضرت کے وفادار ہوں گے ادھر کچھ سالوں سے بعض لوگ یہ اعلان کررہے ہیں کہ فلاں ادارہ مرکز علم ہے اور بریلی شریف ہمارا مرکز عقیدت ہے یہ اعلان عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے جو ایسا کررہے ہیں وہ دین کی روح سے غافل ہیں پھر یہ کہ جو مرکز علم ہوتا ہے وہی مرکز اہلِ سنّت ہوتا ہے لفظوں کے اس ہجوم میں دل کا غبار آئینے کی طرح صاف نظر آرہا ہے بریلی شریف اس وقت تک مرکز اہلِ سنّت رہے گا جب تک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا کوئی متبادل نہ سامنے آجائے اس لیے کہ اعلیٰ حضرت نے جو دین کا تصور دیا ہے وہ تصور کسی دوسری جگہ نہیں ملتا آپ وہ تصور دیجیے، عقیدہ و عمل میں وہ شفافیت دیجیے اور شخصیت میں وہ گہرائی پیش کیجیے اور مرکز جہاں چاہیں اٹھا کرلے جائیں۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کا دربار سب کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو بھی منع نہیں کرتے یہی اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے برصغیر ہند و پاک میں آپ کی ذات اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے صاف و شفاف آئینہ ہے، آٹھ سو (۸۰۰) سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا پھر بھی اس آئینے کی واقعیت اور شفافیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ صبح قیامت تک یہ آئینہ یوں ہی چمکتا، دمکتا اور اُجالوں کی خیرات بانٹتا رہے گا انہیں ہند کا راجا بھی کہا جاتا ہے یقیناً وہ ہند کے راجا ہیں اور ہم ان کی رعایا ہیں وہ اپنے راجا ہونے کا حق تو ادا کررہے ہیں لیکن ہم ان کی رعایا ہونے کے حق سے غافل ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے زیر اثر ہیں اور اس وقت تک غیروں کے زیر اثر رہیں گے جب تک ان کے اخلاق و کردار کے آئینے میں خود کو ڈھال نہیں لیتے۔

حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اپنی مملکت میں ان لوگوں کو بھی رہنے کے حق سے محروم نہیں کرتے جو ان کی بے پناہ عظمتوں کے منکر ہیں اور رسول دشمنی جن کا شناختی نشان ہے ادھر چند سالوں سے علمائے دیوبند حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز سے اپنا شجرہ جوڑنے میں خونِ جگر جلا رہے ہیں جبکہ رسول دشمنی اور اولیا بےزاری ان کے مکتب زندگی کے نصاب کا جلی عنوان ہے ہماری زندگی عظمت رسالت اور شوکت اولیا کے اظہار کے لیے دلائل و شواہد ڈھونڈنے میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے اور وہ تنقیص رسالت اور تضحیک اولیا کے لیے دلائل کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ان سے ہماری محاذ آرائی کے یہی بنیادی اسباب ہیں یہ چیزیں اگر وہ اپنے نصابِ زندگی سے ہٹا لیتے ہیں تو ان سے ہمیں گلے ملنے میں کسی طرح کا پس و پیش نہ ہوگا۔ آج سے چند سال پہلے یہ خبر اخبارات کی زینت بنی تھی کہ جمعیۃ العلماء کے ایک وفد نے اجمیر معلیٰ حاضر ہو کر "حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز" کے حضور میں پُرجوش نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، نذرانۂ عقیدت پیش کرتے وقت معمولاتِ اہلِ سنّت ان کے پیشِ نگاہ تھے انہوں نے اپنے بزرگوں کے فتاوے کا قطعی خیال نہیں کیا ادھر چند سالوں سے اخبارات

میں یہ خبر آرہی ہے کہ اجمیر معلیٰ میں ''جمعیۃ العلماء'' نے زائرین حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کی سہولت کے لیے ''میڈیکل کیمپ'' لگا دیا ہے اور درگاہ سے وابستہ افراد ان کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہیں وان کا یہ بیان بھی میڈیا کی زینت بن رہا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد مزار خواجہ غریب نواز پہ چادر پوشی، گل پوشی اور فاتحہ خوانی کا سلسلہ ''جمعیۃ العلماء'' ہی کی کوششوں سے شروع ہوا، ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد خانقاہ سے وابستہ افراد کا یہ بھی بیان آجائے کہ خواجہ غریب نواز کے مزار کی تعمیر و توسیع میں بھی علمائے دیوبند نے اہم رول ادا کیا ہے اور اکبری گیٹ، شاہجہانی مسجد اور دوسرے آثار کی تعمیر وتزئین اور تشہیر میں بھی علمائے دیوبند کا خونِ جگر شامل ہے مذکورہ آثار غلطی سے اکبر اور شاہجہاں کی طرف منسوب ہوگئے ہیں۔ یہ وہی ''جمعیۃ العلماء'' ہے جس کے بزرگوں کی کتابوں میں یہ عبارت دیکھی جاسکتی ہے کہ خواجہ غریب نواز کے مزار پہ حاضری کی نیت سے اجمیر کا سفر کرنا زنا کرنے سے بھی بدتر ہے کچھ سالوں پہلے ذاکر نائک نے یہ بیان دیا تھا کہ اگر ہندستان پہ ہماری حکومت ہوجاتی ہے تو ہم ملک کے سارے مزارات پہ بلڈوزر چلوا دیں گے۔ آج بھی علمائے دیوبند اپنی تحریر وتقریر میں اولیا بےزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے ضائع نہیں ہونے دیتے اگر ان کی رسول دشمنی اور اولیا بےزاری پہ بیانات اکٹھے کیے جائیں تو کئی مجلدات تیار ہوجائیں ان کی اس عقیدہ فروشی کے پس پشت ان کے کچھ خاص مقاصد ہیں ہم ان کے خفیہ مقاصد کی نقاب کشائی ان شاء اللہ بعد میں کریں گے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا وہابیہ دیابنہ کی فطرت کا حصہ ہے ان کی تقیہ بازی شہرت رکھتی ہے، ان کے تضادات سے بھی دنیا اچھی طرح واقف ہے، جن اختیارات وتصرفات کو وہ انبیا واولیا کے لیے کفر و شرک سمجھتے ہیں، وہ سارے اختیارات و تصرفات اپنے گھر کے بزرگوں کے لیے عین اسلام سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے ''خون کے آنسو''، ''زلزلہ'' اور ''زیروزبر'' کا مطالعہ کریں۔

اس وقت عالمی حالات عموماً اور ملکی حالات خصوصاً مسلمانوں کے حق میں نہیں ہیں اپنے ملک میں مسلمانوں کا خون پانی سے بھی ارزاں ہوچکا ہے، سیاسی طاقتیں ہمیں حاشیے پر بھی دیکھنا نہیں چاہتیں، ہم اپنی بےبسی، بےکسی اور بدحالی کی کسی سے شکایت بھی نہیں کرسکتے، ہماری آہ وفریاد عدالتوں کی دیوار ودر سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑ دیتی ہیں ہم بےسروسامانی کے نازک ترین دور سے گذر رہے ہیں ایسے حالات میں محبوبانِ الٰہی کی چوکھٹ ہی ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہے ہم جیسے بھی ہیں خواجۂ خواجگان، فخر ہندستان، عطائے رسول کی غلامی کا پٹہ ہماری گردنوں میں ہے ہم دور دراز کا سفر طے کر کے ان کے دربارِ پُرانوار میں حاضر ہوتے ہیں، ہم جہاں ذاتی مشکلات کا ان سے ذکر کریں وہیں ملک میں اپنی آبرومندانہ زندگی اور امن وعافیت کی بھی دعائیں کریں، دعائیں اجتماعی بھی ہوں اور انفرادی بھی اگر ان کی بارگاہ میں ہماری پُردرد دعائیں قبول ہوجاتی ہیں تو یقیناً طاغوتی طاقتوں کے سر خمیدہ ہوں گے، ہم رجب المرجب کے اس بابرکت مہینے میں زائرین اور حاضرین کو تہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ''مجلہ الکوثر'' حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے افکار ونظریات کا ترجمان ہے جس جذبے، جس خلوص اور جس تقدیس احساس کے ساتھ انہوں نے دین وشریعت کی خدمت سرانجام دی ہے وہ جذبہ، وہ خلوص اور وہ تقدیسی احساس ''الکوثر'' کے پاس نہیں ہے لیکن کائنات میں آبرو مندانہ زندگی گذارنے کے لیے جو خطوط انہوں نے متعین کیے ہیں ''الکوثر'' کے دل ودماغ میں وہ خطوط بہرحال محفوظ ہیں۔ اسلاف و اکابر کے نقوشِ حیات نشانِ منزل ہوتے ہیں، چراغِ راہ ہوتے ہیں اور چراغِ رہگذر ہوتے ہیں۔ اسلاف واکابر کے نقوش وعکوس جب بھی نظرانداز کیے گئے ہیں قومِ مسلم بےآبروئی کی شکار ہوئی ہے۔ حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز نے ہمارے لیے جو دستورِ حیات، اصولِ زندگی اور شعورِ زندگی چھوڑا ہے ''الکوثر'' اسی شعور کی تجدید، اسی شعور کا نفاذ اور اسی شعور کی تشہیر چاہتا ہے۔ ''الکوثر'' چاہتا ہے کہ ہر دل میں محبوبانِ الٰہی وعشاقِ رسالت پناہی کی یادوں سے چراغاں رہے۔ ہر گھر کی دہلیز پہ محبوبانِ الٰہی کے ناموں کے طغرے آویزاں رہیں۔ جس معاشرے میں عشاقِ مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادوں کے دیپ جلتے ہیں

وہاں تاریکی نہیں ہوتی، وہاں جہالت نہیں ہوتی، وہاں آزاد خیالی اور فکری آوارگی کو داخلے کی اجازت نہیں ملتی۔ جو لوگ محبوبانِ خدائے قادر وقیوم کے اسماء کی تسبیح پڑھتے ہیں ان کی ہر سانس ہر خوف سے بے نیاز ہوتی ہے۔ حضور سیّدنا خواجہ غریب نواز کے خلاف طوفان اٹھتا ہے لیکن طوفان جہاں سے اٹھتا ہے وہیں پلٹ کر دم توڑ دیتا ہے۔ جس طرح کل کی کفر نواز دنیا ان سے خوف زدہ تھی آج کی کفر نواز دنیا بھی خوف زدہ ہے۔ وہ آج بھی چاہیں تو اپنی ایک توجہ سے نظامِ عالم زبر وزیر کر سکتے ہیں۔ آج ہم پہ اس لیے خوف کا پہرا ہے کہ انہوں نے بے خوف زندگی کا جو اصول دیا تھا وہ اصول ہمارے نصابِ حیات سے نکل گیا ہے ''الکوثر'' اس اصول کو نصابِ حیات میں شامل کرنا چاہتا ہے۔

آج کا اسلامی معاشرہ اس اونٹ کی طرح ہے جس کا کوئی ساربان نہ ہو۔ تسبیح خوانی تو خوب ہو رہی ہے لیکن ہر تسبیح خواں اپنے ذاتی مفاد کی چادر میں خود کو سر سے پاؤں تک چھپائے ہوا ہے۔ مزارات پہ پھول توٹنوں کے حساب سے چڑھائے جارہے ہیں لیکن ان پھولوں سے ذاتی مفاد کا تعفن اٹھ رہا ہے۔ اگر دل اصولوں اور سچی عقیدتوں کی جلوہ گاہ ہوتا تو ہم ہر وقت الٰہی ابابیل کی پناہ میں ہوتے۔ ''الکوثر'' بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانا چاہتا ہے، اسے زندہ رکھنا اور اس کی زندگی کے لیے پُرخلوص دعائیں کرنا ہماری مذہبی ذمہ داری ہے۔ ''الکوثر'' زراندوزی کی تحریک نہیں ہے، ذاتی مفاد کو وسعت دینے کی تحریک نہیں ہے، باہمی خلش کو ہوا دینے کی تحریک نہیں ہے اور شہرت ومقبولیت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے کی تحریک نہیں ہے۔ ''الکوثر'' عشق خدا و رسول کو معراجِ کمال تک لے جانے کی تحریک ہے۔ یہ دلوں کو خوف وخشیت کے نور سے اُجالنے کی تحریک ہے اور بھولے ہوئے اسباق کی تجدید کی تحریک ہے۔ یہ تحریک ہر اس بت کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہے جس سے تعصب، تنگ نظری اور ذاتی عصبیت کا دھواں اٹھتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دل حرارتِ عشق سے تپش آمادہ رہے، آنکھیں نورِ بصیرت سے معمور رہیں اور اتحادِ باہمی کی خوشبو میں معاشرہ نہاتا رہے تو ''الکوثر'' کے ہر غم میں اپنی بےلوث شرکت کا مظاہرہ کریں۔

ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے کہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ ایک طویل مدت کے بعد ایک زندگی بدوش اور ادب آموز تحریک نمودار ہوئی ہے۔ یہ تحریک پل پل ہماری توجہ چاہتی ہے۔

جماعت اہلسنّت حق وصداقت کی علامت ہے۔ یہی جماعت ''ما انا علیہ و اصحابی'' کی مصداق ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ جماعت اہلِ درد، اہلِ خلوص اور اہلِ صدق وصفا سے خالی ہوگئی ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جب سروں پہ قیامت کھڑی ہوگی۔ دیوانے نظام بدل دیتے ہیں اور فرزانوں کی جماعت خون میں گرمی پیدا کر دیتی ہے۔ ہمیں ایک ہزار ایسے دیوانوں، مستانوں اور فرزانوں کی ضرورت ہے جو صرف گیارہ سو روپیے سے ''الکوثر'' تحریک کی مدد کریں۔ اس طرح ''الکوثر'' کی تحویل میں اطمینان بخش رقم آجائے گی۔ آپ کے اس مختصر تعاون سے ''الکوثر'' کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگے گا اور یہی مختصر تعاون ''الکوثر'' کی دیرپا زندگی کی ضمانت بن جائے گا۔ آپ جب رقم بھیجیں تو اپنی تفصیلات کے ساتھ بھیجیں تاکہ ''الکوثر'' ہر وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت بنتا رہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے دس نکاتی پروگرام میں رسائل کے اجراء کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ مختصر تعاون اعلیٰ حضرت کے دس نکاتی پروگرام کو عملی شکل دینے کی سمت ایک مثبت پیش رفت سے تعبیر کیا جائے گا۔ ہم اپنے نفس کی آسودگی کے لیے بے خیالی میں بہت کچھ کر جاتے ہیں لیکن ہمیں افسوس نہیں ہوتا۔ تھوڑا وقت اور تھوڑا پیسہ دین وشریعت کی بہتری کے لیے دے کر دیکھیے بے قرار ومضطرب قلب کو کتنی راحت اور کس قدر سکون ملتا ہے۔ ''الکوثر'' کا مطالعہ حمد الٰہی ونعت رسالت پناہ میں شامل ہے اور ذکر الٰہی ونعت رسالت پناہ سے دلوں کو اطمینان کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنی گفتگو استاذِ زمن حضرت حسن رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے اس شعر پہ ختم کرتے ہیں۔

خواجۂ ہند وہ دربار ہے اعلیٰ تیرا
نہیں محروم کبھی مانگنے والا تیرا

□□□□

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی، مدیر اعلیٰ پیغام رضا، ممبئی
siddiquirahmat92@gmail.com

حضور مفتی اعظم ہند اور اصلاح معاشرہ

ادارتی نوٹ: اہلِ سنّت کی فکری و روحانی تاریخ میں کچھ نسبتیں محض ادارہ جاتی شناخت نہیں ہوتیں، وہ دل کی دھڑکن بن کر جیتی ہیں، نبضِ حیات کے تسلسل میں شامل ہو جاتی ہیں۔ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف اور خانقاہ رضویہ بریلی شریف ایسی ہی دو زندہ، بیدار اور بافیض نسبتیں ہیں دو روشن آنکھیں، جن کی بینائی سلامت رہے تو جماعت کا وجود وقار، توازن اور باہمی ربط کی روشنی میں قائم رہتا ہے۔ مگر جب ان میں کسی ایک کی لو مدھم ہونے لگے یا دونوں کے درمیان فاصلوں کی دراڑ پڑ جائے تو اس کی ٹیس براہ راست اہلِ سنّت کے اجتماعی وجود میں اترتی ہے اور پورا جسم ملت اس درد کو خاموشی سے جھیلنے لگتا ہے۔ مارہرہ شریف کی سرحدیں زمین پہ نہیں، دلوں میں قائم ہیں۔ یہ ادب، تعظیم، توقیر اور تسلیم کی وہ حدیں ہیں جو نسلوں کی روح میں پیوست ہیں۔ خانوادۂ رضویہ کی تاریخ اس حقیقت کی امین ہے کہ اس نے کبھی ان حدود کو پامال کرنے کی جسارت تو دور کی بات خواب بھی نہیں دیکھا۔ آج بھی وہ خود کو اپنے اس پیر خانے کا موروثی غلام سمجھتا ہے جہاں سے اس کی روحانی شناخت نے آنکھ کھولی۔ یہاں غلامی کمزوری نہیں، نسبت کا تاج ہے اور اسی تاج کی حفاظت میں خانوادۂ رضویہ نے نہ کبھی مارہرہ شریف کے کسی گستاخ کی پشت پناہی کی، نہ اسے اپنی آغوش میں پناہ دی۔ اس حقیقت سے چشم پوشی محض ناانصافی نہیں، یہ اس امانت سے غفلت ہے جو تاریخ نے ہمارے سپرد کی ہے۔

یہ بھی ایک تلخ مگر ناقابل انکار صداقت ہے کہ لغزش انسان کے قدموں سے لپٹ ہی جاتی ہے، کبھی بے خیالی میں، کبھی بے خبری میں۔ مگر بڑے دل لغزش کو مسئلہ نہیں بناتے، وہ اسے اصلاح کا دروازہ سمجھتے ہیں، وہ عالی ظرفی فراخ دلی اور حکمت کے ساتھ اس کا مداوا کرتے ہیں۔ مشائخِ خانقاہ برکاتیہ کی فراخ دلی اسی لیے ضرب المثل ہے کہ وہ زخم کو نمک نہیں، مرہم دیتے ہیں۔ ان کے سینوں میں خاندانِ برکات کے چشم و چراغ کی محبتوں کا چراغ روشن ہے اور یہ چراغ جب جلتا ہے تو اس کی لو صبر، حلم، درگزر اور اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند محض ایک منصب یا لقب نہیں، وہ ایک روحانی تسلسل کا نام ہیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے شہزادے، نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ کے چہیتے مرید و خلیفہ اور بقول حضور احسن العلماء سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن قادری برکاتی قدس سرہٗ، مشائخِ برکات کی ایک زندہ کرامت۔ ان کی ذات میں علم کی متانت، فقاہت کی صلابت، وقار کی خموشی اور خانقاہی نسبت کی حرارت اس طرح گندھی ہوئی ہے کہ انہیں الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھنا روحانی ناانصافی کے مترادف ہے۔

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی، مدیرِ اعلیٰ ''پیغامِ رضا''، ممبئی، نے ''حضور مفتی اعظم ہند اور اصلاحِ معاشرہ'' کے عنوان سے جو گفتگو پیش کی ہے، وہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، یہ ایک زخمی دل کی دھڑکن ہے جو کاغذ پہ سنائی دینے لگی ہے۔ اس میں درد ہے، ایسا درد جو چیختا نہیں، رستا ہے، اس میں کرب ہے، ایسا کرب جو آنکھوں میں نمی بن کر ٹھہر جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے مسافر کی آواز ہے جو کانٹوں بھرے راستے پہ ننگے پاؤں چل رہا ہے، جہاں ذرا سی لغزش دامن نہیں، وقار چاک کر دیتی ہے۔ یہی احساس مولانا موصوف کے ہر جملے سے ٹپکتا ہے۔

وہ دونوں خانقاہوں کے ماضی کی روشنی سے بھی واقف ہیں، حال کی نزاکتوں کو بھی پہچانتے ہیں اور فرقِ مراتب کے اداب سے بھی آگاہ ہیں۔ ان کا درد شخصی نہیں، یہ پوری جماعت کا کرب ہے، وہ کرب جو برسوں سے سینوں میں دفن ہے اور اب اصلاح کی صورت میں زبان مانگ رہا ہے۔ اگر اس درد کو تعصب کی عینک سے دیکھا گیا تو زخم ناسور بن جائے گا اور اگر اخلاص کی نظر سے پڑھا گیا تو یہی کرب شفا کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

ادارہ ''الکوثر'' اس گفتگو کو محض ایک موقف نہیں سمجھتا بلکہ ایک آہِ سحر گاہی مانتا ہے--- ایسی آہ جو شاید دونوں خانقاہوں کے درمیان پھیلتی ہوئی دھند کو چیر دے۔ ہمیں یقین ہے کہ خانقاہی حکمت، صوفیانہ حلم اور روحانی فراست اس نازک مرحلے پہ رہنمائی کرے گی اور اہلِ سنّت کی یہ دونوں روشن آنکھیں دلوں کی ٹوٹی ہوئی ڈور کو پھر سے باندھ کر، روحوں کی بکھری ہوئی صدا کو ایک آہنگ میں سمو کر پھر اسی شان سے دیکھیں گی جس شان سے انہوں نے صدیوں تک امت کو راستہ دکھایا ہے۔

یہ وقت الزام تراشی کا نہیں، احتسابِ نفس کا ہے، فاصلوں کو گننے کا نہیں، دلوں کے درمیان پل بنانے کا ہے اور سب سے بڑھ کر، اصلاحِ معاشرہ کے اس مقدس مقصد کو نگاہوں کے سامنے رکھنے کا ہے جس کے لیے یہ نسبتیں قائم ہوئیں اور جن کی برکت سے اہلِ سنّت کا وقار آج بھی سانس لے رہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے پھر روئے زمین پر کوئی مفتی اعظم ہند جیسا دانائے راز جلوہ گر ہوتا ہے، وہ شکم مادر ہی سے کمالات ولایت کی جامعیت لے کر آئے تھے۔ جس لباس کو آپ زیب تن فرما لیتے اس سے ولایت و کرامت کی خوشبو پھوٹنے لگتی تھی۔ ابتدا ہی سے جس پہ نگاہ ڈال دیتے کائنات کی فیروز مندی اس کے قدموں میں سمٹ آتی تھی تاریخ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ تازندگی آپ نے کسی کے سامنے اپنے لیے دست سوال دراز نہیں کیا۔ جب ان کی دہلیز پہ بھوک دستک دیتی تو فرماتے کہ بھوک لگی ہوئی ہے،

جب ان کے در پہ پیاس حاضر ہوتی تو زبان حق ترجمان پہ پیاس کا لفظ مچلنے لگتا اور جب چائے اور پان کی خواہش فریادی ہوتی تو آپ اپنے اہل عقیدت وضرورت کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار فرماتے یہ اطاعت سنت مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی معمولی تصویریں ہیں۔اگر کسی کو تھوڑا سا اعتبار مل جاتا ہے تو اس کی تلوار ہر وقت نیام سے باہر ہی ہوتی ہے اور یہاں کائنات قدموں میں مچل رہی ہے پھر بھی حکم جیسا لفظ زبان پر آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، وہ صرف نفاذ شریعت ہی پر حکم چلاتے تھے۔اور نفاذ دین وشریعت کے باب میں انہیں دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت خوف زدہ نہیں کر پاتی تھی، جب ان سے کہا گیا کہ آپ اپنا فتویٰ بدل دیں ورنہ وقت کا جبر آپ کی دستار تک پہنچ سکتا ہے تو بڑی شان بے نیازی سے فرمایا کہ احمد رضا کا بیٹا فتویٰ نہیں بدلتا وقت آنے پر حکومت بدل دیتا ہے۔انسانی قلوب ان کی مٹھی میں تھے جب آپ اپنی مٹھی بند کر لیتے تھے تو دنیا آپ سے غافل ہو جاتی تھی اور جب آپ اپنی مٹھی کھول دیتے تھے تو خلق خدا کا ہجوم بغیر کسی دعوت کے آپ کے در دولت پر اکٹھا ہو جاتا تھا۔آپ کی ذات خوشبو تھی۔جس سمت نکل جاتے گلیاں معطر ہو جاتیں۔آپ کی ذات میخانہ بھی تھی اور شفا خانہ بھی تھی۔خلوص نیت کے ساتھ آپ کے حضور جو حاضر ہوتا جام وحدت پی کر مست وسرشار ہو جاتا اور جو جسم وروح کا مریض ہوتا وہ شفا یاب ہو کر واپس جاتا۔جن کمالات سے ایک انسان کی شخصیت جامع ہوتی ہے وہ سارے کمالات آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔قرآن واحادیث نے ایک مومن کی جو تصویر کشی کی ہے اس میں آپ کی ذات بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔سنت وشریعت کے انوار جب ایک مرکز پہ جمع ہو جائیں تو حضور مفتی اعظم ہند کا سراپا نگاہوں میں گھومنے لگتا ہے۔

حضور مفتی اعظم ہند قدس سرہٗ کنواں بھی تھے اور بادل بھی تھے۔ جنہیں حضوری کی سعادت ملتی انہیں خوب پلاتے، پینے والوں کی اگر فہرست سازی کی جائے تو ایک ضخیم اور جامع کتاب تیار ہو جائے اور جو لوگ حضوری سے مشرف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہاں خود جا کر برس جاتے۔آپ کی نوازشات وعنایات کی بارش میں نہانے والوں کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے۔خدمت خلق کی روش ہی پر آپ پیدا ہوئے تھے۔ساری زندگی خود کو خدمت خلق میں مصروف رکھا۔جس طرح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی زندگی کی کوئی سانس عبادت سے خالی نہیں تھی اسی طرح آپ کی ہر سانس پہ شریعت کا پہرہ نظر آتا ہے۔آپ دنیا میں تھے لیکن آپ کی ذات میں دنیا نہیں تھی، علوم ومعارف کا کوئی ایسا باب نہیں جس سے آپ کا گذر نہ ہوا ہو۔ آپ کو بھی وہبی علوم حاصل تھے۔آپ کی بارگاہ میں جو بھی سوالات آتے آپ کتابوں سے رجوع ہوئے بغیر ان کے جوابات فراہم کرتے، آپ کے عہد میں ایسی خصوصیت شاید ہی کسی کو حاصل رہی ہو جس طرح آپ ظاہر کو دیکھتے تھے اسی طرح باطن پہ بھی آپ کی نگاہ ہوتی تھی۔ماضی، حال اور مستقبل سب آپ کے حضور آئینہ تھا۔آپ کی دینی، ملی اور علمی عظمتوں کو آپ کے مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے۔جو مراتب اور مدارج دوسروں کو برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔آپ کسی ریاضت کے بغیر ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔خلق خدا کی خدمت ہی آپ کی کٹھن ریاضت تھی، آپ کی رفعت شان وعظمت مکان کو آپ کے والد ماجد اور آپ کے مرشد گرامی کے فرامین میں دیکھا جاسکتا ہے۔آپ کے فضائل وکمالات پہ مزید گفتگو سے پہلے ذیل میں آپ کا ایک سوانحی خاکہ پیش ہے۔

حضور مفتی اعظم ہند محمد (عرف) مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ (وصال ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) ابن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) ابن مفتی نقی علی خاں قادری برکاتی قدس سرہٗ (وصال ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) ابن مفتی رضا علی خاں قادری بریلوی قدس سرہٗ (وصال ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۵ء) اپنے تمام تر علمیت وفضیلت اور علوئے عظمت ورفعت کے ساتھ بریلی شریف میں (۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء) میں پیدا ہوئے۔اور اپنی بے پناہ ذہانت وفطانت، عبادت وریاضت اور استقامت فی الدین کے باعث پورے عالم اسلام میں اپنے گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑ گئے۔آپ

نے جو عشق حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع فروزاں کی ہیں اس کی روشنی سے عالمی برادری قرنوں روشن ومنور ہوتی رہے گی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نیاز عقیدت ومحبت پیش کرنے کے لیے اپنے شیخ طریقت مرشد گرامی خاتم الاکابر حضور سید شاہ آل رسول احمدی میاں قادری برکاتی قدس سرہٗ (وصال ۱۲۹۶ھ) کی باعظمت وعرش نشان بارگاہ میں حاضر ہیں۔ عارف باللہ نور العارفین حضور سید شاہ ابو الحسین احمد نوری برکاتی قدس سرہٗ العزیز (وصال ۱۳۲۴ھ) مسجد برکات سے نماز ادا فرما کر مسجد کے زینے سے اتر رہے ہیں، صبح کا وقت ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنے مرشد زادے کے نقوش قدم کو تصور میں چشم عقیدت سے بوسہ لیتے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ حضور نوری میاں گویا ہوتے ہیں۔ مولانا آپ کے گھر میں ایک مبارک بچہ پیدا ہوا ہے۔ ہم نے اس نومولود بچے کا نام آل الرحمٰن مصطفیٰ رضا رکھا ہے۔ ہم اسے اپنی بیعت میں لیتے ہیں اور سلسلۂ قادریہ برکاتیہ کی ساری خلافتیں، اجازتیں عطا کرتے ہیں۔ یہ بچہ بہت بڑا عالم دین ہوگا دین اسلام کی بہت خدمت انجام دے گا اور بہت سارے لوگ اسکے ذریعے رشد وہدایت پائیں گے۔ اس سلسلے میں حضرت سید شاہ آل رسول حسنین میاں نظمی قدس سرہٗ رقمطراز ہیں:

''مارہرہ شریف کی خانقاہ برکاتیہ کی جامع مسجد جس کی پیشانی پہ لکھا ہے خانہ عبادات آل احمد مسجد کی پختہ سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں قطب مارہرہ سید شاہ ابو الحسین احمد نوری میاں صاحب قدس سرہٗ العزیز ہمراہ ہیں اپنے وقت کے مدار علم وفضیلت امام اہلسنت مجدد دین وملت شاہ احمد رضا خان قادری برکاتی قدس سرہٗ مرشد اعلیٰ خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول احمدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جانشین کا ساتھ ہے۔ اس لیے امام عشق ومحبت سراپا ادب بنے ہوئے ہیں تبھی سرکار نوری میاں صاحب فرماتے ہیں۔ مولانا صاحب مبارک ہو آپ کے یہاں فرزند تولد ہوا ہے۔ ہم نے اس کا نام آل الرحمٰن مصطفیٰ رضا رکھا ہے۔ ہم اسے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں اپنی بیعت میں لیتے ہیں اور ساری اجازتیں، خلافتیں عطا کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بریلی آ کر بیعت کی خاندانی رسم بھی ادا کریں گے۔ یہ وہی دن وہی ساعت تھی جب بریلی کے مشہور ومعروف پٹھان گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور جس کی پیدائش کی نوید میلوں دور مارہرہ میں موجود پیر روشن ضمیر نے اس بچے کے باپ کو دے دی تھی۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی کے یہاں بچے کی آمد آمد ہوتی ہے تو آدمی اپنے سارے کام چھوڑ کر گھر پہ رہنے کو ترجیح دیتا ہے، ملازمت پیشہ آدمی کام سے چھٹی لے لیتا ہے، کاروباری آدمی تجارتی دورے ملتوی کر دیتا ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ وقت گھر پر ہی رہے۔ نہ جانے کب زچگی وغیرہ کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنی پڑے مگر یہ کیا معاملہ ہے، احمد رضا کے گھر نیا مہمان آنے کو ہے اور وہ مارہرہ میں اپنے مرشد زادے کے مہمان بنے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ امام احمد رضا کے سارے معاملات مرشد کے آستانے سے وابستہ تھے۔ آج بھی وہ اپنے مرشد کی خدمت میں اسی لیے حاضر تھے کہ اس در سے ایک ایسے فرزند کی خوشخبری لے کر جائیں جو بڑا ہو کر تاجدار اہلسنت، محافظ شریعت اور صاحب عشق ومحبت بنے۔

چھ ماہ بعد حضرت نوری میاں صاحب بریلی شریف تشریف لے جاتے ہیں نومولود کو نہالچہ پر سرکار کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ نوری میاں صاحب بڑی شفقت سے گود میں لیتے ہیں۔ یہ کون ہے؟ یہ چشم وچراغ خاندان برکات کا لخت جگر ہے، جن کے مبارک ہاتھوں نے اس کے پیدا ہونے کی دعا مانگی تھی۔ آج وہی ہاتھ اس پر شفقت برسا رہے ہیں۔ نوری میاں صاحب کلمہ کی انگلی بچے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ سبحان اللہ شاید بچے کو بھی معلوم ہے کہ میرے والد کے قلم سے یہ شعر نکلا ہے؟

تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

یہ نوری گھرانے کے نوری فرد نوری میاں کی انگلی ہے۔ بچہ بڑے چاؤ سے انگلی چوس رہا ہے۔ نوری میاں بڑی شفقت سے

مسکراتے ہوئے اپنے خاندان عالی کا نور بچے کے سینے میں انڈیل رہے ہیں۔قطب مارہرہ کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا ہے کہ بچہ آگے چل کر ولایت کی منزلیں طے کرے گا۔ سچ ہے۔ولی را ولی می شناسد۔(پیغام رضا،مفتی اعظم نمبر،ص ۳۱-۳۲، ۱۹۹۷ء)

ایک عارف باللہ کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہوئے الفاظ کی صداقت تاریخ کے سینے پر نقش ہوگئی ہے۔دنیا نے دیکھ لیا کہ حضور مفتی اعظم ہند قدس سرہٗ جیسا زبردست عالم ربانی،فقیہ،مدبر اور مفسر تیرہویں صدی ہجری میں پورے عالم اسلام میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا،وہ فقہ وافتاء کی فطرت پیدا کیے گئے تھے۔آپ نے دین اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں اور خلق خدا کی ہدایت ورہنمائی کا جو فریضہ انجام دیا ہے عالمی برادری اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔آپ جب تک بقید حیات رہے علمائے شریعت اور مشائخ طریقت اپنے اپنے ماننے والوں کو یہی پیغام دیتے رہے کہ اگر تمہیں شبیہ غوث اعظم دیکھنا ہو تو بریلی شریف کی سرزمین پر شہزادۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی صورت میں محمد مصطفی رضا کو دیکھ آؤ۔ان کی ذات غوثیت مآب کی چلتی پھرتی کرامت ہے۔جس نے ان کی کرامت مآب شخصیت کو تسلیم نہیں کیا وہ بھیڑ میں گم ہوگیا جس نے انکے کسی بھی شرعی فیصلے کی مخالفت کی یا اس کی تائید وتصویب سے انکار کیا زمین پر اس کا وجود ایک بوجھ بن کر رہ گیا۔

حضور مفتی اعظم ہند قدس سرہٗ اپنے عہد میں صدق وصداقت، خوف وخشیت اور عشق وعرفان کی ایک معتبر آواز تھے جس طرف ان کا رخ ہوتا دنیا اسی طرف دیکھنے لگتی ۔ وہ اپنی ذات میں ایک خاموش انقلاب تھے۔

ان کے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اور ان کے مرشد گرامی نور العارفین خاتم الاقطاب (خاندانی تناظر میں) حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے ان کی تربیت پہ خصوصی توجہ دی تھی۔وقت کے دو اقطاب کی انہیں سرپرستی حاصل تھی، جن کی ہر سانس پہ دو اقطاب زمانہ کی پہرے داری ہو ان کی عظمتوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔جسے ان کے پہلو میں بیٹھنے کی سعادت مل جاتی وہ زمانے میں چاند وسورج کی طرح روشن ہو جاتا۔ان کی دہلیز پہ اجابت ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ان کے در پر ہر وقت بھیڑ لگی رہتی۔دردمندوں کے ہجوم کو دیکھ کر ان کی پشانی کی نورانیت میں اضافہ ہو جاتا۔انہوں نے سائلوں کو کبھی محروم نہیں کیا،خود راقم الحروف کے گاؤں پوکھریرا کا واقعہ ہے ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل ہی دیوانوں کا ایک بڑا ہجوم اکٹھا ہوگیا اور وہ شدت سے آپ کا منتظر تھا۔جیسے ہی آپ کی جلوہ افروزی ہوئی اہل حاجت نے ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا۔آپ اہل حاجت کی حاجت روائی میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ آپ بہت کم وقت لیکر آئے تھے آپ کو دوسری جگہ بھی جانا تھا لیکن بھیڑ تھی کہ کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔آپ کے ہمراہ جو دوسرے میزبان تھے پل پل ان کے اصرار میں شدت آرہی تھی۔میزبان کی شدت کے پیش نظر آپ اہل حاجت کو چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے ڈرائیور کی لاکھ کوششوں کے باوجود گاڑی آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔آپ نے ڈرائیور سے فرمایا کہ تم دیکھو گاڑی اسٹارٹ کیوں نہیں ہو رہی ہے جب تک میں اہل حاجت کو دیکھ لیتا ہوں۔روایات ملتی ہیں کہ آپ اپنے آخری مریض کو دیکھنے کے بعد خود ہی گاڑی میں آکر بیٹھ جاتے ہیں،ڈرائیور نے جیسے ہی چابی کو حرکت دی گاڑی دفعتاً اسٹارٹ ہو جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر موجودین حیرت واستعجاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔آپ صرف شریعت کے پابند تھے اور سارا زمانہ آپ کا پابند تھا۔کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھنا آپ کو پسند نہ تھا آپ کے عادات وخصائل دیکھ کر لوگوں میں شریعت کی پابندی آجاتی تھی۔آپ کے عہد میں یہ قبولیت اور خصوصیت کسی کو حاصل نہ تھی۔آپ کی آواز پتھروں کو موم بنا دیتی تھی۔آپ کسی مخصوص طبقے میں محبوب ومقبول نہ تھے بلکہ ہر انسانی معاشرہ آپ کو انتہائی تکریم کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔آپ کے مرشد گرامی نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے ابتدا ہی میں اپنا حقیقت افروز فرمان جاری کیا تھا کہ اس نومولود سے خلق کثیر

ہدایت پائے گی۔

حضور مفتی اعظم ہند قدس سرہٗ کی بے پناہ عظمت ومقبولیت کی تفہیم کے لیے اتنا کافی ہے کہ دنیا مرشد کی تلاش میں سرگرداں ہوتی ہے۔شہروں اور ملکوں کا سفر کرتی ہے خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ مرشد کی تلاش میں تھے لیکن یہاں خود مرشد حضور مفتی اعظم ہند کی تلاش میں ہے اور مرشد اس خانقاہ کا صاحب سجادہ ہے جس خانقاہ میں شدید ریاضت ومجاہدے کی روشن تاریخ ملتی ہے۔ جہاں کسی کو مرید بھی مجاہدے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ جب خاتم الاکابر حضور سید شاہ آل رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کے حضور بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو آپ کو اسی وقت بغیر کسی ریاضت کے حلقۂ بیعت میں شامل کر لیا گیا اور اسی محفل میں ساری خلافتیں، اجازتیں اور ہدایتیں دے دی گئیں اور یہی نہیں بلکہ آپ کے مرشد گرامی نے اپنی شباہتیں بھی عطا فرمادیں، ان ساری عنایات نوازشات اور تبرکات دیکھ کر خود نور العارفین حضرت سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے اپنے دادا جان حضور خاتم الاکابر سے سوال کیا کہ حضور یہاں طویل ریاضات ومجاہدات کے بعد ہی بیعت وخلافت سے مشرف کیا جاتا ہے۔لیکن آج ہم خانقاہ برکاتیہ کے اصولوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔حضور خاتم الاکابر نے اپنے جانشین اور نبیرہ کو مطمئن کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگ زنگ آلود دل لے کر آتے ہیں اس لیے انھیں شدید ریاضت ومجاہدے سے گذارا جاتا ہے۔مولانا احمد رضا صاف وشفاف دل لے کر آئے تھے انہیں صرف نسبت کی ضرورت تھی۔لیکن نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ تو حضور مفتی اعظم ہند کو مارہرہ شریف خانقاہ برکاتیہ میں آنے کی بھی زحمت نہیں دی بلکہ حضور مفتی اعظم ہند کے لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں قطب وقت کا فرمان دیکھئے:

فجر کی نماز کے لیے جب دونوں بزرگ نماز کے لیے مسجد برکاتیہ پہنچے تو مسجد کے دروازے پر ہی دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی۔اور وہیں ایک نے دوسرے کو مبارکباد پیش کی۔فجر کی نماز کے بعد نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے ارشاد فرمایا مولانا صاحب آپ اس بچے کے ولی ہیں اگر اجازت دیں تو میں نومولود کو اپنے حلقہ بیعت میں لے لوں، اعلیٰ حضرت نے عرض کیا حضور غلام زادہ ہے آپ اسے اپنے سلسلۂ بیعت میں داخل فرمالیں۔

نور العارفین حضور سید شاہ ابو الحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے مصلے ہی پر بیٹھے بیٹھے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے نور نظر لخت جگر 'آل الرحمٰن' اور مستقبل کے مجدد و مفتی اعظم کو غائبانہ داخل سلسلہ فرمالیا، نور العارفین نے اعلیٰ حضرت کو اپنا عمامہ اور جبہ عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''میری یہ امانت آپ کے سپرد ہے جب وہ بچہ اس امانت کا متحمل ہو جائے تو اسے دے دیں مجھے خواب میں اس کا نام ''آل الرحمٰن'' بتایا گیا ہے۔لہٰذا نومولود کا نام ''آل الرحمٰن'' رکھیے۔ مجھے اس بچے کو دیکھنے کی تمنا ہے۔وہ بڑا ہی فیروز بخت اور مبارک بچہ ہے۔میں پہلی فرصت میں بریلی حاضر ہو کر آپ کے بیٹے کی روحانی امانتیں اس کے سپرد کر دونگا۔

دوسرے روز جب ولادت کی خبر مارہرہ پہنچی تو نور العارفین حضور سید شاہ ابو الحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے نومولود کا نام ابو البرکات محی الدین جیلانی منتخب فرمایا۔

(پیغام رضا، مفتی اعظم نمبر، ص ۳۳-۱۷۔۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے حوالے سے نور العارفین قطب مارہرہ حضرت سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے اپنے دادا، اپنے شیخ طریقت اور مربی خاتم الاکابر حضور سید شاہ آل رسول احمدی قدس سرہٗ زینت سجادہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف سے سوال کیا کہ خانقاہ برکاتیہ کے قدیم دستور اور اصول کو نظر انداز کیے جانے کے پس پردہ کیا مقاصد ہیں مرشد کریم سے جواب پا کر نو

رالعارفین مطمئن ہو گئے۔ آج ہم عالم تصور میں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ حضور اعلیٰ حضرت تو خانقاہ برکاتیہ میں خاتم الاکابر کے حضور سراپا نیاز بن کر حاضر ہوئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے خاتم الاکابر سے سوال کیا تھا اور یہاں حضور مفتی اعظم ہند مارہرہ شریف بھی حاضر نہیں ہوئے تھے ان کو مرید کرنے اور اپنی بے شمار عنایات، نوازشات اور تبرکات سے انہیں شرفیاب کرنے کے لیے آپ خود بریلی شریف حاضر ہوئے۔ اس کرم نوازی، عنایت پاشی اور بے پایاں توجہات کے اسباب کیا ہیں تو عالم تصور میں ہمیں نورالعارفین قدس سرہٗ کا جواب ملتا ہے وہ شکم مادر ہی سے صاف وشفاف دل لے کر پیدا ہوئے تھے، غوثیت مآب کی شباہت ونیابت انہیں حاصل تھی۔ اس لیے انہیں ہم نے مارہرہ شریف نہیں بلایا بلکہ ان کے لیے ہم خود بریلی شریف حاضر ہو گئے۔

خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کی عظمت ورفعت کے اظہار واعلان کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہ ملک کی واحد خانقاہ ہے جس کی آغوش میں اپنے اپنے وقت کے سات قطب محو خواب ہیں۔ نورالعارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ اس خانقاہ کے آخری قطب تھے۔ ایک قطب وقت کا مقام ومرتبہ کیا ہوتا ہے یہ اہل شریعت وطریقت پہ خوب روشن ہے۔ عظمتیں ہر وقت حضور نور العارفین کا طواف کرتی تھیں، ان کی نگاہیں عرش بدوش تھیں، وہ مٹی پہ نگاہ ڈالتے تو سونا بنا دیتے، منزلیں اور رفعتیں ان کے قدموں سے نیاز لیتیں، وہ زمین پر بیٹھ کر ہر وقت عرش کی قندیلوں کا مشاہدہ کرتے تھے، حضور مفتی اعظم ہند کو انہوں نے اپنا آئینہ بنا دیا تھا۔

نورالعارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ کا شمار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے اساتذہ اور مرشد اجازت میں ہوتا ہے۔ اتنی عظیم اور رفعت مآب ذات آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔ نسل نو تو ان سے آشنا بھی نہیں ہے۔ اگر مشائخ مارہرہ کی سیرت وسوانح دیانت اور علم وتحقیق کی روشنی میں ترتیب دی جائے تو ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہوں گے موجودہ مشائخ مارہرہ اہلسنت کی آواز کے پلیٹ فارم سے دوسرے بزرگوں کے ساتھ اپنے بزرگوں کا بھی تعارف دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں لیکن اہلسنت کی آواز بھی عام درسگاہوں، خانقاہوں اور جامعات میں پہنچ نہیں پاتے اس کی ترسیل، تقسیم اور تشہیر پہ مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حضور مفتی اعظم ہند خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کی امانت بھی ہیں اور مشائخ مارہرہ کی کرامت بھی ہیں۔ مارہرہ شریف اور بریلی شریف اہلسنت کی دو روشن آنکھیں ہیں۔ ان دونوں آنکھوں کی روشنی کی حفاظت وصیانت دونوں خانقاہوں کے مشائخ کی دینی، ملی اور مذہبی ذمہ داری ہے۔ جماعت اہل سنت کے بعض نادان دوست دونوں خانقاہوں کے درمیان بڑی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ اگر وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے تو جماعتی وحدت کو بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ جن لوگوں کو مارہرہ شریف کا راستہ نہیں معلوم تھا آج وہ لوگ مشائخ مارہرہ کے ہم پیالہ وہم نوالہ بنے ہوئے ہیں۔

بریلی شریف یا مشائخ بریلی خانقاہ برکاتیہ سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ خانقاہ رضویہ بریلی شریف خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کی میراث ہے اور مشائخ بریلی اس رشتۂ محبت کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ فلسفہ ذہن میں رہے کہ ہر برکاتی رضوی نہیں ہے لیکن ہر رضوی برکاتی ہے۔ کسی رضوی کے دل میں برکاتیت سے خلش ہے تو وہ کسی بھی اعتبار سے رضوی نہیں ہے۔ رضویت کے دستور اساسی میں برکاتیت سے بے لوث محبت شامل ہے اور یہ دستور کی ایسی دفعہ ہے جس میں کسی طرح کے تغیر وتبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔

بریلی شریف مرکز اہلسنت ہے اور اس کی مرکزیت کی اساس چشم وچراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات وشخصیت ہے۔ خاندان برکات کا چشم وچراغ اساس مرکزیت ہے۔ اعلیٰ حضرت پوری دنیا میں چشم وچراغ خاندان برکات کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ پورے برصغیر ہند وپاک کا دینی، ملی اور مسلکی نظام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس

سرہٗ سے وابستہ ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت کی شخصیت سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے تو پورے برصغیر ہند و پاک کا دینی، ملی، مسلکی اور خانقاہی نظام بگڑ جائے گا۔ اعلیٰ حضرت صرف خاندان رضویہ و خاندان برکاتیہ کی امانت نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ حضرت جماعت اہلسنت یعنی اسلام کی امانت ہیں اور اس امانت کا رشتہ بارگاہ رسالت مآب و بارگاہ غوثیت مآب سے انتہائی مربوط اور مستحکم ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ خود فرماتے ہیں:

اسی در پر تڑپتے ہیں، مچلتے ہیں، بلکتے ہیں
اٹھا جاتا نہیں کیا خوب اپنی ناتوانی ہے
پیش نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے
حکم نافذ ہے تیرا، خامہ تیرا سیف تیری
دم جو چاہے کرے دور ہے شاہا تیرا
تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اس کو شفیع
جو مرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

چشم و چراغ خاندان برکات:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سفیر عشق مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ ان کا پورا وجود عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تپش آمادہ تھا۔ ان کا خود فرمان ہے کہ اگر میرے دل کے دو ٹکڑے کیے جائیں تو ایک پر لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پر محمد رسول اللہ لکھا ہوگا۔ ان کی ذات فنا فی اللہ بھی تھی فنا فی الرسول بھی۔ فنا فی الغوثیت مآب بھی تھی اور فنا فی الشیخ بھی اور اپنے عہد میں وہ ہر منزل کے امام تھے عشق جیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو یہ عالم تھا کہ در مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضوری کو وہ عصیاں کی دوا سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہمارے جگر میں ہر وقت درد رہتا ہے۔ اس درد کو کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ درد عشق مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درد ہے اور ہم خدائے قادر و قیوم کے دربار میں ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر گھڑی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا عشق مصطفیٰ جان رحمت میں کبھی کسی طرح کی کمی نہ ہونے پائے بلکہ عشق کی یہ آگ ہر وقت شعلہ فشاں رہے، وہ فرماتے ہیں کہ عشق مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جان ایمان ہے اس میں روز ترقی ہوتی رہے۔ اس آتش عشق میں جو لذت ہے وہ کوئی دوا کسی بھی حال میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ آئینۂ عشق مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کسی طرح کی دھول دیکھنے کے قائل نہیں تھے اس تقدس مآب آئینے پہ اگر کسی کو دھول ڈالتے ہوئے دیکھ لیتے تو ان کا قلم جو تلوار سے زیادہ تیز تھا فوراً نیام سے باہر آجاتا اور اس وقت تک نیام کے اندر نہیں جاتا جب تک دشمن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رگوں سے سارا خون نچوڑ نہیں لیتا۔ ان کے دل میں اعدائے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ زمین پر دشمن مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے کے کسی بھی حال میں قائل نہیں تھے۔ چونکہ ان کے عہد میں عشق رسالت مآب ہی دشمنان دین کے نشانے پہ تھا۔ دشمنان عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی سرکوبی کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ نفاذ عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باب میں کبھی کسی غفلت کے شکار نہیں ہوئے وہ قدم قدم پر عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چراغ جلاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد میں آپ پورے عالم اسلام کے مقتدا و پیشوا بن گئے۔ علمائے حجاز نے آپ کو تعظیم و توقیر کی جس منزل پہ بٹھایا ہے تاریخ میں وہ منزل، وہ مقام اور وہ رتبہ آج تک کسی کو نہ مل سکا یہ آپ کی تحریک کے موثر ہونے کی روشن دلیل ہے۔

چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ پہ ان کے مرشد اور شیخ طریقت حضور خاتم الاکابر کی خصوصی توجہات تھیں اور انہیں ان سے بہت ساری امیدیں بھی تھیں۔ اسی لیے ان کے شیخ طریقت کا فرمان ہے کہ کل میدان محشر میں مولانا احمد رضا کو میں خدا کے حضور پیش کرونگا، اعلیٰ حضرت کے شیخ طریقت کا یہ فرمان ذیشان مسلک اعلیٰ حضرت کی اساس و بنیاد ہے۔ حضور خاتم الاکابر کے فرامین کو مشائخ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف نے خانقاہ کے دستور میں شامل کیا اور اس کے فروغ میں جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے وہ

تاریخ میں محفوظ ہے۔ اصطلاح مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ سب سے پہلے خانقاہ برکاتیہ ہی سے بلند ہوا اس باب میں پوری دنیا مشائخ برکات کی مقلد ہے۔

ہمارے مقالے کا عنوان ہے حضور مفتی اعظم ہند اور اصلاح معاشرہ، حضور مفتی اعظم ہند چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے شہزادے ہیں۔ نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ کی دعاؤں کا اگر کوئی پیکر دیکھنا چاہے تو وہ حضور مفتی اعظم ہند کو دیکھ لے۔ حضور نور العارفین کے مریدین، متوسلین اور معتقدین میں حضور مفتی اعظم ہند کو جو مقام و مرتبت حاصل ہے وہ شاید کسی کو حاصل نہ ہو، حضور نور العارفین نے خانقاہ برکاتیہ کا پورا میخانہ حضور مفتی اعظم ہند کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور نور العارفین نے خانقاہ برکاتیہ کا پورا میخانہ حضور مفتی اعظم ہند کے سپرد کر دیا تو خانقاہ برکاتیہ میں کیا رہ گیا؟ اہل حال وقال جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہیں میخانہ وجود میں آجاتا ہے۔ بزرگوں کا فیضان مثل چراغ ہے۔ جس طرح ایک چراغ سے لاکھوں چراغ جلائے جاسکتے ہیں اور پہلے چراغ کی روشنی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوگی اسی طرح ایک صاحب حال وقال کی توجہ سے لاکھوں میخانے آباد ہوسکتے ہیں اور ان کا اپنا میخانہ بدستور کام کرتا رہے گا۔ حضور نور العارفین کی خصوصی نوازشات وعنایات سے حضور مفتی اعظم ہند کی رفعت شان کے جھنڈے سمتوں میں لہراتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔

چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات میں خدائے قادر وقیوم نے اتنے سارے علوم وفنون جمع فرما دیئے تھے کہ صدیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی، اعلیٰ حضرت کی فکر میں اسلام کو مچلتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی فکر کو چھیڑنا اسلامی اصولوں کو چھیڑنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کی فکر سے جو الجھتا ہے وہ کائنات میں بے نام ونشان ہوجاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت جیسی شخصیت جس شہر میں ہوگی وہی شہر اہلسنت کا مرکز ہوگا۔ مجدد بنایا نہیں جاتا بھیجا جاتا ہے، مبعوث ہوتا ہے وہ احکام الٰہی کا داعی اور عظمت رسالت کا پیامی ہوتا ہے۔ اگر مجدد بنایا جاتا تو ہر گاؤں کھیڑے میں لوگ مجدد بنا دیتے، جس کے قول وعمل سے بدعات ومکروہات کو فروغ ملے وہ مجدد نہیں ہوسکتا، اور ایسے شخص کے سر پہ کسی بھی عہد میں مجدد کی وقار آفریں دستار نہیں سجائی گئی۔ مرکزیت کے حوالے سے کسی شاعر نے بڑی دل لگتی بات کی ہے کہ:

مرکزیت کا شرف ہوگا اسی کو حاصل
جس جگہ پیدا کوئی احمد رضا خاں ہوگا

چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ خانقاہ برکاتیہ کی امانت بھی ہیں اور میراث بھی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی شخصیت پہ خاندان برکات کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس مہر کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، اس مہر کو بارگاہ رسالت مآب سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ حضور خاتم الاکابر کا فرمان ذیشان ہے کہ خاندان برکات کی کتابیں مولانا احمد رضا کو دکھائی جائیں جس کتاب کی اشاعت کی وہ اجازت دے دیں وہ چھاپی جائے اور یہ اختیار انہیں بارگاہ رسالت سے ملے ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی جائے ولادت بریلی شریف ہے اور ان کا پیرخانہ مارہرہ شریف ہے۔ ان کے پیرخانے کے آخری قطب نور العارفین حضور سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے ان کے سر پہ چشم و چراغ خاندان برکت کی دستار رکھی ہے۔ حضور نور العارفین کا عمل اپنے اندر بڑی گہرائی، وسعت اور جامعیت رکھتا ہے اس میں ان کے حکمت، تدبر، دور بینی اور مستقبل بینی بھی جھلکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے والد ماجد خاتم المحققین حضرت مولانا مفتی نقی علی خاں قادری برکاتی قدس سرہٗ، اعلیٰ حضرت کے دونوں شہزادگان حضور حجۃ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد حامد رضا خاں قادری برکاتی قدس سرہٗ اور حضور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا خاں قادری برکاتی قدس سرہٗ اسی پیم نگری خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف

کے دست گرفتہ تھے۔ یہ سب کے سب مشائخ برکات کی توجہات ونوازشات کے مرکز رہے ہیں۔ ان پہ نوازشات کا جو تسلسل تھا اس حوالے سے پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ انہیں ریاضات ومجاہدات کی وادی سے نہیں گذارا گیا۔ ان سے خلوت نشینی کا بھی مطالبہ نہیں ہوا۔ ان کی وفاداری بھی کبھی مشکوک نہیں رہی، بلکہ جن لوگوں نے کسی بھی جہت سے ان کی مخالفت کی مشائخ برکات نے ان سے شدید برہمی کا رظہار کیا یہی نہیں بلکہ خانقاہ برکاتیہ میں ان کی حاضری پہ بھی پابندی لگادی گئی، پیش رو میں آخری نام حضور احسن العلماء حضرت مولانا مفتی سید شاہ حیدر حسن قادری برکاتی قدس سرہٗ کا آتا ہے۔ ان سے سوال ہوا کہ مشائخ برکات کی کرامات میں سب سے بڑی کرامت کیا ہے؟ انہوں نے جو سوال کا جو جواب دیا اس پہ دنیا آج بھی حیران ہے، انہوں نے فرمایا کہ مشائخ برکات کی کرامات میں دو سب سے بڑی کرامت ہے ایک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اور دوسری حضور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اس حوالے سے ایک بزرگ کا بیان ملاحظہ کریں:

روایت متواترہ کے مطابق ممبئی کی ایک محفل میں جہاں بہت سارے علماء اور معززین شہر تشریف فرما تھے ایک شخص سے حضرت احسن العلماء کو مخاطب کرتے ہوئے ایک سوال کیا کہ حضور آپ کے خاندان کی سب سے بڑی کرامت کیا ہے؟ حضرت احسن العلماء نے فرمایا: ''میرے خاندان کی دو بڑی کرامتیں ہیں ایک کا نام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ہے اور دوسری کرامت کا نام مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی علیہا الرحمۃ والرضوان۔''

(اہلسنت کی آواز، ج دوم، ص ۷۱-۷۲)

حضرت ڈاکٹر سید امین میاں قادری برکاتی سجادہ نشیں خانقاہ برکاتیہ لکھتے ہیں:

سیدنا اعلیٰ حضرت بریلوی (جنہیں ان کے مرشدان کرام، چشم و چراغ خاندان برکات کہتے تھے) سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ دن میں کئی بار اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تذکرہ کرتا ان کی عادت تھی ہم بھائیوں سے کہتے تھے میرا جو مرید مسلک اعلیٰ حضرت سے ذرا سا بھی ہٹ جائے تو میں اس کی بیعت سے بیزار ہوں۔ اور میرا کوئی ذمہ نہیں ہے۔ فرماتے تھے یہ میری زندگی میں نصیحت اور میرے وصال کے بعد میری وصیت ہے۔ انتقال سے چند روز قبل برادرم سید نجیب حیدر نوری سے فرمایا کہ بیٹا مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے مسلک حق کو ہمیشہ مضبوطی سے تھامے رہنا۔ درحقیقت مسلک اعلیٰ حضرت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہی مسلک صاحب البرکات ہے، مسلک غوث اعظم ہے اور مسلک صدیق اکبر ہے۔ اعلیٰ حضرت کی شان میں ادنیٰ توہین کرنے والے سے ملنا انہیں گوارہ نہیں تھا خواہ اس کا تعلق کتنے ہی بڑے خانوادے سے ہو۔ کتنا ہی بڑا مقرر ہو یا پیر ہو ان کی کسوٹی اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت تھے۔ اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم کا ذکر میرے اعلیٰ حضرت اور میرے مفتی اعظم کہہ کر فرماتے تھے اور اعلیٰ حضرت کو رضائے آل رسول فرماتے تھے۔

(حضور احسن العلماء اور مسلک اعلیٰ حضرت، ص ۳۶ جماعت رضائے مصطفیٰ شاخ بھیونڈی ۲۰۱۷ء۔)

حضور احسن العلماء سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن قادری برکاتی قدس سرہٗ ولادت ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء وصال ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء) کے اعلیٰ حضرت ومسلک اعلیٰ حضرت کے حوالے سے اس طرح کے بکثرت واقعات ہیں اگر سارے واقعات ایک جگہ اکٹھا کردیئے جائیں تو ایک جامع کتاب تیار ہوجائے۔ اپنے عہد میں اعلیٰ حضرت دوستی میں نا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت کے وہ مرید نہیں تھے، مخدوم زادے تھے پھر بھی ان کی صبح وشام، خلوت وجلوت اور ان کے ذکر وفکر کی انجمن اعلیٰ حضرت کے ذکر سے روشن رہتی۔ جب وہ کسی بات پہ خفا ہوجائے تو ان کو منانے کی سب سے بہتر یہی صورت تھی کہ ان کے حضور اعلیٰ حضرت کا ذکر کیا جائے۔ اعلیٰ حضرت کا نام سنتے ہی ان کا جلال فوراً جمال میں تبدیل ہوجاتا۔ اعلیٰ حضرت کی محبت ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کرتی تھی وہ اکثر گنگناتے تھے کہ۔

تیری الفت میرے مرشد نے مجھے
دی ہے گھٹی میں پلا احمد رضا

یہ جنون محبت کسی دست گرفتہ کا نہیں بلکہ ایک ایسے مخدوم زادے کا ہے جس کی عظمتیں عرش بدوش تھیں جس کے حضور دراز گردنیں ہمیشہ قدم بوس رتی تھی۔ آقائی ان کی دہلیز پہ ہر وقت دست بستہ کھڑی رہتی تھی۔ جو ان کے حضور حاضر ہوتا مرادوں سے اپنی جھولی بھر کر واپس جاتا، جس سائل کے دل میں چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے کدورتیں ہوتیں اس سائل کو اپنے در پہ کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ مارہرہ شریف کی سرحدیں اس کے لیے بند کر دی جاتیں۔ اعلیٰ حضرت سے ان کے جنون محبت کی ایک پر اثر تصویر رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے کچھ اس انداز میں پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں:

آخری زیارت کا شرف مجھے ۲۴؍اگست ۱۹۹۵ء کو حاصل ہوا جبکہ حضرت دہلی کے جی بی پنتھ اسپتال میں دل کے آپریشن کے لیے سی، سی، او میں صاحب فراش تھے۔ ان کے عالی وقار صاحبزادگان پروفیسر ڈاکٹر سید محمد امین، سید محمد اشرف اور حضرت کے بھانجے پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم کی معیت میں ان کے کیبن میں داخل ہوئے حضرت کے نورانی چہرہ پر جیسے ہی نظر پڑی رقت طاری ہوگئی اور ہم آبدیدہ ہوگئے۔ حضرت پر بھی اس وقت کچھ اسی طرح کی کیفیت طاری تھی اسی عالم میں حضرت نے ''کل ہندسنی کانفرنس'' کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔ جو ۲۶؍اگست کو دہلی کے رام لیلا، میدان میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت نے اس کمترین کو اپنی دعاؤں اور حوصلہ افزا کلمات سے سرفراز کیا۔ دم رخصت فرمایا مسلک اعلیٰ حضرت پہ ڈٹے رہیے۔

آج سوچتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ ان کے ایمان کی حس کتنی بیدار تھی کہ موت کا فرشتہ ان کے سرہانے کھڑا تھا اور اس عالم میں بھی انہیں اپنے خاندان کی نہیں صرف مسلک اعلیٰ حضرت کی فکر دامن گیر تھی۔

اعلیٰ حضرت ناز کرو اپنے مقدر پر کہ تمہارے عشق رسول کے احترام میں خاندان نبوت کا ایک فرزند جلیل تمہاری یاد کو اپنے کفن میں چھپائے لے گیا۔ ہزاروں رحمتیں نازل ہوں تم پر بھی اور عالم جاوید کے اس فیروز مند مسافر پر بھی جس کا عشق موت کی ہچکیوں میں بھی زندہ وسلامت رہا۔ (حضور احسن العلماء اور مسلک اعلیٰ حضرت ص ۳۲، جماعت رضائے مصطفیٰ شاخ بھیونڈی ۲۰۱۷ء)

حضور مفتی اعظم ہند اور اصلاح معاشرہ، ایک کتابی سلسلہ ہے۔ فی الوقت جو گفتگو چل رہی ہے۔ یہ ضمنی بحث حالات کے تناظر میں زیر قلم آگئی ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند کی ذات کرامت مآب بھی مشائخ خاندان برکات کی توجہات سے سرشار رہی ہے۔ حضور نور العارفین کی جا عنایات انہیں حاصل تھیں ان عنایات کو ہم لفظوں کا پیکر نہیں دے سکتے۔ ان کی ذات عشق وعرفان کی جس بلندی پر مسند نشین ہے اچھے اچھوں کی جہاں تک رسائی بہت مشکل ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند کا نام آل الرحمٰن ابو البرکات محی الدین جیلانی، حضور نور العارفین ہی نے رکھا تھا۔ اس اسم مقدس میں فضائل وکمالات کی جو دنیا آباد ہے اس کا صحیح عرفان انہی کو ہوسکتا ہے جو علم وعمل، خوف وخشیت اور زہد و پارسائی کے سمندر میں روز غسل کرتے ہیں۔ ہماری نگاہیں صرف ظاہر کو دیکھتی ہیں حضور مفتی اعظم ہند کو باطن کی نگاہ سے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے ان کا ظاہر بھی اتنا حسین اور خوبصورت تھا کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا، جو ان کے حضور بیٹھ جاتا وہ دعا کرتا کہ اس حضوری کا سلسلہ تا حیات ٹوٹنے نہ پائے۔ ان کا وجود خوشبو تھا جس طرف سے گذر جاتے خوشبو سے فضائیں معطر ہوجاتیں، ان کی ذات شریعت کی بے نیام تلوار تھی جو اپنے بیگانے کو نہیں دیکھتی تھی۔ وہ ہر حال میں نفاذ شریعت چاہتے تھے، جن لوگوں کی پیشانیاں احترام اصول شریعت کے نور سے چمکتی تھیں انہیں وہ بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اتباع سنت مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باب میں وہ اپنے عہد میں تنہا تھے۔ یہ ساری خصوصیات حضور نور العارفین حضرت سید شاہ ابو الحسین احمد نوری قدس

سرہٗ کی خصوصی دعاؤں کا نتیجہ تھیں۔ اسی لیے چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

کیسے آقاؤں کا بندہ ہوں رضا
بول بالے میری سرکاروں کے

مشائخ خاندان رضویہ پہ مشائخ خاندان برکات کی عنایات، نوازشات اور توجہات کی ابتدا ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۳ء سے شروع ہوتی ہے۔ تاج الفحول شاہ عبد القادر بدایونی قدس سرہٗ (۱۲۵۳ھ -۱۳۱۹ھ) کے ہمراہ چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اور اعلیٰ حضرت کے والد ماجد خاتم المحققین شاہ نقی علی خاں قدس سرہٗ خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آل رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ سجادہ نشیں خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کے حضور بیعت وارادت کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ خاتم الاکابر نے دونوں باپ بیٹے کو شرف بیعت سے فیضیاب کیا، تمام سلاسل کی سندات خلافت واجازت سے سرفراز کیا اور اعلیٰ حضرت کو اپنی شباہت کے شرف سے بھی بہرہ ورفرمایا۔ پھر عالم وجد وحال میں گویا ہوئے بہت دنوں سے فکر لگی ہوئی تھی کہ کل میدان محشر میں خدائے قادر وقیوم پوچھے گا کہ اے آل رسول دنیا سے تم میرے لیے کیا لائے تو کیا جواب دونگا۔ اب وہ فکر دور ہوگئی، اب خدائے قادر وقیوم پوچھے گا کہ تم دنیا سے میرے لیے کیا لائے؟ تو میں احمد رضا کو پیش کر دونگا، خاتم الاکابر کے اس فرمان ذیشان سے اعلیٰ حضرت کی محبت، رفعت وعظمت اور بے پناہ فضل وکمال کا اظہار و اعلان ہوتا ہے۔ اس فرمان کی کوکھ سے اصطلاح مسلک اعلیٰ حضرت کی پاکیزہ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

حضور خاتم الاکابر نے اپنے مرید باصفا اور چشم وچراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے جس محبت اور اعتماد کا اظہار کیا مشائخ خاندان برکات نے اس محبت اور اعتماد کے تقدس کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا، خاتم الاکابر نے اعلیٰ حضرت سے اپنی چاہت کا جو چراغ روشن کیا مشائخ خاندان برکات نے اس چراغ کی لوکبھی مدھم نہیں ہونے دی بلکہ زمانے کی رفتار کے ساتھ اس چراغ کی لوتیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ اعلیٰ حضرت اپنے پیر اور اپنے پیر خانے کو کس آنکھ سے دیکھتے تھے یہ گفتگو کا الگ عنوان ہے۔ اور یہ باب تاریخ کے پنوں میں محفوظ ہے، یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ پیر، پیر ہوتا اور مرید مرید ہوتا ہے۔ مرید عظمت ورفعت میں کائنات گیر ہوجائے پھر بھی وہ اپنے پیر کے حضور سراپا نیاز ہی ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ اعلیٰ حضرت اور حضور مفتی اعظم ہند کی کتاب حیات میں دیکھا بھی جاسکتا ہے اور سمجھا بھی جاسکتا ہے۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ یہ بزرگ شخصیات مارہرہ مقدسہ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی برہنہ پا ہوجاتیں اور اعلیٰ حضرت اور حضور مفتی اعظم ہند اپنی اپنی ذات میں جتنے بلند تھے اپنے پیر خانے کی وفاداری میں اس سے کہیں زیادہ بلند تھے، پیرومرید کے فرق وامتیاز کو ان دونوں شخصیات سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ اعلیٰ حضرت کی نظیر سے کئی صدیاں خالی ہیں لیکن اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس علم وخبر کا جو بھی اثاثہ ہے وہ اسی سرکار سے حاصل ہوا ہے۔ ان میں بڑوں کی قدردانی کا جو شعور نظر آتا ہے اس کی نظیر سے بھی صدیاں خالی ہیں۔ اس باب میں بھی ان کی امامت وسیادت مسلم ہے۔ ان کی ذات خصوصیات کی جامع تھی اور وہ اپنی ہر خصوصیت میں بے نظیر و بے مثال تھے۔ مشائخ خاندان برکات نے یونہی نہیں ان کے سر پہ کرامتوں کی دستار سجائی تھی اور اپنے وابستگان کو ان سے محبت، عقیدت، احترام اور ان کے ہر شرعی فیصلے سے کامل اتفاق کی وصیت ونصیحت کی تھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کے مذہب ومسلک سے جو متفق نہ ہو وہ میرے سلسلے کا مرید نہیں ہوسکتا اور ہو تو خود کو خارج از سلسلہ سمجھے اور یہ بھی فرمان جاری کیا کہ ان کا وجود نسل درنسل خاندان برکات کے لیے لائق صد فخر ومباہات ہے، ہمارے خاندان کا ایک بچہ بھی مولانا احمد رضا خان صاحب کا نام بےادبی سے نہ لے۔

تاریخ شریعت وطریقت میں کسی شیخ نے اپنے کسی مرید کی اس انداز میں تعظیم وتوقیر کا فرمان جاری کیا ہو اس کی نظیر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ مشائخ خاندان برکات صرف ظاہر کو نہیں دیکھتے تھے

بلکہ ان کی نگاہ باطن پہ بھی رہتی۔ ماضی، حال اور مستقبل سب ان کے حضور آئینہ ہوتا۔ بڑے بڑے کا ملان زمانہ ان کے در باروں میں جاروب کشی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چشم و چراغ خاندان برکات مولانا احمد رضا خان صاحب آقائے کریم مصطفیٰ جان رحمت ﷺ اور سردار اولیاء محبوب سبحانی ،غوث صمدانی، قندیل رحمانی حضور سید نا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب ہیں۔ جو ان سے پھرے گا وہ ان سرکاروں سے پھر جائے گا۔ اسی لیے تو چشم و چراغ خاندان برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ رقمطراز ہیں۔

جبینِ جبہ فرسائی کا صندل
تِری دیوار کی کہگل ہے یا غوث
عجم کیسا عرب حل کیا حرم میں
جمی ہر جا تری محفل ہے یا غوث
ہے شرح رسم القادر ترا نام
یہ شرح اس متن کی حامل ہے یا غوث
بجالایا وہ امیر سار عوا کو
تری جانب جو مستعجل ہے یا غوث
تری قدرت تو فطریات سے ہے
کہ قادر نام میں داخل ہے یا غوث
تصرف والے سب مظہر ہیں تیرے
تو ہی اس پردے میں فاعل ہے غوث
رضا کے کام اور رک جائیں حاشا
ترا سائل ہے تو با ذل ہے یا غوث

□□□□

(باقی صفحہ 168 کا ملاحظہ فرمائیں۔۔۔)

ایسے لمحوں میں تحریر تعزیت نہیں رہتی، امانت بن جاتی ہے--- اس بات کی امانت کہ علم، خلوص اور استقامت کبھی فنا نہیں ہوتے وہ صرف ایک وجود سے نکل کر کئی دلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

اسی احساسِ فقدان، اسی سوزِ دروں اور اسی تاریخی امانت کے ذمہ دارانہ احساس کے ساتھ یہ تحریر پیش کی گئی ہے---تا کہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ ہم نے کس قدر قیمتی متاع کھودی اور یہ بھی سمجھ سکیں کہ ان روشن نقوش کو دلوں میں سنبھال کر آگے بڑھانا ہی دراصل ان کے لیے سچی عقیدت کا سب سے بڑا اخراج ہے۔

یہ سطریں کسی وقتی جذباتی کیفیت کا اظہار نہیں بلکہ ایک شعوری کوشش ہیں کہ وقت کی گرد میں دب جانے والی قدریں محفوظ کر لی جائیں۔ کہ علم کی وہ شمعیں جنہوں نے اندھیروں میں راستے دکھائے، محض تاریخ کے حاشیے پہ نہ چلی جائیں بلکہ فکر و عمل کی صورت میں زندہ رہیں۔ یہ تحریر اس عہد کی تجدید بھی ہے کہ ہم ان کے چھوڑے ہوئے نقوش مٹنے نہیں دیں گے، ان کے سکھائے ہوئے اسباق فراموش نہیں کریں گے اور ان کے قائم کردہ معیارِ اخلاص و استقامت کو اپنی اجتماعی زندگی کا حصہ بنائیں گے۔

یوں یہ مضمون ایک تعزیتی نوحہ نہیں بلکہ ایک فکری وصیت ہے--- جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ شخصیات رخصت ہو جاتی ہیں مگر ان کی ذمہ داریاں زندہ رہتی ہیں اور اصل وفا یہی ہے کہ ہم اس ورثے کو سنبھال کر آنے والے وقتوں کے حوالے کر دیں۔

ہم اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے صدقے حضرت علامہ نعیم اللہ خان رضوی بستوی علیہ الرحمہ کی کامل مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، ان کی علمی و دعوتی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، پسماندگان، متعلقین، تلامذہ اور جماعتِ اہلِ سنّت کو صبرِ جمیل اور حوصلۂ جلیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کے چھوڑے ہوئے روشن نقوش پہ چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

□□□□

دارالعلوم خیریہ نظامیہ: ہماری امانت ہے

یہ محض اینٹ اور گارے کی عمارت نہیں، یہ ہمارے اسلاف کی امانت ہے، یہ صرف درسگاہ نہیں، یہ ایمان کی نگہبان چوکی ہے، یہ محض ادارہ نہیں، یہ ایک تہذیبی سنگِ میل ہے۔

دارالعلوم خیریہ نظامیہ، سہسرام ایک ایسا مرکزِ علم جو برسوں سے اہلِ سنّت و جماعت کے مسلکی وقار، اعتقادی استحکام اور فکری اعتدال کا پاسبان بنا ہوا ہے۔ یہاں سے اٹھنے والی اذانیں صرف مسجد کی دیواروں تک محدود نہیں رہتیں بلکہ دلوں کی وادیوں میں اتر کر عقیدے کو تازگی بخشتی ہیں۔ یہاں کے حجرات میں صرف کتابیں نہیں کھلتیں، نسلوں کی تقدیریں رقم ہوتی ہیں۔

یہ ادارہ حکومتی مالی تعاون کے بغیر، محض اہلِ خیر کے اخلاص اور اہلِ ایمان کی قربانیوں کے سہارے آج بھی باغ و بہار ہے۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ جب نیتیں خالص ہوں تو وسائل کی کمی راہ کی رکاوٹ نہیں بنتی۔

لیکن یاد رکھیے! چراغ خود بخود روشن نہیں رہتے، چراغوں کو تیل بھی چاہیے، توجہ بھی چاہیے، تعاون بھی چاہیے۔ دارالعلوم کی بقا صرف منتظمین کی ذمہ داری نہیں، یہ ہم سب کا دینی، ملی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں صحیح العقیدہ، باوقار اور باخبر رہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شہر میں علم کا چراغ اسی آب و تاب کے ساتھ روشن رہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلکِ اہلِ سنّت کی صدا کمزور نہ پڑے- تو ہمیں دل کھول کر اس ادارے کا دست و بازو بننا ہوگا۔

آپ کی زکوٰۃ، صدقات، عطیات اور تعاون صرف مالی مدد نہیں، یہ دراصل دین کی حفاظت میں آپ کی شرکت ہے۔ یہ ایمان کی آبیاری ہے۔ یہ صدقۂ جاریہ ہے، جس کا اجر نسلوں تک آپ کے نامۂ اعمال کو روشن رکھے گا۔

آیئے! ہم سب مل کر اس علمی قلعے کو مضبوط کریں۔ اس کے اساتذہ کی پشت پناہی کریں۔

اس کے طلبہ کی کفالت کو اپنا اعزاز سمجھیں۔

یہ عجز بھی ہے، عقیدہ بھی، یہ خدمت بھی ہے، سعادت بھی، یہ تعاون بھی ہے، عبادت بھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے ان مراکز کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اس معمولی تعاون کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر ذریعۂ نجات بنا دے۔

